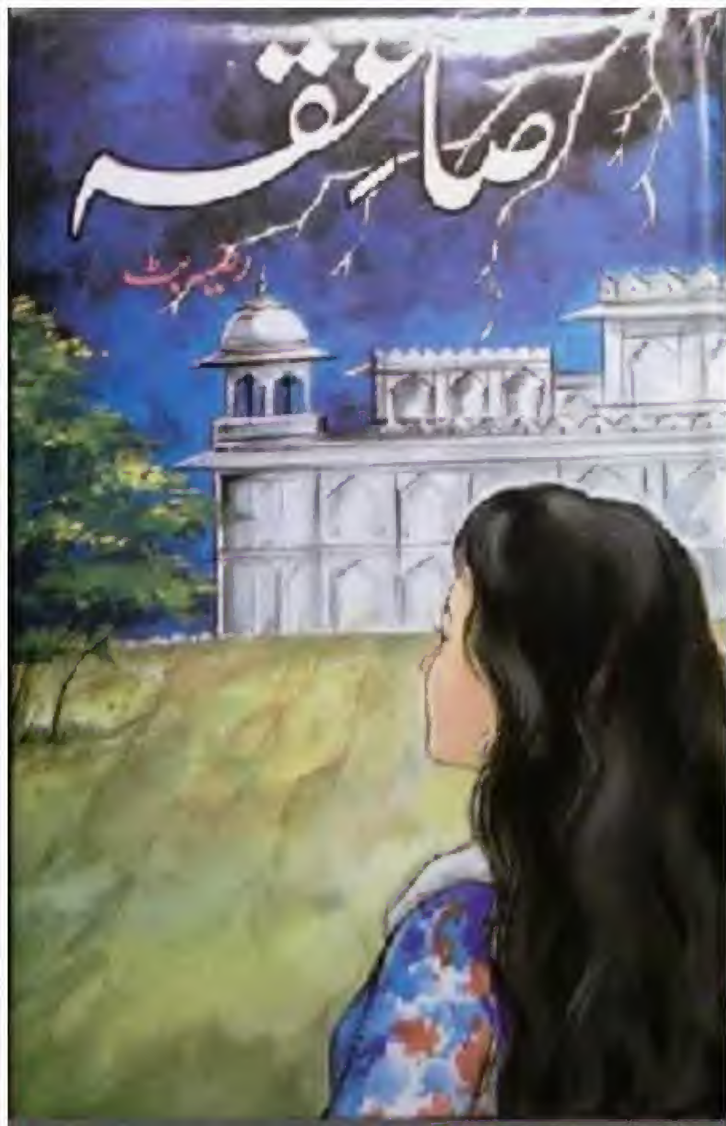

صاعقہ
رضیہ بٹ

صاعقہ

رضیہ بٹ



فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ریاض بھائی کے نام!
جن کے پُر خلوص مشورے سے
صاعقہ کا حُسن اور نکھر گیا۔

رضیہ بٹ

اُونچی نیچی گُل پوش پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے ہوئے طویل و عریض میدان میں الحمراء کی خوبصورت عمارت اک وقار سے استادہ تھی ۔ چاروں طرف قدرت نے حسن کے انمول خزینے لٹائے تھے ۔ یہ قطعۂ زمین قدرت کی صناعی کا شاہکار تھا ۔ سبزے کا مخملیں فرش ، رنگ برنگے پھول ، لہلہاتی بیلیں ، جھومتے درخت اور ہلکی سی آبشار کی صورت میں گرتا ہوا پہاڑی ندی کا چمکتا ہوا پانی ۔ چاروں طرف حسن ہی حسن تھا ۔ رعنائی ہی رعنائی تھی ۔

ایسی جگہ میں رہائشی عمارت کی تعمیر کسی حُسن پسند طبع ہی کا انتخاب تھا ۔ سرخ گنبدوں اور سنہری ستونوں والی عمارت اس دلفریب ماحول میں گھری ہوئی کسی البیلی حسینہ کی طرح دکھائی دیتی تھی ۔

کشادہ کمرے ، وسیع برآمدے ، خوب صورت گیلریاں ، نفیس ڈرائنگ روم ، طویل ڈائننگ ہال ، آراستہ پیراستہ عمارت اپنے مکینوں کے اعلیٰ ذوق ، امارت اور عظمت کی ضامن تھی ۔

نواب فاروق علی خاں کو وفات پائے تقریباً بیس برس گزر چکے تھے لیکن اُن کی بیوہ حسن بانو حیات تھیں ، اُن کی عمر تقریباً ساٹھ برس سے متجاوز تھی ۔ سرخ و سپید چہرے اور چاندنی کی طرح چمکتے ہوئے سفید بالوں نے ان کے رعب ، دبدبے اور وقار میں اضافہ کر دیا تھا ۔ صدیوں پرانی روایات کی قائل تھیں ۔ زمانہ بدل چکا تھا ۔ ذہن بدل چکے تھے ۔ سوچ کی راہیں بدل چکی تھیں ۔ لیکن ان کے سوچنے کے ڈھنگ نہیں بدلے تھے ۔

نام و نمود ، وقار اور ظاہری آن بان کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی حامی تھیں ۔ زندگی میں اس نظریے کی بناء پر بڑے بڑے رُوح فرسا حادثات سے دوچار بھی ہو چکی

تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے نظریے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

خدا نے سعادت مند اولاد دی تھی۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، منجھلا بیٹا طاہر اپنی یادگار صاعقہ کی صورت میں دے کر داغِ مفارقت جوانی ہی میں دے گیا تھا۔ بڑا بیٹا اظہر اور چھوٹا فخر۔ دونوں بیٹیاں انجم آرا اور حسن آرا سب کی جوان سال اولادیں تھیں۔ لیکن ماں کے ادب و احترام میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

حسن بانو کی پھلواری بڑی شاداب تھی۔ لہلہاتے پھولوں، کھلی کونپلوں اور پھوٹتے شگوفوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ بچوں کے بچے انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ دونوں بیٹوں سے سگی بھانجیاں بیاہی تھیں۔ اس لیے محبت اور مستحکم ہو گئی تھی۔

یوں تو سبھی بچے ان کی آنکھوں کا تارہ تھے لیکن سب پر فوقیت ریحان کو حاصل تھی۔ جوان سال ریحان تو جیسے ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کے بڑے بیٹے کا پہلا بیٹا تھے۔

ریحان دادی کے التفات کو جانتے تھے۔ شوخ تو بچپن ہی سے تھے۔ اس التفات نے اور شہ دے رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب اور جو بات بھی کہہ دیتے، دادی کو ماننا پڑتی۔ دادی حضور کے رعب اور دبدبے نے اگر کسی سے مرعوب ہونا سیکھا تھا تو صرف ریحان کے چونچلے تھے۔ ورنہ اور سب کے لیے تو وہ ایک مطلق العنان فرماں روا سے کم نہ تھیں۔

محل کی فضا بڑی خوش گوار تھی۔ فخر کے چھوٹے بچوں اور حسن آرا کی آخری بچی کے علاوہ سبھی حصولِ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ فراغت قہقہوں کے طوفانوں اور خوشیوں کے سیلابوں کی صورت میں پھوٹ رہی تھی۔ الحمراء کے در و دیوار، فکر فردا سے بے نیاز اور غمِ ماضی سے ناآشنا حال کی آسودگی سے ہم کنار جوانیوں کے مہکتے شب و روز کے گواہ تھے۔

ہر دن عید اور ہر شب شب برات تھی۔ زندگی ان کے لیے کالہاتے رنگین پھولوں کا ہوا گلدستہ تھی۔ پھول ہی پھول بکھرے تھے چاروں طرف، حسن ہی حسن تھا گرد و پیش۔ کھیل تماشے، سیر و تفریح، دلچسپ صحبتیں، خوش گوار نشستیں اور

ماحول فردوسی رعنائیوں کا حامل تھا۔

لیکن

اس فردوسی رعنائیوں کے ماحول میں ۔۔۔ جہاں قہقہے طوفانوں کی صورت میں اٹھتے تھے۔ جہاں خوشیوں کے بحرِ ناپیدا کنار ٹھاٹھیں مارتے تھے، جہاں زندگی کے حسن پر کوئی تلخی سایہ فگن نہ تھی، جہاں اہلِ خانہ تو ایک طرف کنیزیں اور خدام بھی لطفِ زندگانی لے رہے تھے، اک ہستی ایسی بھی تھی جو اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس کی دل فریبیوں سے فیض یاب نہ ہو سکتی تھی۔

وہ تھی صاعقہ۔

صاعقہ

صاعقہ ۔۔۔ طاہر مرحوم کی واحد یادگار۔ بن ماں کی بچی جس نے اس عشرت کدے میں جنم لیا۔ پلی، بڑھی اور جوان ہوئی۔ لیکن اسے زندگی کے گلہائے رنگین نہ ملے۔ چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے نظر آئے۔ طنز و تمسخر نے قدم قدم پر اس کا پیچھا کیا۔ نفرت و حقارت برسائی، نظروں نے ہمیشہ اس کا تعاقب کیا۔

بیس سال

پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ یہ سال اس کے لیے لمحاتِ نشاط کے حامل تھے۔ جو گزرتے پتہ نہ چلتے۔ یہ بیس سال تھے جن میں ہزاروں دن، لاکھوں گھنٹے اور کروڑوں منٹ تھے۔ یہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں اذیتیں تھیں جو صاعقہ نے سہیں۔ زندگی کے لمحے لمحے نے اس کے خون کے قطرے قطرے کا امتحان لیا تھا۔

صاعقہ دستِ قدرت کا شاہکار تھی۔ اس کا ملکوتی حسن اک خاص شان کا حامل تھا۔ چمپئی رنگ جو دائمی اداسی سے اک کشش بے پناہ لیے ہوئے تھا۔ حسین سرمئی آنکھیں جن میں خوابیدہ جادو چونک اٹھنے کو بیتاب تھا۔ نرم و گداز جسم، انتہائی موزوں قد، رعنائی و دلفریبی کا مرقع تھی وہ۔

آواز میں نغموں کا رس تھا۔ زیر و بم میں سلگتا ہوا اضمحلال دل میں کسک پیدا کر دیتا تھا۔ عمر کے مشرب اماں دور میں داخل ہو چکی تھی۔

لیکن

اس کے حسن کی محشر سامانیوں سے جیسے کوئی آگاہ ہی نہ تھا۔ نہ ریحان نے کبھی اسے

اپنے تصورات میں بسایا تھا نہ اسد و فرخ نے اپنے سپنوں میں اسے بھولے سے جگہ دی تھی۔ نہ فریدوں و شاہد نے اس کے متعلق کسی رومانی خیال کو ذہن میں آنے دیا تھا۔ یہ تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ کسی نے بھی اسے نگاہِ لطف و کرم تک نہ بخشی تھی۔ صاعقہ نے ہمیشہ ان کی نظروں میں اجنبیت پائی تھی یا طنز کی چمک دیکھی تھی۔

وہ جب تک شعور کو نہ پہنچی تھی، اس ناروا سلوک کو نہ سمجھتی تھی۔ دادی سے لے کر گھر کے آخری فرد تک اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ صرف انجم پھوپھی تھیں یا فخر چچا جن کا رویہ اہل خانہ سے کچھ مختلف تھا۔ لیکن اس سے صاعقہ زندگی کا سکون نہ پا سکی تھی۔ انجم پھوپھی دور رہتی تھیں۔ کبھی کبھار آنا ہوتا تھا اور فخر چچا ماں کے جلال اور بیوی کے تیوروں کو دیکھ کر اس سے کھلم کھلا مشفقانہ سلوک نہ کرتے تھے۔

صاعقہ بچی تھی۔ تو کچھ نہ سمجھ سکتی تھی۔ اپنے ہم عمروں سے کھیلنے کودنے کی تمنائی تھی اور بارہا اس تمنا کی اسے تلخ سزا ملی تھی۔ اس کے شعور نے جلد ہی ان تلخیوں کو جانچنا سیکھ لیا۔ وہ خود بخود اپنے ہم عمروں سے دور ہٹتی گئی۔ اس نے اپنی ذات کو الگ تھلگ کر لیا۔ اس کے مزاج میں اپنے باپ کا سا شاہانہ وقار تھا۔ وہ بلا ضرورت کسی سے بات کرتی نہ کسی کے پاس بیٹھتی۔

اس کھنچاؤ کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہم عمروں کا رویہ گو بدل نہ سکا، ہاں کچھ نرم ضرور ہو گیا۔

لیکن

ان کے رویے کی معمولی سی تبدیلی صاعقہ کی المناک زندگی سے رنج و غم کے مہیب سائے نہ ہٹا سکی۔ اس کی ذات کو اب تک اسی شدت سے منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ تنفر اپنی جگہ موجود تھا۔

بعض اوقات تو اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ اس ناقابلِ برداشت ماحول سے کہیں دور۔۔۔ بہت دور بھاگ جائے۔

لیکن اس کے لیے جائے پناہ کہیں بھی نہ تھی۔ اکثر مایوس ہو کر سوچا کرتی کہ اپنے آپ کو پہاڑی ندی کے تیز رفتار پانی کے حوالے کر دے۔ محل کی پچھلی بالکنی سے اس ندی میں کود جائے جو محل کے نشیبی حصے سے ٹکرا کر گزرتی ہے۔

لیکن سوچ اور شے ہے اور عمل اور۔۔۔۔۔ زندگی ہزار بار بے رنگ سہی۔ پھر بھی

اپنی جاذبیت نہیں کھوتی۔ انسان جیتا ہے اور جئے چلا جاتا ہے۔

صاعقہ بھی انسان تھی۔

سینے میں گوشت پوست کا دھڑکتا دل تھا۔

دل۔۔۔ جو

زندگی کی تال سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے کی آرزو تو رکھتا تھا۔

اور۔۔۔ اور جب سے اس دل نے ایک مرکز چن لیا تھا۔ صاعقہ کی زندگی بے شک بوجھل تو کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ تاہم اس بوجھ میں بھی اک حسن نکھر آیا تھا۔ رنگینی ابھر آئی تھی۔ جینے کی تمنا مٹنے کی بجائے کچھ شدید سی ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے دل نے انجانے پنے میں جو مرکز منتخب کیا ہے۔ وہ اس کی دسترس تو کیا سوچ سے بھی دور ہے۔ ریحان۔۔۔ کہاں وہ اور کہاں ریحان۔

ریحان! جس نے تفننِ طبع کی خاطر ہمیشہ اسے تختۂ مشق بنایا تھا۔ جس کی آنکھوں میں اس نے ہمیشہ اجنبیت پائی تھی۔ جس نے ہمیشہ اسے حقارت سے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ سب کچھ جانتی تھی۔ لیکن دل تو آخر دل ہی تھا۔ کہے نہ میں آنے کی چیز تھوڑی ہی تھی۔

صاعقہ کی زندگی کچھ عجیب طرح ڈوبتے ابھرتے گزر رہی تھی۔ احمق دل کی گستاخانہ حرکت پر کبھی تو ہنسی آجاتی۔۔۔ کبھی رونا۔۔۔ کوئی مونس و غمگسار نہ تھا۔ حالات کی یہ تنی افتاد تو بعض اوقات اسے اس قدر پریشان کر دیتی کہ اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گی۔

لیکن ان پریشانیوں کے لمحوں میں تسکین کا سہارا آیا کی آغوش تھی اس کی آیا واحد ہستی تھی جو اس کے زخموں پر پھایا رکھ دیتی تھی۔ آیا نے اسے پالا پوسا تھا۔ اس کے دکھ کو دکھ جانا تھا۔ ماں کی سی شفقت کے دامن اس کے لیے پھیلائے تھے۔ تیز اور قہر برساتی نظروں سے اسے حتی المقدور دُور رکھنے کی کوشش تھی۔ آیا کا وجود ہی تھا جو صاعقہ ایسے ناساز گار ماحول میں زندگی کی ڈوری تھامے بڑھتی چلی گئی تھی۔

دیکھنے میں آیا جتنی کریہہ المنظر تھی، دل کی اتنی ہی حسین تھی۔ کسی حادثے میں جل جانے سے اس کی ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ چہرے کا نچا کھچا گوشت کہیں سے سفید کہیں سے سیاہ تھا۔ ایک آنکھ اوپر کو کھنچ گئی تھی۔ بال چھوٹے چھوٹے اور کھردرے سے تھے۔

دیکھنے میں خاصی ہیبت ناک تھی۔ لیکن صاعقہ نے اس کی آغوش میں ہمیشہ پیار کی ٹھنڈک اور سکون پایا۔ وہ اس کی سچی ہمدرد اور غم گسار تھی۔ اس کا دل جب گھبراتا تو آپا کی ممتا بھری آغوش میں اسے حقیقی سکون ملتا۔ رونے کو دل مچلتا تو آپا کا دامن چھلکتے آنسوؤں کو سہارا دیتا۔ گھر والوں کے بے رحم رویے اور ناروا سلوک سے جب وہ دل برداشتہ ہو جاتی تو صرف آپا ہی اس کی تپتی ہوئی ذہنی کیفیتوں پر پیار کی ٹھنڈک کے چھینٹے دیتی۔

زندگی اسی ڈھنگ سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ صاعقہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ ان واقعات کی تلخی سہہ رہی تھی جو اس کی پیدائش سے قبل وقوع پذیر ہوئے تھے۔ اس کا کوئی دوش نہ تھا۔ کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن وہ موردِ الزام ٹھہرائی گئی تھی۔ انتقامی حس اک ناکردہ گناہ کو کچل کر شاید تسکین پا رہی تھی۔

(۲)

اکیس بائیس برس ادھر کی بات ہے۔

نواب فاروق علی خاں زندہ تھے۔ الحمراء کی حیات افروز رونقیں انہی کے قدم سے تھیں۔ لیل و نہار کی گردشیں ان دنوں اک خاص حسن کی حامل تھیں۔ ضابطہ اور اصول ان کی زندگی کے اہم جزو تھے۔ لیکن یہ گھریلو زندگی کی دلکشی پر اثر انداز نہ ہوتے تھے۔

بڑے لڑکے اور دونوں لڑکیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان دنوں منجھلے بیٹے طاہر کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ چوبیس پچیس سالہ خوب رو طاہر فاروق علی خاں کو دوسرے بچوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی عزیز تھے۔ اسی پیار نے طاہر کی طبیعت میں ہٹ اور ضد کو جنم دیا تھا۔ من مانی کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔

ماں کی مخالفت کے باوجود پچھلے سال یورپ کے تفریحی دورے پر نکل گئے تھے۔ فوٹوگرافی کا شوق جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ یورپ سے جب لوٹے تو آدھے سے زیادہ سامان چھوٹے بڑے کیمروں ۔۔۔ اپنی بنائی ہوئی بے شمار تصویروں اور فوٹوگرافی کی دوسری چیزوں پر مشتمل تھا۔

طاہر جب سے یورپ سے لوٹے تھے۔ شغل ہی یہی رہ گیا تھا۔ اکثر صبح ہی صبح کیمرہ کندھے پہ ڈال کر نکل جاتے۔ قدرت کے بکھرے ہوئے انمول خزینوں کو سلولائیڈ پہ منعکس کرتے۔ اونچی اونچی گل پوش پہاڑیاں گنگناتی ندی ۔۔۔ مترنم شور پیدا کرتے ہوئے جھرنے ۔۔۔ جنگلی خودرو پودے، دیہاتی دوشیزائیں، جانوروں کے ریوڑ، سورج کی ڈوبتی ابھرتی روشنی۔ سبھی کچھ ان کے کیمرے کی آنکھ میں مقید ہو جاتا۔

چاندنی راتوں کا فسوں انگیز حسن انھیں للکارتا اور وہ چپ چاپ اپنا کیمرہ اٹھا کر باہر نکل جاتے۔ رات گئے تک ماحول کے حسن عکس کیمرے کی آنکھ میں جلوہ گر رہتے۔

فن کی لگن فنکار کو اپنی ہستی سے بے گانہ بنائے جا رہی تھی اور ابھی یہ لگی رہ جہد،

نظروں میں کھٹکنے لگی۔

حسن بانو بحیثیت ماں اس بیگانگی کو آوارہ گردی سے تعبیر کرتی تھیں جس کی فوری روک تھام کے لیے ان کی نظر میں شادی ضروری شے تھی۔

وہ موسم کی ایک خوش گوار رات تھی۔ چاند کا سفینہ سینۂ چرخ پر آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ خنک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ دن بھر سورج کی تمازت سے گھبرایا ہوا ماحول فرحت بخش سکون میں ڈوب رہا تھا۔

الحمراء کے دائیں چمن میں نواب فاروق علی خاں اور حسن بانو بیٹھے تھے۔ پانچ سالہ ریحان ان کی توجہ و دل چسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی طفلانہ حرکتوں سے دونوں محظوظ ہو رہے تھے۔

"اسے دیکھ کر مجھے اکثر طاہر کا بچپن یاد آجاتا ہے۔" حسن بانو بڑی شفقت سے ریحان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں:

"بالکل اسی پر گیا ہے۔۔۔" نواب فاروق علی خاں پیار سے پوتے کو دیکھ کر بولے۔ "شکل و صورت میں بھی تو انیس بیس ہی کا فرق ہے۔۔۔ وہی ناک نقشہ۔۔۔ بچپن میں وہ بھی تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں تو ہو بہو طاہر کے ہیں۔۔۔" حسن بانو نے ریحان کو گود میں لے لیا۔ جو تھک کر اب سو جانے کو تھا۔

"مزاج بھی اسی کا ہے۔"

"ہائے اللہ۔۔۔ مزاج تو اس جیسا نہ ہو۔ ضدی جہاں کا۔۔۔۔"

"ضدی ضرور ہے۔ لیکن گستاخ نہیں۔"

"میں نے کب کہا گستاخ ہے۔ لیکن ضد۔۔ توبہ یا اللہ جو بات ایک بار کہہ دے، وہ پکی ہو جاتی ہے۔۔۔ کیا مجال جو پوری نہ ہو اس کی بات۔"

"یہ تو اس کے کردار کے ٹھوس ہونے کی نشانی ہے بیگم۔"

"اونہہ۔۔۔ آپ نے ہی تو کہہ کہہ کر اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ شروع ہی سے اس کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرتے آئے ہیں۔"

"یہ سراسر زیادتی ہے بیگم۔" نواب پیار سے بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ "ہمیشہ اس کی جائز بات ہم نے ہمیشہ مانی ہے۔ میں تو کہوں گا اس نے ناجائز خواہش کبھی کی

ہی نہیں۔۔۔۔"

"کیا کہنے"

"اور کیا۔۔۔۔ اس کا مطالبہ ہمیشہ جائز اور معقول ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم فراخ دلی سے کام لے لیتے ہیں۔۔ مناسب۔۔۔"

"خاک مناسب۔۔۔۔"

"کیوں؟"

"اور کیا"

"کونسا نامناسب مطالبہ ہم نے پورا کیا اس کا؟"

"ابھی کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔"

"کس بات کو؟"

"اس کی ہٹ۔۔۔۔ جو آپ نے پوری کر دی۔"

"کونسی؟"

"ابھی پچھلے سال کیا ہوا تھا۔۔۔۔"

"اوہ۔۔۔" نواب پھر دھیرے سے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھ کر بولے "تمہارا مطلب اس کے یورپ جانے سے ہے۔"

"اور کیا"

نواب فاروق علی خاں نے ہنس کر کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔

"بڑی جائز بات تھی نا" بیوی پیار بھرے شکی انداز میں بولی۔

"نامناسب بھی تو نہ تھی ۔ اس عمر میں سیر و سیاحت کا کسے شوق نہیں ہوتا۔"

"یہاں شادی کی بات شروع تھی اور وہ سیر کے پروگرام بنا رہا تھا۔ کتنا سمجھایا میں نے۔۔۔ لیکن بات آخر اسی نے منوائی۔"

"کوئی بات نہیں بیگم۔۔۔ شادی بھی کر دیں گے۔"

"جانے کب کر دیں گے۔۔۔۔"

"انشاءاللہ اب کے سردیوں میں اس فرض سے بھی سبک دوش ہو جائیں گے۔"

"اور اگر سردیوں میں اس نے پھر کوئی مناسب و معقول مطالبہ سیر و تفریح کا کر دیا تو۔۔۔؟" بیگم نے تیکھی، مسکراتی اور پیار بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"تو پھر شادی اگلی سردیوں تک ملتوی کر دی جائے گی۔" نواب فاروق نے دانستہ بیگم کو چھیڑا۔

"اگلی کیوں۔۔۔؟ اس سے بھی اگلی سردی میں کہیئے۔" بیگم خفا ہو گئیں۔ گود میں سوئے ہوئے ریحان کو سنبھالا۔ وہ اٹھنے کو تھیں کہ نواب نے ہنستے ہوئے ہاتھ پکڑ لیا۔

"خفا ہو گئیں؟"

"خفگی کس بات کی؟"۔۔۔ وہ بدستور خفا تھیں۔۔۔ "بچہ سو گیا ہے گود میں نیند خراب ہو رہی ہے۔۔۔"

"کنیز لے جائے گی۔ ٹھہرو میں بلاتا ہوں۔۔۔۔ وہ جا رہی ہے۔۔"

انھوں نے بیٹھے بیٹھے کنیز کو پکارا۔ وہ لپک کر آئی اور حسن بانو کی گود سے ریحان کو لے کر چلی گئی۔

حسن بانو روٹھی روٹھی بیٹھی رہیں۔ نواب فاروق چند لمحے انھیں دیکھتے رہے۔ پھر کھلکھلا کر ہنس دیئے:

"ناراض کیوں ہو گئیں۔ کہہ جو دیا۔ اب کے سردیوں میں شادی ہو جائیگی۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔"

"ابھی کوئی بات ہی نہیں۔۔۔ چھ سال ہو گئے منگنی کو۔۔۔"

"وہ تو ہونا ہی تھے۔ کل گیارہ برس کی تھی فوزیہ۔۔۔ جب ہم نے یہ نسبت ٹھہرائی۔"

"اب تو سترہ اٹھارہ برس کی ہو رہی ہے۔۔۔۔"

"معقول عمر ہے۔۔۔۔ طاہر بھی ماشاءاللہ چھبیس سال کا ہو گیا ہے۔"

"چھبیس ہی میں ہے۔ اس کی عمر میں تو اظہر کے ماشاءاللہ تین بچے بھی ہو گئے تھے۔"

"وہ تو ہم نے اس کی کم عمری ہی میں شادی کر دی تھی۔ بیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔"

"کوئی بری بات تو نہیں۔ کس خوب صورتی سے اپنی ذمہ داریوں کو نباہ رہا ہے، ایک یہ ہے کہ سارا دن آوارہ گردی۔۔۔"

"بیگم۔۔۔ اس کے شوق کو آوارہ گردی نہ کہو۔ تمہارا بیٹا ایک عظیم فن کار ہے۔

تمہیں اس بات پر فخر ہونا چاہیئے۔"

بیگم نے برا سا منہ بنایا۔ طاہر کی فن کارانہ صلاحیتوں کو پرکھنے یا ان کی تعریف کرنے سے زیادہ انھیں اس کی شادی کا فکر تھا۔

دیر تک حسن بانو اور نواب فاروق اسی شادی کی باتیں کرتے رہے۔ حسن بانو کی بہن کی دونوں لڑکیاں انھوں نے اپنے بیٹوں سے بچپن ہی میں منسوب کر دی تھیں۔ بڑی کی تو شادی ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔۔۔۔ ریحان۔۔۔ ماہ رخ اور شاہ رخ تین بچے بھی ہو گئے تھے۔ لیکن فوزیہ کا معاملہ التواء میں تھا۔

حسن بانو یہ شادی جلد کرنے کی متمنی تھیں۔ بہن کی طبیعت اکثر ناساز رہا کرتی تھی۔

"نگہت بانو بیمار رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ جیتے جی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔۔۔۔" حسن بانو نے کہا۔

"ہمیں خود اس بات کا احساس ہے۔۔۔۔" نواب سنجیدگی سے بولے۔ "اس دفعہ سردیوں میں یہ کام بھی نپٹ جائے گا۔"

"نگہت بانو سے کہہ دوں۔ مٹی والی ہیں۔ تیاری کے لیے بھی تو مدت درکار ہے۔ پھر چند مہینے ہی تو ہیں۔۔۔۔"

"ضرور کہہ دو۔۔۔۔" نواب نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔ "تم خود بھی تیاری شروع کر دو۔۔۔۔ ہم یہ شادی اک خاص شان سے کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں؟" بیگم تیکھی نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔

"ہمارے طاہر کی شادی جو ہے۔"

"بڑا آیا لاڈلا۔۔۔۔"

"وہ تو سب جانتے ہیں۔۔۔۔ ہمیں اعتراف بھی ہے۔۔۔۔ ساری اولاد سے زیادہ عزیز ہے ہمیں۔۔۔۔"

بیگم نے اک فخر سا محسوس کیا۔ محبوب شوہر کے عزیز ترین بیٹے کی ماں جو تھیں۔

○

۳

دوپہر کچھ گرم تھی۔ طاہر حسب عادت کیمرہ کندھے پر لٹکائے اونچی نیچی گلپوش پہاڑیوں پر گھوم رہے تھے۔ دھوپ چھاؤں کے امتزاج کو مختلف زاویوں سے جانچ رہے تھے۔ آج کچھ ایسے دلآویز اور دلکش مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے کہ طاہر کو وقت اور گرمی کا احساس ہی نہ رہا۔ چاکلیٹ پتلون اور سفید قمیص پہنے کبھی پہاڑیوں کے نشیب میں نظر آتے کبھی چوٹیوں پر۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ لیکن ڈوبتے سورج کی آڑی ترچھی کرنوں کی حدت بھی کافی تھی۔ یہاں کا موسم گرمیوں میں بھی خاصا خوش گوار ہوا کرتا تھا۔ صرف چند دن سورج کی نگاہ عتاب ماحول کو جھلسا دیا کرتی تھی۔ پھر کہیں نہ کہیں سے ابر و باراں آ جاتے۔ تیز ہوائیں چلتیں۔ بارش برستی اور موسم پر جانا پہچانا نکھار آ جاتا۔

آج گرمی خاصی تھی۔ طاہر کو اس کی شدت کا احساس اس وقت ہوا جب ان کا حلق سوکھ گیا۔ پیاس محسوس ہوئی۔ وہ اس وقت خودرو پھولوں کے کنج کے قریب کھڑے تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ کوئی قدرتی جھرنا قریب دکھائی نہ دیا۔

وہ گھوم کر دوسری طرف مڑ گئے۔ کچے راستے پر چلتے ہوئے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ پیاس شدت اختیار کر گئی۔ اپنے خشک ہونٹوں کو انھوں نے کئی بار زبان سے تر کیا۔

قدرے ہموار حصے میں آ کر انھوں نے پھر متجسس نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں۔ ادھر دو تین موڑوں پر چند کچے مکانوں کے کواڑ نظر آ رہے تھے۔ پیاس نے اس حد تک نڈھال کر دیا۔ وہاں تک جانے کے خیال ہی سے انھیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ مڑ کر دائیں جانب دیکھا۔ دوسری پہاڑی پر سبزے میں گھرا ہوا جھرنا دکھائی دیا۔ پانی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔

چمکتا ہوا پانی دیکھ کر انھیں سکون اور ٹھنڈک کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحہ ان پر وہی پہلی سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس جھرنے تک پہنچنے کے لیے انھیں پھر نیچے اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنا تھا۔

طاہر تھک چکے تھے۔ درختوں میں گھرے ہوئے بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر سستانے لگے۔ چند منٹ آرام کرنے سے بدن میں تازگی آ سکتی تھی جو انھیں جھرنے تک پہنچنے کی ہمت دلا سکتی۔

درختوں کی چھاؤں میں ہوا کچھ خوش گوار سی تھی۔ طاہر نے کیمرہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور درخت سے کمر ٹکا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اطمینان سے نیم دراز ہو گئے۔ آنکھیں بند کر کے وہ پیاس بجھانے کا کوئی نفسیاتی علاج سوچنے لگے۔

اچانک

انھیں یوں محسوس ہوا جیسے قریب ہی کہیں نقرئی گھنٹیاں جھنجھنا اٹھی ہوں۔ ہلکے ہلکے نسوانی قہقہوں کا مترنم اور نغمہ بار شور سکوت کے سینے میں گدگدی سی کرنے لگا۔

طاہر نے آنکھیں کھول دیں۔

اب سکوت طاری تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔

کوئی نظر نہ آیا۔

اب بار پھر وہی نغمہ بار اور مترنم شور گونجا جیسے رنگین ساغر کھنک گئے ہوں۔ اب آواز اور قریب سے آ رہی تھی۔

اس قربت نے سمت سے آگاہ کیا۔ طاہر کی نظریں اس ٹیڑھے میڑھے کچے پہاڑی راستے کی طرف اٹھ گئیں۔ جو اوپر کی طرف سے آ رہا تھا۔ اور جس کے کنارے وہ بڑے سے ایک پتھر پر خود بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ راستہ اوپر کے گاؤں کو جاتا تھا۔

طاہر کی نظریں اس راستے پر لگی تھیں۔ قہقہوں اور باتوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے فضا میں شہنائیوں کی گونج بس رہی ہو۔

اور

پھر

طاہر کے قریب ہی موڑ پر تین چار نسوانی مجسمے ابھرے۔ پہاڑی گاؤں کی الہڑ جوانیاں سروں پر پانی کی گاگریں اٹھائے خراماں خراماں اوپر چلی آ رہی تھیں۔ ان کے جواں سال جسم سر پر رکھے ہوئے بار کی وجہ سے بار بار ربڑ کی طرح لچک کھا رہے تھے۔ پانی چھلک چھلک کر گر رہا تھا۔ اور ان کے لال پیلے ڈھیلے ڈھالے لباس جسم سے چپک چپک جاتے تھے۔

طاہر نے ایک نظر انھیں دیکھا۔ انھیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے افق پر یک وقت کئی چاند طلوع ہو گئے ہوں۔

لڑکیاں ہنستی مسکراتی ایک دوسرے سے میٹھی میٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی بے دھڑک چلی آ رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو طاہر اس حسین جلوے کو ضرور سلولائیڈ پر منتقل کر لیتے۔ لیکن اس وقت انھیں شدت سے پیاس لگ رہی تھی۔ گاگروں سے چھلکتے پانی نے بے صبر بنا دیا۔ زندگی کی ازلی ضرورت پورا کرنے کا خیال مقدم تھا۔

جھرنے کی طرف جانے کا تکلیف دہ مسئلہ قدرت نے خود ہی حل کر دیا۔ طاہر بالوں کو جھٹک کر ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

لڑکیاں موڑ مڑتے ہی ان کے سامنے تھیں۔

اک اجنبی کو اس طرح راستے میں کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں۔ بے اختیار سب کے ہاتھ اپنے دوپٹوں کی طرف گئے۔ بھیگے دوپٹے لاشعوری طور پر سب نے اپنے سینوں پر پھیلانے کی کوشش کی۔

وہ سمٹیں

کترائیں

اور

تنگ راستے پر آگے پیچھے ہو کر طاہر کے قریب سے گزرنے کے لیے بڑھیں۔

انھیں ادھر جانا تھا۔

"ذرا سنیئے" طاہر نے بڑی لجاجت سے پہلی لڑکی کو مخاطب کیا۔

لیکن وہ طاہر کے آگے بڑھ گئی۔ اس کے حواس پر گھبراہٹ تھی۔ طاہر نے اچھی طرح محسوس کی تھی یہ بات۔۔۔۔۔۔۔

دوسری لڑکی بھی آگے بڑھ [illegible]

اور

تیسری نے جیسے دو قدم اک لمحے میں اٹھا کر جست سی بھری اور دوسری کو دھکیل کر پہلی کے برابر ہو گئی۔

پھر چوتھی لڑکی بھی بڑھی۔

"مجھے تھوڑا سا پانی پلا دیجئے۔" طاہر انھیں اس بے اعتنائی سے جاتے دیکھ کر قدم بڑھا کر چوتھی لڑکی کے برابر آ گئے۔

وہ لڑکی رکی۔

اور پھر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

طاہر نے اس کے سراپا کو دیکھا۔ حسن و جمال کی مکمل تصویر ان کے سامنے تھی۔ سرخ و سپید چہرے پر بھیگے بالوں کی لٹیں چپک رہی تھیں۔ شبنمی آنکھوں میں فسوں خیز چاندنی کا عکس تھا۔ طاہر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ فطرت کا ایسا روپہلی جال ہے جو روحوں کو مقید کرنے کے لیے ساری فضا میں پھیلایا گیا ہے۔

طاہر ششدر سے اس پیکرِ جمال کو دیکھتے رہے۔

"کیا کہتے ہو" لڑکی نے خالص دیہاتی انداز میں پوچھا۔ اس کی ساتھی لڑکیاں اگلا موڑ مڑتے ہوئے وحشت زدہ ہرنیوں کی طرح گردنیں گھما کر انھیں دیکھ رہی تھی۔

"تھوڑا سا پانی پلا دو" طاہر نے اس کی شبنمی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ لڑکی کا کھرا سا لہجہ جانے کیوں دل کو بھا سا گیا۔

"پانی" وہ ابرو کھینچ کر بے گانگی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں"

"کیا کرو گے؟"

"پیوں گا"

"پیاس لگی ہے۔"

"ہاں"

"وہ سامنے دیکھو" بلور سی گردن کو دائیں رخ موڑ کر اس نے دوسری پہاڑی پر پھوٹ پھوٹ کر بہنے والے جھرنے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ تو نظر آ رہا ہے۔"

"تو جاؤ۔۔۔ پانی پی لو۔"

"وہاں تک جا سکتا تو بات ہی کیا تھی۔" طاہر جلدی سے بولے۔

"کیوں نہیں جا سکتے؟" حیرت سے لڑکی کی حسین آنکھیں کچھ پھیل سی گئیں۔ طاہر کو سر تا پا بڑی معصومیت سے گھور کر دیکھا۔

نگاہوں کا یہ حسین انداز دل ہی میں تو اتر گیا۔ پیاس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی روح بھی تشنہ محسوس ہوئی۔

"میں وہاں تک نہیں جا سکتا۔ پیاس سے زبان سوکھ رہی ہے۔ مجھ میں ہمت نہیں۔"

"ہونہہ" لڑکی نے تمسخرانہ انداز میں اپنی کومل سی ناک سکوڑی اور پھر انھیں گھور کر بولی "اتنے بڑے گئے تو ہو۔ وہاں تک نہیں جا سکتے۔"

وہ اک شانِ بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ تیز قدم اٹھا کر وہ اپنی ہم جولیوں سے جا ملی جو موڑ پر بس کا انتظار کر رہی تھیں۔

طاہر اس کافر حسینہ کو دیکھتے رہ گئے۔

"کیا کہتا تھا؟" لڑکی کی ہمجولی کی لمبی سی سرگوشی ابھری۔

"کہتا تھا پانی پلا دو۔ پیاس لگی ہے"۔ لڑکی بے پروائی سے بولی۔

"پلا دو انھیں ناجی۔ بیچارے کو اللہ جانے کتنی پیاس تھی۔"

"تم پلا دو" ناجی الجھ پڑی۔

"مجھ سے تو اس نے مانگا ہی نہیں۔۔۔" پہلی لڑکی بولی۔

"کھڑی کیوں ہو گئی ہو۔۔۔ آگے بڑھو" دوسری لڑکی نے کہا۔

"دیکھو تو بیچارہ کتنی حسرت سے دیکھ رہا ہے۔۔۔" تیسری لڑکی نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ناجی نے گاگر سمیت گردن موڑ کر دیکھا۔ طاہر کی نگاہیں انھیں پر لگی تھیں۔

"ہونہہ" وہ آگے بڑھنے لگی۔

"ناجی"

"کیا بات ہے؟"

"بڑی بات ہے۔"

"کیا؟"

"اسے پانی پلا دینا چاہیئے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔۔ ہمارے پاس پانی ہے۔"

"کسی کی پیاس بُجھانا ثواب کا کام ہے۔"

"بیچارہ آدمی"

ناجی کے خوبصورت ماتھے پر شکنیں اُبھریں۔۔ "بیچارہ، بیچارہ نہ کہو۔ یہ شہری لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ماں کہتی ہے ان سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ پانی کے بہانے باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

"ہوں" لڑکیوں نے اپنی آنکھوں کو اس طرح گردشیں دیں جیسے ناجی کی بات سے متفق ہو گئی ہوں۔

چاروں سُست سُست قدم اٹھاتی ہوئیں سرگوشیاں کرتی جانے لگیں۔

پھر

جانے کیا ہوا

چاروں رُک گئیں۔

پانی پلانا ثواب کا کام ہے۔ شاید اس بات پر چاروں متفق ہو گئی تھیں۔

"تم جاؤ!"

"نہیں تم!"

"ناجی تم ہی چلو جاؤ۔ چھوٹی سی تو گاگر ہے تمہاری۔ ہمارے سروں پر تو دو دو گاگریں ہیں۔"

"ہاں ہاں جاؤ بھی۔ دیکھو تو بیچارہ اب بھی ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ ہم یہاں رُکتی ہیں۔ تم جلدی سے پانی پلا کے آجاؤ۔"

"جاؤ بھی ثواب کا کام ہے۔"

اور

مجبوراً ناجی کو اپنی چھوٹی سی گاگر سمیت مڑنا پڑا۔

طاہر کے چہرے پہ مسرور کُن جذبات کی جھلک سی دکھائی دی۔ انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ جذبۂ دل کی کشش واقعی اثر انگیز ہوتی ہے۔

ناجی سر پر گاگر اٹھائے محشر خیز چال چلی، طاہر کے قریب آ رہی تھی۔ طاہر نے اسے مڑتے دیکھ کر ہی منہ دانستہ پھیر لیا تھا۔ جیسے اس کی آمد سے بے خبر ہوں۔

"اے بابو!" ناجی ان کے قریب آتے ہی بولی۔

"کیا ہے؟" طاہر مڑے اور چہرے پر مصنوعی تناؤ پیدا کیا۔

"پانی پی لو" سر پر سے گاگر اتارتے ہوئے وہ بولی۔ اس کا گداز جسم لچک لچک گیا۔

طاہر جھجکی جھجکی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

"پی لونا"۔۔۔۔ ہاتھ میں گاگر پکڑے وہ کھڑی تھی۔

طاہر بغیر کچھ کہے ٹک ٹک اسے دیکھ گئے۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔۔؟ پی لونا پانی!" ناجی جیسے لڑ پڑنے کو تھی۔

"مجھے نہیں چاہیئے تمہارا پانی۔۔۔۔ پیاسا تو ہوں۔ جھرنے پر جا کر پی لوں گا۔" طاہر اس کی حسین آنکھوں کے سحر سے مسحور ہوتے ہوئے بولے۔

"نہیں پیتے تو نہ پیو۔۔۔ بڑے آگئے کہیں سے۔" اس نے بازو کو گردش دے کر گاگر سر پر رکھی۔ چھلکتا ہوا پانی چھلک کر اس کے بالوں کو بھگوتا کپڑے تر کر گیا۔

وہ جانے کو مڑی۔

لیکن قدم اٹھانے سے پہلے ہی طاہر نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"لاؤ پلا دو۔"

ناجی نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

غصے میں وہ کتنی دلکش نظر آ رہی تھی۔ طاہر کا جی چاہتا تھا کہ وہ یونہی کھڑی رہے۔ اور وہ اسے دیکھتے رہیں، دیکھتے رہیں۔ حتیٰ کہ ساری عمر بیت جائے۔

تیوری چڑھا کر اس نے پھر طاہر کو گھورا۔

"پیو نا۔۔۔ پلا دو اب۔"

ناجی تذبذب میں تھی۔

طاہر نے اسی پتھر پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اوک سی بنا دی۔

ناجی نے ان کی طرف دیکھا۔ کچھ جذبۂ ترحم آنکھوں میں ابھرا۔ بغیر کچھ کہے اس نے گاگر سر سے اتاری اور ایک ہاتھ سے گاگر کا منہ پکڑتے ہوئے دوسرے سے گاگر کو نیچے جھکا دیا۔

اور

پھر

اس نے اوک میں دھیرے دھیرے پانی ڈالنا شروع کر دیا۔

پانی کی خمیدہ سی دھار اوک میں پڑنے لگی۔ قدرے جھکی ہوئی ناجی کسی شاعر کا اچھوتا تخیل معلوم ہو رہی تھی۔ جھکنے سے بالوں کی لمبی لمبی آوارہ سی لٹیں شانوں سے کھسک کر آگے کو جھک آئی تھیں۔ دو ایک بار بالوں کے سرے طاہر کے ہاتھوں سے بھی چھو گئے۔

پانی جتنا اوک میں گر رہا تھا۔ اتنا ہی زمین پر بھی گر رہا تھا۔ طاہر عالم وارفتگی میں اس بتِ طناز کو دیکھے جا رہے تھے۔ پانی پینے کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔

"بس" ناجی ان کی نظروں کے انہماک سے شاید گھبرا گئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ اور۔۔۔" طاہر اسی طرح دیکھتے ہوئے بولے۔

ناجی نے دوسرے ہاتھ سے گاگر کو قدرے اونچا کیا۔ اور پھر پانی انڈیلنے لگی۔ گاگر آدھی ہو گئی تھی۔ لیکن طاہر کی پیاس اب تک نہ بجھی تھی۔ پیاس پانی سے بجھنے کا سوال ہوتا تو کب کی بجھ چکی ہوتی۔ یہاں تو روح کی تشنگی تھی جو اس قربت سے اور بھڑک اٹھی تھی۔

"بس؟" ناجی نے گاگر میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں؟۔۔۔ اور۔۔۔" طاہر وارفتہ سے تھے۔

"پیٹ ہے یا تنور۔۔۔ ساری گاگر خالی کر دی اور پیاس ہی نہیں بجھتی۔" جھلا کر ناجی نے گاگر سیدھی کر لی۔ اس کے ماتھے پر واضح شکنیں تھیں۔ آنکھوں میں غصہ کی چنگاریاں۔

"احسان کر کے جتلایا نہیں کرتے۔" طاہر مسکراتے ہوئے اٹھے۔ جیب سے رومال نکال کر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ "شکریہ"

ناجی نے غصہ سے ان کی طرف دیکھا۔۔۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔۔۔ "سارا پانی ختم کر دیا۔ اب مجھے پھر نیچے جانا پڑے گا۔"

ناجی کی معصومیت، سادہ لوحی۔۔۔ اور اکھڑ سا اندازِ تخاطب طاہر کے سینے میں گدگدی کی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

"لاؤ میں بھر کے لا دوں" طاہر نے گاگر لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

"اب وہاں تک جانے کی ہمت آگئی ہے۔" وہ بیچ بیچ لڑ پڑی۔
"ہاں" طاہر محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔ "اب تو اس سے بھی دُور جا سکتا ہوں۔ لاؤ گاگر دے دو۔ بھر کر تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"
"گھر!" ناجی مشتبہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں"
"وہ کیوں؟"
"تمہارے احسان کا بدلہ چکا دوں گا نا"
"اونہہ" ناجی نے اک حسین انداز میں ناک سکوڑ کر ہونٹوں کو دلفریب گردش دیتے ہوئے طاہر کی طرف دیکھا "جیسے میں جانتی نہیں۔"
"کیا؟" پُر شوق تجسس سے طاہر نے پوچھا۔
"تمہاری چالاکی"
"چالاکی؟"
"اور کیا"
"وہ کیسے؟"
"اس طرح تم میرے گھر کا پتہ لگانا چاہتے ہو نا" اس نے جیسے بہت بڑا انکشاف کیا۔ طاہر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔
"مجھے تمہارے گھر کا پتہ لگانے کی کیا ضرورت ہے بھلا" سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی غرض سے طاہر بولے۔
"جیسے میں جانتی نہیں" مشکوک نظروں سے طاہر کو دیکھتے ہوئے وہ قدرے مسکرائی۔
"کیا؟"
"اماں کہتی ہے شہری لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھروں کے پتے لیتے ہیں۔۔۔۔ اماں کہتی ہے ان سے بچ کر رہنا چاہیئے اسی لیے تو میں نے تمہیں پانی نہیں پلایا تھا۔"
"اچھا۔۔۔" وہ دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وہ بولے۔
"ہاں تو" اپنے پیشے سے کہا

"لیکن پھر کیوں آگئیں؟"
"شاد کہتی تھی۔۔۔ پانی نہ پلانے سے گناہ ہو گا۔"
"ناجی!" دور موڑ پر کھڑی لڑکیوں نے اُسے پکارا۔
"ہاں" ملجی سے ہاں ناجی کے ہونٹوں سے نکلی۔
"آؤ بھی اب" پھر ان لڑکیوں نے کہا۔
"آؤں کیسے۔۔۔۔۔۔ ساری گاگر تو خالی ہو گئی۔ تم ٹھہرو۔ میں پھر بھر لاؤں۔" طاہر پر غصے سے تلخ سی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ جنگلی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی نیچے اتر گئی۔
طاہر اس کے لال دوپٹے کے لہراتے آنچل اس وقت تک دیکھتے رہے جس وقت تک وہ نظر آتے رہے۔
وہ جا چکی تھی۔ طاہر نے مڑ کر اپنا کیمرہ اٹھایا۔ اس کے لبوں پر "ناجی" تھا۔

○

۴

حسن کی سحر طرازیاں جوانی کے جنوں کو ہوا دیتی ہی آئی ہیں۔ طاہر جیسے حسن پسند نوجوان ناجی کے الہڑ، بے پرواہ اور انمول حسن سے صرف متاثر ہی نہ ہوئے بلکہ پہلی ہی نظر میں دل کو گھائل کر لیا۔ حسنِ جہاں سوز کے کرشمے بارہا دیکھے تھے۔ بے تکلفی سے بھی اور چھپ چھپ بھی۔ یورپ کے تفریحی دورے میں حسن کی نمائش دیکھی تھی۔ گھریلو ماحول میں حسن کی آنکھ مچولی سے بھی لطف اندوز ہوئے تھے۔ لیکن جس سکون بخش ٹھنڈک کا احساس انھیں ناجی کو دیکھ کر ہوا، پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

تصنع و بناوٹ سے بے نیاز۔۔۔ تکلفات سے عاری۔۔۔۔ قدرت کا عکس ناجی میں اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر نظر آیا۔

رات بھر وہ رنگین رنگین خواب دیکھتے رہے۔ حسن، شوخی، مستی اور ادائیں قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح سینوں میں بکھر بکھر جاتے تھے۔

صبح وہ اٹھے تو حواس پر کسی تند و تیز شراب کا سا نشہ تھا۔ دل اک انوکھے انداز سے دھڑک رہا تھا۔ اور روح انھی ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستوں پر گھر سے نکلنے کے لیے بے چین رہی تھی۔ جہاں انھیں کل دستِ قدرت کا شاہکار نظر آیا تھا۔

اور

سورج ابھی پوری طرح طلوع بھی نہ ہوا تھا۔ ترچھی اور لانبی لانبی روپہلی کرنیں فضا میں جال سی بُن رہی تھیں۔ طاہر کسی مقناطیسی کشش سے انھی کچے پہاڑی راستوں پر کھنچے چلے جا رہے تھے۔

موسم بڑا ہی حسین اور رومان پرور تھا۔ رات ہلکی سی بارش ہو جانے سے اک خوشگوار صبح ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی۔ سہانی۔ سہانی اور رومانی سی صبح۔۔۔۔

طاہر دل میں اک جہانِ آرزو لیے جھرنے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کا قیاس تھا کہ دل... لڑکیاں آج بھی ضرور جھرنے پر پانی لینے آتی ہوں گی۔

چند لڑکیاں جھرنے کے قریب اپنی پیتل، کانسی اور مٹی کی گاگریں لیے کھڑی تھیں۔ طاہر نے گھنے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دیکھا۔ کل والا کوئی چہرہ نظر نہ آیا۔

طاہر نے اک لذت آمیز انجانی سی بے قراری سی محسوس کی۔

لڑکیاں گھڑے بھر بھر کر جانے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد خاموشی چھا گئی جیسے صرف جھرنے کے پانی کا مترنم شور متلاطم کر رہا تھا۔ طاہر کا انتظار مایوس نہیں ہوا۔ وہیں ٹہلتے ہوئے وہ کل والی لڑکی کا انتظار کرنے لگے۔ ناجی۔۔۔۔ ناجی ضرور آئے گی۔ ان کا دل کہہ رہا تھا۔

طاہر ٹہلتے رہے۔ خودرو پودوں کی مہک۔۔۔۔ مستانہ ہوا اور قریب ہی پانی گرنے کی مسلسل نغمگی نے انتظار کی لذت کو بار بننے نہ دیا۔ دل بار بار سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وہ آئے گی۔

دل کی آواز صادق تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کھنکتے قہقہے اور رسیلی ہنسی فضا میں گونج گئی۔

طاہر نے آواز سنی اور

دل کہہ اٹھا!

"وہ آگئی"

وہ واقعی آگئی تھی۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں موجِ خرام کی طرح بل کھاتی، لہراتی، اٹھکیلیاں کرتی وہ چلی آ رہی تھی۔ لال گلابی، نیلے پیلے آنچل ہوا سے اڑ رہے تھے۔ سبزے میں گھری ہوئی پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتی یہ مدہوش جوانیاں مستی بھری ادائیں بکھیرتی چلی آ رہی تھیں۔

طاہر جھاڑیوں کی قدرتی باڑ میں خود کو چھپائے یہ جلوے نگاہوں میں سمیٹ رہے تھے۔ نگاہوں کا مرکز ہی الہڑ اکھڑ سی دیہاتی ناجی تھی۔

لڑکیاں ان کے انتہائی قریب سے گزریں۔ طاہر دبک کر بیٹھ گئے، وہ گزر گئیں۔

ان کی موجودگی سے بے خبر گزر گئیں۔

جھرنے پر پہنچ کر سب نے گاگریں رکھ دیں۔ اور سب نے پانی میں نیم ڈوبے پتھروں پر بیٹھ کر کپڑے سمیٹ کر ننگی پنڈلیاں پانی میں ڈال دیں۔

یوں تو سبھی لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ لیکن طاہر کی نگاہِ انتخاب ناجی پر پڑی تھی۔

یوں بھی جو فسوں ناجی کے حسن میں تھا، جو تپش ناجی کی جوانی میں تھی اور کسی میں نہ تھی۔

لڑکیوں کو شرارت سوجھی۔۔۔ پانی کے چھینٹے اڑانے لگیں۔۔۔ ناجی نے شادو کو بھگو دیا۔ شادو نے ناجی کو گھسیٹ کر عین جھرنے کے نیچے لا کھڑا کیا۔ سانولی نے لپک کر شادو کی مدد کی اور دونوں نے ناجی کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک وہ سر تا پا بھیگ نہ گئی۔

بھیگی ہوئی ناجی کو دیکھ کر طاہر کو جل پریوں کے وجود کا یقین آگیا۔

کافی دیر تک لڑکیاں پانی میں کھیلتی رہیں۔

سورج کافی اونچا ہو گیا۔ لڑکیوں کو وقت کا احساس ہوا۔ کھیل چھوڑ کر سب نے بھیگے دوپٹے اور گھیر دار قمیضوں کے دامن نچوڑے۔ دوپٹے لہرا لہرا کر سکھائے۔ پھر باری باری سب نے اپنی اپنی گاگریں بھریں۔ اور پھر باری باری گاگریں سروں پر اٹھا کر آگے پیچھے کچی پگڈنڈی پر چل دیں۔

چند لمحوں بعد فضا سونی ہو چکی تھی۔ ماحول کا حسن اب ماند پڑ چکا تھا طاہر یوں چونکے جیسے خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔ جل پریوں کا رقص ختم ہو چکا تھا۔

طاہر نے نیچے دیکھا۔ پہاڑی کے دامن میں چاروں لڑکیوں کے دامن لہرا رہے تھے۔ جانے کیا سوجھی۔ جگہ سے ہٹے اور دوسری ڈھلان پر تیزی سے اترنے لگے۔ دریا راستے کو پھلانگتے ہوئے ختم کر کے وہ اسی پہاڑی کے عقب سے اوپر چڑھنے لگے جس پر لڑکیاں محو خرام تھیں۔

پتھروں کو پھلانگتے بڑے بڑے قدم اٹھاتے طاہر اپنی کل والی جگہ پر آ پہنچے۔۔۔ لڑکیوں کو ادھر سے ہی تو گزرنا تھا۔ دل میں ناجی سے باتیں کرنے کی خواہش، جو تڑپ رہی تھی۔

اسی پتھر پر بیٹھے ہوئے طاہر نے گھاس کے کچھ تنکے نوچے اور ان سے اس بے دلی سے کھیلنے لگے۔ جیسے لڑکیوں کی آمد سے قطعاً بے خبر ہوں۔

قہقہے قریب آگئے۔ اپنے آپ کو اور بے تعلق ظاہر کرنے کے لیے طاہر نے چند کنکر اٹھائے۔ اور دوسری جانب کو یونہی پھینکنے لگے۔

آوازیں قریب تر ہو گئیں

طاہر بظاہر انجان بنے بار بار دزدیدہ نظروں سے کچے راستے کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے لڑکیوں کی آمد متوقع تھی۔

پھر

لڑکیاں آگئیں۔ آگے پیچھے گاگریں اٹھائے۔

طاہر کو دیکھ کر وہ کچھ سمٹ گئیں۔ گھبرائیں۔ اور کترا کر نکلنا چاہا۔

"اے لڑکی!" طاہر نے ایک دم اٹھ کر ناجی کو پکارا۔

لڑکیاں تیز قدم اٹھا کر بڑھنے لگیں۔ لیکن ناجی رک گئی۔

"تھوڑا پانی چاہیئے" ناجی کو رکتے دیکھ کر طاہر کی ہمت بندھی۔

ناجی کے گداز جسم میں اک قہرمانی تناؤ آگیا۔ چہرے پر ناگوار سے تاثرات کی جھلک واضح نظر آئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ طاہر کے بظاہر لاپروا اور انداز تخاطب کی حقیقت کو جان گئی ہو۔

غصیلی نظروں سے طاہر کو گھور کر دیکھا۔

شادو بھی رک گئی تھی۔ ناجی کے تیور دیکھ کر اس کی کمر میں ٹہو کا دیا "چلو بھی!" لیکن ناجی قہر آلود نگاہوں سے طاہر کو گھورنے لگی۔

"پانی پلا دو" طاہر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔

"آؤ ناجی" شادو شریر مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ گئی۔

لیکن ناجی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"خواہ مخواہ منہ نہ لگانا آؤ!" شادو نے سرگوشی کر کے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"ٹھہرو تم" ناجی نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

شادو آگے بڑھ گئی۔ چند قدم پر دوسری لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ بوجھ گاگروں کے بوجھ سے دبی دبی گردنیں بمشکل موڑ کر طاہر و ناجی کو دیکھ رہی تھیں۔

"کیا کہتے ہو؟" ناجی بھنویں کھینچ کر بڑے اکھڑ لہجے میں بولی۔

"پیاس لگی ہے" طاہر شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر بولے۔

"پانی پیو گے؟"

"ہاں"

"اتنی صبح صبح تمہیں پیاس لگی ہے؟"

"ازلی پیاسا ہوں"

"ہیں؟"

"سخت پیاسا ہوں"

"لو پیو!۔۔۔۔"

ناجی نے گاگر سر سے اتاری۔

طاہر متبسم نظروں سے اسے دیکھتے کل کی طرح پتھر پر بیٹھ گئے۔ ہاتھوں کی اوک بنا کر انھوں نے نظریں ناجی کے صبیح چہرے پر گاڑ دیں۔

بازو کی خفیف سی گردش سے گاگر گھما کر ناجی نے دوسرے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے پانی اوک میں انڈیلا۔

پیاس کسے تھی۔ یہ تو تقریب بہر ملاقات تھی۔ پانی سارے کا سارا اوک سے گر رہا تھا۔ ہونٹ اوک سے لگے تر ضرور ہو رہے تھے۔ نگاہیں ناجی کے ہوش ربا حسن کی داد دے رہی تھیں۔

"بس؟" ناجی نے گھڑی بھر بعد پوچھا۔

"نہیں" بلا تامل طاہر کہہ اٹھے۔

ناجی نے پھر پانی چھلکایا۔ پانی کی موٹی سی دھار اوک میں پڑی۔۔۔ چھینٹوں سے طاہر کی قمیص اور پتلون کے پائنچے گیلے ہو گئے۔

"بس؟" ناجی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ اب کے اس کی شبنمی آنکھوں میں بڑی دلفریب چمک تھی۔

"نہیں" طاہر اسی انداز میں بولے۔

"اچھا" ناجی نے کہتے ہوئے اک لمحہ ضائع کیے بغیر پوری گاگر طاہر کے سر پر انڈیل دی۔

"ا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رے۔۔۔" طاہر بڑبڑا کر اٹھے۔

"اب تو پیاس بجھی؟" ناجی ہنستے ہوئے بولی۔ اور طاہر کے حواس مجتمع کرنے سے پیشتر ہی قہقہہ لگا کر اپنی ہم جولیوں کی طرف بھاگی۔ جو طاہر کی گھبراہٹ اور ناجی کی حرکت پر کھلکھلا کر قہقہے لگا رہی تھیں۔

طاہر نے ماتھے سے گیلے بال ہٹائے۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ پونچھا۔ کپڑے

جھاڑے۔ خفیف سے ہو گئے تھے۔ لڑکیوں کے قہقہے خفت میں اضافہ کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ جوان سی چھیڑ دل کے تاروں پر انوکھے اور رسیلے نغموں کا اضافہ کر گئی تھی۔

لڑکیاں تیزی سے اوپر جا رہی تھیں۔

طاہر انھیں دیکھتے رہے۔

اگلے موڑ پر ناجی نے درخت پر تقریباً جھولتے ہوئے نیچے دیکھا اور پھر اس کی دل نشیں ہنسی فضا میں گونج گئی۔

طاہر اسے دیکھتے رہ گئے۔

———○———

۵

رات تیز بارش ہوئی۔ فضا دھل کر نکھر گئی۔ صبح بارش تھم گئی تھی۔ لیکن ماحول ابھی تک نم آلود تھا۔ گل پوش پہاڑیوں پر جوبن آگیا تھا۔ پھول اور سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں نگاہ کو حلاوت و طراوت بخش رہی تھیں۔

پہاڑی نالے کا سرخ پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جھاگ اور چھینٹے اڑاتا نالہ بستیوں کی طرف جا رہا تھا۔ شاں شاں کی آواز یوں محسوس ہوتی تھی۔ جیسے خود دار نالہ بلندیوں سے پستیوں کی طرف جانے پر غصے سے چیخ رہا ہو۔

طاہر حسب عادت کیمرہ کندھے پر ڈالے اس گھاٹی میں گھوم رہے تھے۔ جس سے کف بدہن نالہ سر کے بل نیچے گر رہا تھا۔ نالے کے کنارے نوکیلے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے طاہر اوپر چڑھ رہے تھے۔ طاہر نالے کے اس حصہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ جہاں جھکے جھکے درختوں نے ایک محراب سی بنا رکھی تھی۔ اور پہاڑی نالہ اس تنگ جگہ سے رہائی پانے کے لیے بڑے جوش و خروش سے جد و جہد کر رہا تھا۔

دوربین آنکھوں سے لگا انھوں نے پھر اس فردوسی محراب کو دیکھا۔ قدرت کا ملے خاموش حسن نے ہمت دلائی۔ اور پھر دشوار گزار کنارے پر راستہ بناتے اوپر چڑھنے لگے۔

طاہر اکثر اس جگہ آیا کرتے تھے۔ لیکن اب تو اک کشش تھی۔ جو کشاں کشاں یہاں کھینچ لاتی۔ گھاٹی میں گھومتے پھرتے کہیں نہ کہیں تو ناجی نظر آ ہی جاتی۔ گو اس دن کے بعد وہ اس کے راستے میں نہ آئے تھے۔ لیکن اس کے اردگرد منڈلاتے ضرور رہتے تھے۔ دن میں ایک دو بار ضرور وہ نظر آجاتی۔ کبھی جھرنے کے قریب۔۔۔ کبھی گھاٹی میں اور کبھی پہاڑی راستے کے کچے موڑ پر۔ وہ کہیں دور بھی ہوتی تو دوربین ایک مخلص دوست کی طرح اسے ان کی آنکھوں میں لا بٹھاتی تھی۔

اس سے پھر بات کرنے کا موقع تو نہ ملا تھا لیکن وہ اکثر انھیں دیکھ کر شوخی سے ذرا مسکرا دیتی جیسے اس دن کی چھیڑ کا کوئی سراب تک اس کے ہاتھ میں ہو۔ طاہر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے اوپر چڑھ رہے تھے۔

"رانی۔۔۔ رانی۔۔۔ او۔۔۔۔۔۔۔و۔۔۔ رانی۔۔۔۔ ٹھہر۔۔۔۔ جا۔۔۔۔ را۔۔۔نی۔۔۔!"

کوئی دور سے پکارتا چلا آ رہا تھا۔ آواز نسوانی تھی۔ گھبراہٹ کا عنصر غالب تھا۔ آواز وادی میں گونج رہی تھی۔

طاہر نے اس سمت دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔

"رانی۔۔۔۔ر۔۔۔۔ا۔۔نی!"

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی تیزی سے پھسلتے ہوئے چیخ رہا ہو۔ طاہر متعجب تھے۔ چند ہی سیکنڈ بعد انھوں نے دیکھا۔

بکری کا خوبصورت سا بچہ پتھروں کو پھلانگتا۔۔۔ اچھلتا، کودتا انھی کی طرف آ رہا تھا۔ "ر۔۔۔انی" چیڑ کے درختوں میں گلابی آنچل لہرائے۔

طاہر نے دیکھا۔

ناجی گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں رانی رانی پکارتی، درختوں کا سہارا لیتی، پتھروں سے ٹکراتی، اترنے سے زیادہ لڑھکنے کے انداز میں ادھر کو لپک رہی تھی۔

ناجی نے طاہر کو دیکھا۔ "بابو۔۔۔۔ اے بابو۔۔۔ "وہ چیخی" رانی کو پکڑنا بابو۔۔۔ نالے میں گر جائے گی۔"

طاہر نے اک نظر ناجی کو دیکھا اور پھر بکری کے بچے کو، جو ان سے چند قدم کے فاصلہ پر کسی بے جان پتھر کی طرح لڑھکتا ہوا نالے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"ر۔۔ا۔۔۔نی!" ناجی کی لمبی سی چیخ گونج گئی!

طاہر نے بکری کے بچے کو دیکھا۔ برق کی سی تیزی سے بڑھ کر وہ اسے پکڑ نہ لیتے تو وہ یقیناً تیز رفتار نالے میں گر جاتا۔

بکری کا بچہ اب طاہر کے ہاتھوں میں تھا۔ ناجی اپنا توازن بمشکل قائم رکھتے ہوئے ایک پتھر سے دوسرے پر پھلانگیں لگاتی نیچے اتر رہی تھی۔

قریب آتے ہی اس نے طاہر سے جھپٹ کر بکری کا پیارا سا بچہ لے لیا۔ "رانی۔۔۔ میری رانی۔۔۔" بڑے والہانہ انداز میں وہ اس کے ملائم جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

بولی۔
طاہر ایک ٹک ناجی کو دیکھے جا رہے تھے۔ ہانپتی ہوئی ناجی کا یہ انداز بالکل نیا تھا۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے اس کے سینے کا مدّ و جزر طاہر کے جذبات کی دنیا میں ہل چل مچا رہا تھا۔ براق سی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس پر گھبراہٹ اب تک طاری تھی۔ رانی کو پیار کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

جھکی ہوئی نظریں اُٹھا کر اس نے طاہر کو دیکھا۔ اس کے بھیگے بھیگے لبوں پر اک دِل نواز تبسم بکھر گیا۔

وہ قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی۔ رانی کے پاؤں دوپٹے کے آنچل سے باندھ کر پاؤں کے قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ''تو اگر نالے میں گر جاتی تو میں کیا کرتی رانی۔۔۔''

سر اٹھا کر رانی نے پھر طاہر کی طرف دیکھا۔ شاید یہ نظریں اظہارِ تشکر کے طور پر تھیں۔

طاہر اسے تکے جا رہے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے گلابی کپڑوں میں وہ سبزہ میں بیٹھی گلاب کا نوشگفتہ پھول لگ رہی تھی۔

''تم بڑے اچھے ہو بابو۔۔۔!'' لجا کر ناجی نے کہا۔

''اچھا ہوں'' طاہر دلچسپی سے اسے دیکھ کر بولے۔

''ہاں بابو۔ تم نے میری رانی کو بچایا ہے نا۔۔۔''

''رانی کو بچایا تو ہے۔ لیکن اسے پھر اٹھا کر نالے میں پھینکوں گا۔'' شوخ نگاہوں سے ناجی کو گھور کر بولے۔

''کیوں؟'' ناجی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اور غیر شعوری طور پر اس نے جھک کر بچے کے اوپر ہاتھ رکھ لیے۔

''میں آج اپنا بدلہ لوں گا۔'' طاہر نے غصیلی آواز بنا کر اسے گھورا۔

''بدلہ۔۔۔!'' وہ سہم گئی۔

''اس دن مجھے بھگویا کیوں تھا۔۔۔''

ناجی سہم کر پلکیں جھپکا جھپکا کر انھیں دیکھنے لگی۔

طاہر جھکے اور بکری کے بچے کو اٹھانا چاہا۔

''اے بابو!'' وہ منت سے بولی۔

''چھوڑ دو اسے!'' طاہر غصیلہ بنتے ہوئے بولے۔ ''میں اسے نالے میں پھینک کر ہی دم لوں گا۔''

''نہیں۔۔۔ نہیں بابو۔۔۔!'' ناجی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

طاہر نے بکری کے بچے کو کھینچا۔

ناجی نے بے اختیار طاہر کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ بھیگی آنکھوں سے انھیں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بڑے ظالم ہو بابو۔۔۔ بڑے ظالم ہو۔۔۔''

طاہر جیسے بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئے۔ نرم وگداز صندلی ہاتھوں کا لمس رگ رگ میں برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ لیکن یہ احساس کسی کرب کا حامل نہ تھا۔ بلکہ یہ احساس لطف وانبساط کے نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا۔ مضبوطی سے ان کی کلائیاں پکڑے ناجی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر التجا کر رہی تھی۔

طاہر کی نظریں ان نظروں سے ملیں۔ جانے کونسا خاموش پیغام تھا جو دلوں میں اترا اور روحوں میں جذب ہو گیا۔

ناجی کی نگاہیں جھک گئیں۔

سر بھی جھک گیا۔

اور

اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

جانے کب

اور

کیسے

ناجی کے ہاتھ طاہر کے مضبوط ہاتھوں میں آ گئے۔

ساری فضا' سارا ماحول اور ساری کائنات اک طلسماتی سکتے میں آ گئی۔ اس سکتے میں بڑی ہی خاموشی سے روحوں کے ابدی بندھن کا معاہدہ ہو گیا۔

بکری کا بچہ ممیایا۔

سکتہ ٹوٹ گیا۔

ناجی نے آہستگی سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ جھکی جھکی حیا بار نظروں سے اس نے طاہر کو دیکھا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ناجی نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی سی چھلک آئی تھی۔ اور وہ اس بے ہوش شرابی کی طرح بہکی بہکی نظر آرہی تھی جس نے اپنی شدید پیاس پانی کے بجائے تیز و تند شراب سے بجھانے کی کوشش کی ہو۔

"ابھی نہ جاؤ!" طاہر آہستگی سے بولے۔

"ماں غصے ہوگی" ناجی نے بڑی سادگی سے کہا۔

"پھر آؤگی؟" لجاجت آمیز التجا تھی۔

ناجی میں نہ اقرار کی ہمت تھی نہ انکار کی۔

"ضرور آنا ناجی۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" وہ جذباتی لہجے میں میں بولے۔

"ماں آنے نہ دے گی بابو۔۔۔۔" وہ اکھڑے سے انداز میں بولی۔

"ناجی!" طاہر پریشان ہوگئے۔

"ماں کہتی ہے غیر مردوں کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔" اس نے بڑی ہی معصومیت سے کہا۔

طاہر نے اس کی آنکھوں میں اس طرح دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں "مجھے اب بھی غیر ہی سمجھتی ہو؟"

ناجی شاید ان نظروں کی پکار سمجھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر اک شرمیلا سا تبسم پھیل گیا۔ اور اک نگاہ جو بظاہر سادہ سی تھی، طاہر پر ڈالتے ہوئے پھر سے مسکرا دی۔

"کل آؤگی نا؟" طاہر نے اس کے قدم اٹھاتے ہی بے صبری سے اس کا آنچل پکڑ لیا۔

"ہاں" وہ آنچل چھڑا کر چل دی۔۔۔۔ اس کی ہاں میں اک اعتماد تھا۔

دوسرے دن ناجی حسب وعدہ آگئی۔ وہی شوخ و شنگ ناجی۔

الہڑ، بے پروا اور اپنے حسن سے غافل ناجی۔۔ آج اس پر کل والا جذباتی سکر د تھا۔ وہ بات بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ بے تکلفی سے طاہر سے باتیں کر رہی تھی اور

طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ناجی انہیں اب ہی نہیں ملی بلکہ وہ تو ان کے جنم جنم کا ساتھی ہے۔

دونوں نالے کے کنارے [illegible]

"اگر تم پھسل جاتیں تو؟" طاہر نے ڈھلانی رستے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"جس بے احتیاطی سے اس کم بخت بکری کے بچے کے لیے بھاگی آرہی تھیں۔ گرنا یقینی ہی تو تھا۔"

ناجی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ہنستی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔"

"کیوں؟"

"جیسے مجھے کھائی میں اترنا نہیں آتا۔"

"اترنا اور بات ہے تمہاری طرح بھاگتے آنا اور بات۔۔۔۔ ذرا سا پاؤں پھسلا تو بس۔۔۔!"

"رانی اگر ڈوب جاتی تو؟"

"رانی کے لیے جان کی بازی لگا دی!"

"ہائے میری رانی"

"بڑا پیار ہے اس سے؟"

"ہاں"

"کتنا؟"

"اتنا!" اس نے معصومیت سے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"اور بھی کسی سے اتنا پیار ہے" طاہر نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولے۔

"ہاں" وہ آنکھیں گھما کر مسکرائی۔

"کس سے؟" طاہر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اپنی ماں سے" وہ اسی سادگی سے بولی۔

"صرف ماں سے باپ سے نہیں۔۔۔۔"

"باپ تو ہے ہی نہیں؟"

"اوہو۔۔۔۔"

"ماں کہتی ہے۔ میں اتنی سی تھی۔" اس نے زمین سے فٹ بھر کی اونچائی پر ہاتھ سے

اشارہ کیا۔ "جب میرے بابا مر گئے۔"

"بہت چھوٹی سی تھیں۔ تمہیں تو یاد بھی نہ ہوگا۔"

"بالکل ہی نہیں۔۔۔۔ ماں کہتی ہے بابا مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ شہر میں میرے لیے ڈھیروں چیزیں لاتے تھے۔"

"شہر میں؟"

"ہاں۔۔۔ بابا شہر میں کام کرتے تھے نا۔ وہ مر گئے۔ تو ماں اکیلی کیسے رہتی وہاں۔ ماں گاؤں میں آ گئی۔۔۔"

سیدھی سادی ناجی اچھی خاصی باتونی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے گھر بار۔۔۔ گاؤں اور سہیلیوں کے متعلق طاہر کو بہت کچھ بتا دیا۔

طاہر اس کی دلفریب باتوں میں کھو گئے تھے۔ زندگی کی حقیقت کو اتنے قریب سے دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ فطرت اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر تھی۔ تصنع اور بناوٹ نے زندگی کو ملوث نہ کیا تھا۔ ظاہر داری نے فطرت کی شکل مسخ نہ کی تھی۔

گھنٹہ بھر کی معصوم قربت کے بعد دونوں کل کے وعدے پر جدا ہو گئے۔

---

(۶)

"اے بابو۔۔۔۔" پتھر پر بیٹھے ہوئے ناجی نے طاہر کو پکارا!

"میرا نام بابو نہیں ہے" طاہر کیمرہ کھولتے ہوئے بولے۔

"تو پھر کیا کہوں تمہیں؟"

"طاہر۔۔۔۔"

"طاہر۔۔۔۔!" ناجی نے برا سا منہ بنا لیا۔

"کیوں پسند نہیں آیا میرا نام؟" طاہر مسکرائے۔

ناجی نے نفی میں سر ہلا دیا۔۔ طاہر اس سادگی پر مسکرا دیئے۔

"میرے اور بھی کئی نام ہیں۔۔۔۔ طاہر پسند نہیں تو کسی اور نام سے پکارا کرو۔۔۔"

"اور نام بھی ہیں؟"

"ہاں"

"کون سے۔۔۔۔ بتاؤ نا!"

"بتاؤں؟"

"ہاں"

"سنتی جاؤ"

ناجی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"طاہر کے علاوہ میرے نام ہیں۔ "سجن۔۔ سجنوا۔ پیا۔ سیاں۔۔۔"

"اتنے بہت سے نام ہیں تمہارے۔۔؟"

"جو پسند ہو۔۔۔ اسی سے پکارا کرو۔۔۔۔"

ناجی نے زیر لب سارے نام دہرائے۔ جیسے ناموں کی نغمگی کا جائزہ لے رہی ہوں۔

پھر خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔ "سیاں۔۔۔ میں تمہیں سیاں کہوں گی۔۔۔ کتنا اچھا نام ہے تمہارا۔۔۔"

"مجھے پکارو۔۔" طاہر جوشِ مسرت سے بولے۔

"سیاں" فضا میں ترنم بکھر گیا۔ آواز میں موسیقی کا رس تھا۔ طاہر مسرت سے جھوم جھوم گئے۔

ملاقاتیں بڑھیں۔ راز و نیاز ہوئے اور دونوں ایک دوسرے میں کھو کر رہ گئے۔

اس دن موسم سہانا تھا۔ طاہر کافی دیر سے ناجی کے حسن کو سلولائیڈ پر منتقل کر رہے تھے۔ وہ ان سے کتنی باتیں پوچھ رہی تھی۔ کیمرہ اس کے لیے عجیب سی شے تھی۔ حیرانگی سے وہ اس کے متعلق طاہر سے سوال پہ سوال کیے جا رہی تھی۔ طاہر اس کے معصوم سوالوں کے بڑے دل نشیں انداز میں جواب دے رہے تھے۔

"تمہارے پاس کتنی عجیب عجیب چیزیں ہیں سیاں۔۔؟" ناجی نے کیمرہ طاہر کو دے کر دوربین اٹھالی۔

"بہت"

"اور بھی ہیں؟"

"ہاں"

"کہاں ہیں؟"

"گھر پر۔۔۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے سیاں؟"

"میرا گھر؟"

"ہاں"

"شہر میں"

"کیسا ہے؟"

"بڑا خوب صورت"

ناجی چپ ہو گئی۔

"دیکھو گی؟"

"ماں شہر کہاں جانے دے گی۔۔۔!"

"یہاں سے بھی نظر آتا ہے۔"

"جھوٹے۔۔۔۔"

"آؤ دکھاؤں تمہیں"

طاہر اُٹھے۔ ناجی کا ہاتھ کھینچ کر اسے بھی اٹھایا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

"ذرا نیچے۔۔۔ وہاں سے میرا گھر صاف نظر آتا ہے۔"

"سچ؟"

"میں نے جھوٹ کبھی بولا ہے۔"

دونوں نشیب کی طرف اترنے لگے۔ نالے کے پہلے گھماؤ پر طاہر رک گئے۔

"اس پتھر پر کھڑی ہو جاؤ۔"

ناجی اونچے سے پتھر پر چڑھ گئی۔ پھر طاہر بھی اس کے برابر کھڑے ہو گئے۔

"ادھر دیکھو۔۔۔" طاہر نے نیچے شہر کی طرف اشارہ کیا۔

شہر کی آبادی کے غیر واضح سے نشان یہاں سے نظر تو آتے تھے۔ لیکن اتنی دور سے طاہر کا گھر کیسے نظر آ سکتا تھا۔ ناجی آبادی کی بجائے عدم اعتمادی سے طاہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہ دیکھو" طاہر نے دور نشیبی علاقے کی طرف اشارہ کیا۔

ناجی یونہی دیکھنے لگی۔

"اس طرف نہیں۔۔۔ ادھر۔۔۔" طاہر نے پھر اشارہ کیا۔ سرخ سرخ گنبد نظر آ رہے ہیں؟

"ہاں"

"گول گنبد؟۔۔۔۔۔ سرخ سرخ۔۔ چمک رہے ہیں نا۔"

"ہاں ہاں"

"وہی میرا گھر ہے۔"

ناجی نے پلٹ کر طاہر کی طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے اسے طاہر کی بے تکی بات کا پتہ چل گیا ہو۔ مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں آنکھوں کی شوخی چمک کر اجاگر ہو گئی۔ تیکھی نظروں سے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی "وہ تمہارا گھر ہے؟"

"ہاں" طاہر متعجب سے اسے دیکھنے لگے۔

"لال لال گنبدوں والا" وہ جیسے ہنسی روک رہی تھی۔

"ہاں ہاں وہی" طاہر حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔ سنہری ستون بھی تو دکھائی دے رہے ہیں۔"

"وہ تمہارا گھر ہے۔۔۔؟" ناجی بے قابو ہنسی کو روک رہی تھی۔

"ہاں"

اور

ناجی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ہنسنے سے نمی سی آگئی۔

"جھوٹے"

"کیوں"

"جیسے میں جانتی نہیں۔۔۔" اس نے آنکھیں مٹکا کر گردن ہلائی۔

"ناجی" طاہر اس کی ہنسی کا مطلب نہ سمجھ سکے۔

"وہ تو محل ہے محل" ناجی نے شوخی سے ان کی تھوڑی کو چھو کر اس طرح کہا جیسے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہو۔۔۔ "نواب صاحب کا محل ہے۔ نواب صاحب کا۔"

اور

طاہر کے لب متبسم ہو گئے۔ چھلانگ لگا کر وہ پتھر سے کود ے۔ پھر ہاتھ کا سہارا دے کر ناجی کو اتارا۔

ناجی اپنی فتح پر نازاں تھی۔ اٹھلاتی ہوئی بولی "میں نے نواب صاحب کو دیکھا ہے۔"

"کہاں؟" شوق سے طاہر بولے۔

"شبھر گئی تھی ایک دفعہ ماں کے ساتھ۔۔۔ محل بھی دیکھا تھا۔ نواب صاحب بھی۔ مجھے تو بڑا ڈر لگا ان سے۔"

"کیوں؟"

"بس ان کی شکل دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔" ناجی یوں کہہ رہی تھی جیسے اس ڈر کا احساس اب بھی ہو رہا ہو۔

"ڈرنے کی کیا بات تھی" طاہر تجسس سے کرید رہے تھے۔

"ان کی شکل ہی ایسی تھی۔ میں تو ڈر کر ماں کے پیچھے چھپ گئی۔ موٹی موٹی لال آنکھیں۔ اتنی بڑی بڑی مونچھیں۔ اور اتنے موٹے۔۔ توبہ۔۔ توبہ"

ناجی باتوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں پھیلائے ہاتھوں سے اشارے بھی کر رہی تھی۔ طاہر ہنسی روکے سن رہے تھے۔ جب اس نے ہاتھ پھیلا کر نواب صاحب کی موٹائی کا اندازہ بتایا تو طاہر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"وہ میرے ابا ہیں ناجی۔"

اور ناجی نے چونک کر ایک دم طاہر کی طرف دیکھا۔

طاہر مسکرائے۔

ناجی ششدر سی رہ گئی۔ تذبذب کے عالم میں اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر طاہر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی کچھ عدم اعتمادی کی جھلک تھی۔

طاہر نے اس کی ذہنی و قلبی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے متعلق اسے سب کچھ بتا دیتے۔

طاہر نے سنجیدگی سے مختصر الفاظ میں اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیا۔

لیکن

ناجی۔۔۔۔ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گئی۔ گرے پتلون اور سلک کی قمیص میں ملبوس طاہر اسے پہلی بار نواب زادے کی شکل میں دکھائی دیئے۔ شاید لاشعوری طور پر اسے اپنے اور ان کے درمیانی خلا کا احساس ہو گیا تھا۔

"ناجی!" وہ بے تاب ہو کر بولے۔

"ہوں" ناجی سر جھکائے چپ چاپ کھڑی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئی ہو؟"

"کچھ نہیں"

"پھر بھی؟"

"سوچ رہی ہوں۔"

"کیا۔۔۔ ناجی۔ کیا سوچ رہی ہو۔۔۔؟"

"تم بہت۔۔۔ بڑے آدمی ہو۔۔ میاں۔۔" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے طاہر کو دیکھنے

لگی۔ "تو آپ ہو نا۔۔ محل میں رہتے ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ناجی" طاہر نے بے قرار ہو کر کہا۔

"مجھے چھوڑ تو نہ دو گے سیاں" اچانک ناجی نے طاہر کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر روہانسی آواز میں کہا۔

"ناجی۔۔۔" طاہر کی تڑپ دید کے قابل تھی۔ ناجی کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ یہ اس کے قلبی ہیجان کا غماز تھا۔

"تم نے ایسی بات کیوں کر سوچی ناجی" طاہر کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔

"ماں کہتی ہے۔ امیر غریب کا کوئی جوڑ۔۔۔ نہیں سیاں۔" ناجی سسکنے لگی۔

"ناجی! طاہر نے جوش جذبات سے کانپتی آواز میں کہتے ہوئے ناجی کے دونوں ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑ لیے جیسے اس طرح اسے اس ان ٹوٹ بندھن کا احساس دلانا چاہتا ہوں جو دنیا کی دسترس سے دور روحوں کو جکڑے ہوئے تھا۔

"تم میری روح ہو ناجی۔۔۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔۔ تمہارے بغیر میں۔۔۔ میں زندہ رہنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا ناجی۔۔۔ تم نے کیا بات کہہ دی"

اور بڑی ہی عقیدت سے طاہر نے اپنی آنکھیں ناجی کے ہاتھوں سے لگا دیں۔ ناجی بڑی متاثر ہوئی۔ اک انجانے سکون کا احساس اس کے حواس پر چھا گیا۔

"ناجی" طاہر نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں تمہارا ہوں، تم میری ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔۔۔۔ تم میری رانی بنو گی۔ میں اپنی خاندانی اور روایتی شان و شوکت کے ساتھ تمہیں اپنے محل میں لے جاؤں گا۔"

ناجی کی آنکھیں اس اقرار پر یوں چمکنے لگیں جیسے چودھویں کے پورے چاند کی چاندنی گھل گھل کر ان آنکھوں میں سما رہی ہو۔

(۷)

دن گزر رہے تھے۔

طاہر و ناجی دنیا و مافیہا سے بے خبر راہِ عشق پر رواں دواں تھے۔۔ اس راہ پر تو نہ انہیں کانٹے نظر آئے نہ پتھریلی رکاوٹیں۔ انہیں تو چاروں طرف بہاروں کا حسن دکھائی دیتا تھا۔

لیکن

ماں کی جہاں دیدہ نگاہیں ناجی کی بہکی بہکی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ناجی کی ماں تھی۔ ناجی کو اس نے جنم دیا تھا۔ پالا پوسا تھا۔ پروان چڑھایا تھا۔ وہ اس کی ایک ایک عادت سے واقف تھی۔ اس کے ذہنی رجحانات سے آگاہ تھی۔ ناجی اس سبک رفتار ندی کی طرح تھی جو اک متعینہ رفتار سے متعینہ راستے پر بہی چلی جاتی ہے۔

لیکن

اب

ماں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ندی کا پانی چڑھ رہا ہو۔ سبک رفتار ندی سیلاب زدہ ہوتی جا رہی ہو۔

ماں سخت متفکر تھی زندگی نے تلخیوں سے دوچار رکھا تھا تجربے کا اک وسیع اثاثہ انہی تلخیوں نے اسے بخشا تھا۔ ناجی کی ناسمجھی و معصومیت ہی تو اسے ڈبو سکتی تھی۔ وہ اشارتاً، کنایتہً اسے سمجھانے لگی۔ زیادہ سے زیادہ دیر گھر کے کاموں میں مشغول رکھنے لگی۔ گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا لیکن ناجی پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ دھوپ کے انداز سے اپنے باہر جانے کے اوقات میں تبدیلی نہ کر سکی۔ کبھی روٹھ کر، کبھی لڑ کر کبھی سانولی کے گھر اور کبھی شادو کے بہانے گھر سے نکل جاتی۔

ماں اس کی دبی دبی گھبراہٹ اور کھوئے کھوئے انداز سے، سوچ میں ڈوب

میں ہار دی ہے ۔ لیکن اسے بار بار ایسا شک گزرا ضرور ۔ اس نے اپنے رویے میں غیر معمولی سختی برتی گھر سے ناجی کا نکلنا بند کر دیا ۔

اپنی دانست میں اس نے ناجی کو بھٹکنے سے بچانے کا مؤثر قدم اٹھایا لیکن ناجی محبت کی سحر آفرینیوں کے سامنے بے بس ہو چکی تھی ۔ سیلاب طوفانی صورت اختیار کر جائے تو کوئی بند اس کے بہاؤ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا ۔ شوریدہ سر موجیں کنارے توڑ کر اپنا راستہ بنا لیتی ہیں ۔

ناجی کو دن میں نکلنے سے روکا گیا ۔ تو وہ اپنی منزل کی طرف رات کو کھنچنے لگی ۔

ناجی کی سہیلیاں اس کی کھیل میں عدم دلچسپی اور بے توجہی سے نالاں تھیں ۔ سارا مزہ تو اس کی چنچل چھیڑ چھاڑ اور مستی میں تھا ۔ وہ اس مسئلے کو سلجھانے کے متعلق سوچ رہی تھیں ۔ ماں سے بار بار وہ ناجی کے گھر سے نہ نکلنے پر شکوہ کر چکی تھیں ۔ لیکن اب ناجی نے رات کو آنا بھی چھوڑ دیا ۔ گھڑی بھر کو دکھائی دیتی پھر غائب ۔۔

اور

اب تو متواتر تین راتوں سے وہ کسی کو نظر نہ آئی تھی ۔ لڑکیاں ماں کی پابندی پر تبصرہ کرتی ہوئیں اس کے گھر چل دیں ۔ آج وہ ماں کو منا کر ناجی کو اپنے ساتھ لانے کا تہیہ کر چکی تھیں ۔

ماں ابھی ابھی بستر میں لیٹی تھی ۔ ناجی کھیل کھیلنے کو جا چکی تھی ۔

"ماں جی" چھوٹا سا دروازہ کھولتے ہوئے شادو نے اندر جھانکا ۔

"آؤ شاداں بیٹی" ماں نے سر ابھار کر دروازے کی طرف دیکھا ۔ اور پھر لڑکیوں کو اندر آتے دیکھ کر بستر میں سے اٹھ بیٹھی ۔

لڑکیوں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا ۔ دوسرا بستر خالی تھا ۔ سرسوں کے تیل کا چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا ۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی سے الجھ رہی تھی ۔

"ناجی کہاں ہے ماں جی ؟" ۔۔ شادو نے پوچھا ۔ ماں کے جواب دینے سے پہلے سانولی نے شکوہ کیا ۔ "آپ اسے کھیلنے کیوں نہیں دیتیں ماں جی ۔"

"پہلے تو دن کو نہیں نکلنے دیتی تھیں ۔ اب رات کو بھی بند کر دیا ۔" [illegible] انداز شکوے کا تھا ۔

"سارا لطف تو اسی کے دم سے ہے ۔ آج تین راتیں ہو گئیں ۔ اللہ کی قسم اس کے بغیر جو کھیل کا لطف آیا ہو ۔"

لڑکیاں بغیر ماں کے جواب سنے شکوہ کیے جا رہی تھیں ۔

اور

ماں

ماں کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا ۔ حیرت زدہ سی وہ سب کا منہ دیکھ رہی تھی ۔ سردی کی کپکپی سی اس کے وجود پر طاری ہو گئی ۔ اس کا دماغ سُن سا ہو گیا تھا ۔

"وہ اکیلی تو نہیں ماں جی ۔ ہم سبھی ہوتے ہیں نا ۔۔ تم خواہ مخواہ اسے روک لیتی ہو ۔۔ اپنا ہی تو گاؤں ہے ۔ سب ہی لڑکیاں تو کھیلنے آتی ہیں ۔ دن کو نہ سہی رات کو تو کھیلنے دیا کرو ۔۔"

"زیادہ نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے ہی ماں جی ۔۔ آخر بالکل تو آنا بند نہ کرو ۔۔ ہماری سکھی ہے ۔ ہمیں اس کے بغیر کیسے مزہ آ سکتا ہے ۔"

چاروں لڑکیاں گِلہ کیے جا رہی تھیں ۔ ماں کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا ۔ دیے کی ناکافی روشنی اس کے چہرے کے تاثرات چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی ۔

چہرہ

جو وسوسوں اندیشوں اور خدشوں کے گمبھیر سایوں سے بھیانک نظر آ رہا تھا ۔

ناجی لڑکیوں کے کھیل میں شریک نہ ہوتی تھی ۔ وہ کونسا کھیل کھیل رہی تھی ۔ ماں کی تجربہ کار نظریں بہت کچھ سمجھ گئی تھیں ۔ اس کے ان شبہات کو تقویت مل گئی تھی جو ناجی کے بدلے تیوروں کو دیکھ کر ایک عرصہ سے اس کے ذہن میں رینگ رہے تھے ۔

لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں ۔ اور ماں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گدلے پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کی اس کی بیوگی کی چادر کو داغدار بنا رہی ہوں ۔

گھبرا کر اس نے سب کے چہروں کو گھورا ۔

"ناجی ہے کہاں ماں جی ؟"

"وہ" ماں کا دماغ چکرا گیا ۔

"کمرے میں تو نہیں ۔ کہیں باہر گئی ہے ۔"

"ہاں" ماں نے جلدی سے کہہ دیا ۔

یہاں ؟
"ریشماں کے گھر" ماں نے جلدی سے بات بنائی ۔ اپنی دور پار کی رشتہ دار کا نام لیا ۔

"ریشماں کے گھر ۔۔ اتنی دور ۔۔۔ ؟"

"ہاں"

"کوئی کام تھا ماں جی ۔۔ ؟"

"ہاں"

"اکیلی گئی ہے ۔۔ ؟"

"آں ۔۔ نہیں ۔۔ نہیں تو ۔۔ ریشماں کی ماں آئی تھی ۔۔"

"رات کو آجائے گی ؟"

"شاید ۔۔ شاید رات وہیں رہ جائے ۔۔" ماں ہکلا رہی تھی ۔

"کل آنے دوگی نا ماں جی اسے ؟" لڑکیوں کا لہجہ التجا آمیز تھا ۔

"دیکھوں گی ۔۔"

"ضرور بھیجنا ماں جی ۔۔ تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی ۔"

"اچھا"

لڑکیاں وعدہ لے کر ماں جی کو سلام کر کے رخصت ہوگئیں ۔ ان کے جانے پر ماں اس عمارت کی طرح بستر میں دھڑام سے گر گئی جس کی بنیاد کسی نے کھوکھلی کر دی ہوں ۔

ناجی گلاب کا مہکتا ہوا پھول تھی ۔ اس کی شادابی و رعنائی ماں کی نظروں سے مستور نہ تھی ۔ لیکن اتنا بھی جانتی تھی کہ بادِ سموم کا ایک ہی جھونکا یہ شادابی و رعنائی ختم کر دے گا ۔ ماں پر کسی وحشت ناک خیال سے بار بار لرزہ طاری تھا ۔

اضطراب بڑھتا گیا ۔

بےقرار ہو کر بستر میں سے اٹھ بیٹھی ۔ اس کے خون میں تیزی آرہی تھی ۔ غصہ کی لہریں اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں ۔

ناجی ۔۔ ناجی ۔ اس کی زندگی کا روشن چراغ تھی ۔

لیکن

یہی چراغ اگر اس کی عزت کا دامن جلانے کو لپکے تو وہ اپنے ہاتھوں اس چراغ کو گل کر دے گی ۔

ابال اٹھتا رہا ۔ ہونٹ کاٹتے ، دانت پیستے خشمگیں نگاہوں سے دروازے کو گھورتے وہ ناجی کا انتظار کر رہی تھی ۔

اک اک لمحہ اس کے دل و دماغ پر سنگِ گراں کی طرح پڑ رہا تھا ۔ اس کا جگر چھلنی ہو رہا تھا ۔ اس کی بندشوں اور پابندیوں کے باوجود ناجی بہک گئی تھی ۔

ناجی ۔۔ جو اس کی سولہ سالہ بیوگی کی پارسائی اور ریاضت کا ثمر تھی ۔

ماں کی بے قراری بڑھتی گئی ۔ ناجی ابھی تک نہ آئی تھی ۔ وہ بستر سے نکلی ، اپنی موٹی سی چادر اوڑھی اور گھر سے باہر نکل گئی ۔

کھیل کا میدان کسی ویرانے کی طرح سنسان تھا ۔ رات کی سیاہی گھل رہی تھی ۔ بوڑھے درخت سوگوار سے نظر آرہے تھے ۔ ماں کتنی ہی دیر عالمِ اضطراب میں وہاں پھرتی رہی ۔ آج اس کے اعتماد نے کس بری طرح شکست کھائی تھی ۔

"ناجی ۔۔ کاش ناجی تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی ۔۔" پتھر پر بیٹھی ماں سسک سسک کر رو رہی تھی ۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور اس کی بے قابو سسکیوں سے ویرانے کا سکوت ٹوٹ رہا تھا ۔

رو لینے سے دل کو کچھ ڈھارس بندھی ۔ اب وہ ہیجانی جذبات سے دوچار نہ تھی ۔ وہ اطمینان سے سوچ رہی تھی کہ ناجی معصوم تھی ۔ اسے سمجھا بجھا کر سیدھے راستے پر لے آنا اس کی ذمہ داری تھی ۔ وہ اپنی بچی کو سمجھائے گی ۔ اپنے تجربے کی روشنی میں زندگی کے اتار چڑھاؤ کی جھلک دکھائے گی ۔ ناجی راہِ راست پر آجائے گی ۔ ضرور آجائے گی ۔

وہ چپکے سے اٹھی موٹی چادر کے کھردرے کونے سے بھیگی آنکھوں کو پونچھا اور بہت کچھ سوچتے ہوئے گھر کی طرف چل دی ۔

گھر سے کچھ ہی فاصلے پر اسے دو سائے سے درختوں کے جھنڈ میں نظر آئے ۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا ۔ درختوں کی اوٹ میں بولتے ہوئے وہ دبے قدموں ان کے قریب پہنچ گئی ۔ گھمبیر سیاہی میں شناخت مشکل تو تھی لیکن پہلی ہی نظر میں وہ پہچان گئی کہ دو سایوں میں ایک سایہ ناجی ہے ۔

پیچھے خود کو چھپائے وہ دونوں سایوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی ۔

ایک واقعی ناجی تھی اور دوسرا ۔۔ دوسرا کوئی اجنبی ۔ اسکے لباس سے ماں نے جانچ لیا کہ وہ کوئی شہری ہے ۔

ماں کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا ۔ وہیں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئی ۔

"کل بھی آؤ گی نا ؟" اک سرگوشی ابھری ۔

"تم روز ہی کیوں پوچھتے ہو سیاں ؟"

"یاد دلاتا ہوں ۔"

"میں کبھی بھول سکتی ہوں ۔"

"تم کتنی اچھی ہو ناجی ۔"

اور پھر اجنبی نے ناجی کو خدا حافظ کہا ۔

ناجی چلی گئی ۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا ۔ نظروں سے اوجھل ہو جانے پر وہ مڑا اور گے راستے کی طرف چل دیا ۔

ماں اٹھی آندھی کی طرح اٹھی ۔۔ میدان پار کر کے اس نے درمیانی فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا ۔ ناجی اوپر سے ہو کر گھر جا رہی تھی ۔ ماں راستہ قطع کر کے اس سے پہلے گھر جا پہنچی ۔

معمول کے مطابق وہ بستر میں لیٹ گئی ۔ اپنے سارے ہنگامی جذبات کو سینے میں چھپائے یوں لیٹی جیسے کوئی خاص بات وقوع پذیر ہی نہ ہوئی ہو ۔

○

(۸)

ناجی بڑے محتاط قدم رکھتی گھر میں داخل ہوئی ۔ آہستگی سے کواڑ کھول کر اپنے کمرے میں جھانکا ۔ ماں بستر میں پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی ۔

ناجی اطمینان سے اندر داخل ہوئی ۔ دروازے کی کنڈی چڑھائی اور اپنے بستر کی طرف بڑھی ۔

کھدر کی موٹی چادر بستر پر پڑی تھی ۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے چادر کھول کر اپنے اوپر ڈالی ۔

"ناجی" ماں نے اچانک پلٹ کر اسے پکارا ۔

"کیا ہے ماں ؟" ناجی نے لیٹے لیٹے جواب دیا ۔

"آ گئی ہو" ماں نے سر قدرے اونچا کر کے اسے دیکھا ۔

"ہاں ماں" وہ اٹھ کر ماں کے پاس آئی ۔ اس کی چارپائی پر جھکتے ہوئے پوچھا ۔

"میں آ گئی ہوں ۔ ماں کیا بات ہے ؟"

"کب آئیں ۔"

"ابھی ابھی ۔ کچھ ہی دیر ہوئی ۔"

"اتنی دیر سے کہاں تھی ۔" ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پٹی پر بٹھا لیا ۔ ناجی کا دل بری طرح کانپ گیا ۔

"کھیل رہی تھی ماں ۔" وہ تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے بولی ۔

"اندھیرے میں کونسا کھیل کھیل رہی تھی ؟"

"آنکھ مچولی ۔"

"آنکھ مچولی ؟"

"ہاں ماں"

"اندھیرے میں تو یوں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر آنکھوں پر پٹی بندھ لی جائے تو ۔۔" ماں چپ ہو گئی ۔

ناجی ماں کے وقار، دبدبے اور انداز سے سہم گئی ۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا ۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی ۔ دئیے کی ٹمٹماتی لو میں اس نے بھر کو ماں کی طرف دیکھا ۔ لیکن پھر نگاہیں اٹھانے کی ہمت نہ کر سکی ۔

"جوانی میں ایسے کھیل من کو بھاتے ضرور ہیں ۔ لیکن ان کا انجام خطرناک ہوتا ہے ۔" ماں نے سنجیدگی سے کہا ۔ ناجی گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی ۔

"سو جاؤ ماں" ناجی نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے جلدی سے ماں کی چادر درست کی ۔

"اب تک سوئی ہی رہی ہوں ۔" ماں نے ناجی کے ہاتھ پکڑ لیے ۔ اب جاگنے کی ضرورت ہے ۔"

"ماں" ناجی کی حسین شبنمی آنکھوں میں خوف، معصومیت، حیرت اور پریشانی تھی ۔

"تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے ۔ تمہیں راستہ دکھانے کے لیے مجھے جاگنا ہی پڑے گا ۔"

"ماں" ناجی روہانسی ہو گئی ۔ ماں کی عجیب عجیب باتوں سے وہ کتنی پریشان ہو گئی تھی ۔

ماں نے گہری نظروں سے ناجی کو دیکھا ۔ یہ نظریں ناجی کے دل کا ہر راز پا لینے کی طاقت رکھتی تھیں ۔

ناجی بری طرح گھبرا رہی تھی ۔ من میں چور تھا ۔ اس کا دم الجھنے لگا ۔ رنگ فق تھا ۔ صندلی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے ۔

"جوانی دیوانی ہوتی ہے" ماں بستر میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی ۔ "اس عمر میں کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں ۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ماں ۔ کیسی باتیں کر رہی ہو ۔" ناجی رو دینے کو تھی ۔

"ناجی ۔۔ آج میری عزت کا دامن شعلوں کی لپیٹ میں آگیا ہے ۔"

"ماں"

"ناجی ۔۔ سچ سچ بتا دے تو اس وقت کہاں سے آئی ہے ۔"

اس نے چاہا کہہ دے کہ جھیل کے میدان سے، لیکن جانے کیوں وہ جھوٹ نہ بول سکی ۔ اس کا سر جھک گیا۔ ڈر اور خوف کی سرد سی لہر اس کے وجود میں سنسناہٹ پیدا کر گئی ۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیہوش ہو کر گرا چاہتی ہو ۔

"کہاں تھی تو اس وقت ؟" ماں کے لہجے میں گرج تھی ۔

ناجی کانپ گئی ۔

"بتا دے ورنہ جان لے تیری ماں کے ہاتھوں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ اپنی عزت کے دامن کو داغ سے بچانے کے لیے تیرا گلا گھونٹ دے ۔"

"ماں" ناجی اس کی گود میں منہ چھپا کر بے اختیار رو دی ۔ یہ اس کے جرم کا کھلا اعتراف تھا ۔

ماں چند لمحوں کے لیے سکتے میں آگئی ۔ ناجی سسک سسک کر روتی رہی ۔

"تو نے آخر وہی کیا جس سے خبردار میں تجھے بچپن سے کرتی آرہی تھی ۔۔" ماں صرف اسی قدر کہہ سکی ۔ اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی ۔

"ماں" بے بس ناجی ہچکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی ۔

"کون ہے وہ ذلیل ۔۔ جو رات کے اندھیرے میں تجھے ورغلانے آتا ہے ؟"

"اسے ۔۔۔ اسے کچھ نہ کہو ماں ۔"

"ناجی !"

"وہ بہت اچھا ہے ماں ۔۔ بہت اچھا ہے ۔" ہچکیاں بھرتے ہوئے ناجی کہہ رہی تھی ۔

"تیری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے ۔ اچھے برے کی تمیز ہی کہاں ہو گی تجھے ۔۔ اس بات کا احساس تجھے اس وقت ہو گا جس وقت بھونرا پھول کا رس چوس کر اڑ جائے گا ۔ کلی کو روند کر ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لے گا ۔"

"نہیں ماں ۔۔" ناجی سسکیاں بھرتے ہوئے بولی "وہ ایسا نہیں ہے وہ ۔۔ وہ مجھ سے ۔۔ سچا پیار ۔۔ کرتا ہے ماں ۔"

"اسی آڑ میں تو مرد تم جیسی نادان لڑکیوں کو لوٹا کرتے ہیں بدبخت ۔"

"نہیں ماں وہ جھوٹ نہیں کہتا ۔" ناجی نے عزم سے چمکتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا اور پھر سر جھکا کر بولی ۔۔ "وہ ۔۔ وہ لال محل میں رہتا ہے ماں ۔۔ وہ موٹے سے نواب صاحب تم نے ایک دفعہ مجھے دکھائے تھے نا ۔۔"

"ہاں"

"وہ ان کا بیٹا ہے ماں ۔" ناجی نے بھیگی آنکھوں سے پھر ماں کو دیکھا ۔

"ناجی !!" ماں حیرت و استعجاب سے چیخ اٹھی ۔

ناجی حیران ہو کر ماں کو دیکھنے لگی ۔

"وہ نواب کا بیٹا ہے ۔" وہ ناجی کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی ۔

"ہاں ماں" ناجی مسکرا دی ۔ روتے روتے مسکرا دی ۔ بھیگی بھیگی مسکراہٹ جیسے برستی گھٹاؤں کا سینہ چیر کر چمکتی دھوپ نکل آئی ہو ۔

ماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ۔ "تجھے ڈوبنا ہی تھا تو ایسی جگہ پر ڈوبتی جہاں کچھ نشان تو باقی رہتا ۔۔ سر بھی پھوڑا تو پتھر کی دیواروں سے ۔"

"ماں" ناجی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ماں کا کندھا ہلایا ۔

"وہ اک نواب زادہ اور تو ایک بے آسرا بیوہ کی لڑکی ۔۔ میں نے جس ڈر سے ہمیشہ تجھے متنبہ کیا وہی پیش آیا ۔۔ آہ ۔۔ ناجی ۔۔!"

ماں سر تھامے بڑبڑا رہی تھی ۔ ناجی کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی ۔۔ لیکن یہ بات وہ سمجھ گئی کہ نواب زادے محبت نہیں کرتے ۔ لیکن اس کا سیاں تو ایسا نہ تھا ۔ وہ ماں کی ہر بات پر کیونکر ایمان لے آتی ۔ وہ لمبی چوڑی باتیں تو سمجھنے کی بے شک صلاحیت نہ رکھتی تھی ۔ لیکن محسوسات کا آلہ تو ہمیشہ اسے سیاں کی محبت کا احساس دلاتا رہتا تھا ۔

ماں کی ساری باتوں کے جواب میں اس نے بڑے سرشار لہجے میں سیاں کی بے پناہ محبت کا اسے یقین دلانا چاہا ۔

"پیار دھنوانوں کا کھیل ہے ناجی" ماں کرخت لہجے میں بولی ۔ "تو اس کے لیے ایک رنگین کھلونا ہے بس ۔"

ماں کے لہجے میں ڈانٹ تھی ۔ ناجی پھر رونے لگی ۔

"اس کا خیال دل سے نکال دے ۔ ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا ۔ تیرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں ۔"

ناجی ماں کی گود میں منہ چھپائے روتی رہی ۔

"تو اس کے چنگل میں کیسے پھنس گئی ناجی ۔۔؟ وہ کہاں سے آگیا"

ماں کے بار بار استفسار پر ناجی نے روتے دھوتے بلا کم و کاست اپنی معصوم محبت کا فسانہ ماں کے سامنے دہرا لیا ۔

ماں تیز نظروں سے ناجی کو دیکھتے ہوئے سن رہی تھی ۔ ناجی کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر تقدس کا نور تھا ۔ روتی آنکھیں محبت کی جوت سے چمک رہی تھیں ۔ صداقت اور معصومیت کے امتزاج نے اس کے چہرے کو اس حد تک پُر نور بنا رکھا تھا کہ ماں کا ضمیر اس کی پاکیزگی کے اعتراف میں چیخ اٹھا ۔

پھر بھی دل کی تسکین کے لیے ماں نے ہر ہر طریق سے اسے کریدا ۔ ناجی کی صاف گوئی اور ماں کی ہر بات کے بے دھڑک جواب نے اس کے مشکوک ذہن کے زاویے بدل دیے ۔ وہ معصوم تھی ۔ اس کی محبت پاک تھی ۔ ابھی تک کچھ نہیں بگڑا تھا ۔ لیکن اس آگہی دوراہے پر ناجی کو اب چھوڑنا عقلمندی نہ تھی ۔ اسے تھام کر راستہ بدل دینے کے لیے ماں کو عقلمندی سے کام لینا تھا ۔

"یہ بہت برا ہوا بیٹی" ماں کے رویے میں نرمی آگئی ۔

"کیوں ماں" ناجی نے معصومیت سے کہا ۔ وہ اب تک سسکیاں بھر رہی تھی ۔

"پیار کا سوانگ بھر کر یہ مرد ناسمجھ لڑکیوں کو برباد کر دیتے ہیں بیٹی ۔"

"نہیں ماں ۔۔ وہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گا ۔۔ وہ ۔۔ وہ مجھے اپنی رانی بنا کر محل میں لے جائے گا ۔" ناجی نادم سی ہو کر پھر ماں کی گود میں جھک گئی ۔

"محل میں ؟"

"ہاں ہاں"

"ہونہہ ۔۔ محلوں کے خواب دکھا کر وہ تجھے جھونپڑیوں کے قابل بھی نہیں رہنے دے گا ۔ وہ تو ۔۔"

"ایسا نہ کہو ماں" ناجی نے گھبرا کر ماں کی بات کاٹ دی ۔

"اس کا فریب بڑا رنگین ہے ناجی ۔ تیرا من بہلانے کو اس نے محلوں کے سپنے دکھائے تھے ۔"

بگڑنے سے پہلے سنبھل جا۔۔ اس سے ملنے کا اب خیال بھی دل میں نہ لانا۔"

"ماں" ناجی کی روح ہمہ پکار بن کر چیخ اٹھی۔ وہ ماں کی گود میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔ ماں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑا اور جھٹک کر سیدھا بٹھایا۔

"سمجھی میری بات۔۔"

ناجی ہچکیاں لینے لگی۔

"کان کھول کر سن لے اگر اب بھی تو نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو مجھ جیسے گراں پتھر سے ٹکرا کر تجھے راہ بنانا ہوگی۔"

"ماں" ناجی کے لہجے میں منت و التجا تھی۔

لیکن ماں کا دل نہیں پسیجا۔۔

وہ روتی رہی۔

ماں نے چپ نہیں کرایا۔ پانی کے اس ریلے کا رخ یہیں سے موڑ لینے کی ضرورت تھی۔ ماں اس ضرورت کی اہمیت کو خوب سمجھ چکی تھی۔ وہ کوئی اور ہوتا تو شاید ماں کے رویے میں لچک کی گنجائش بھی نکل آتی لیکن وہ اک نواب زادہ تھا۔ جس سے ناجی کے مستقبل کی وابستگی کا خیال بھی ماں کے فہم و ادراک میں نہ آسکتا تھا۔

ناجی روتی رہی۔

ماں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئی تو ماں اسے زہر دے کر ابدی نیند سلا دے گی۔

ناجی کے آنسو، آہیں، التجائیں، کوئی بھی تو ماں کی آہنی پابندی کو موڑ توڑ نہ سکیں۔

٩

ناجی ساری رات روتی رہی۔ صبح اٹھی تو اس کی آنکھیں اس حد تک متورم تھیں کہ کھولنا محال تھا۔ ماں اس کا درد سمجھتی تھی لیکن بہ تقاضائے مصلحت وہ تلخ اور سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھی۔

صبح سے دوپہر ہوگئی۔ ناجی سراپا غم بنی بستر میں پڑی رہی۔ کبھی رونے لگتی، کبھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگتی۔

ناجی نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ دوپہر بھی ڈھل رہی تھی۔ ماں کی مامتا پگھلنے لگی۔ تھال میں ساگ روٹی رکھ کر وہ ناجی کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

"روٹی کھالو بیٹی" اس نے پیار سے ناجی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

کشتۂ غم ناجی کو بھلا کھانے سے کیا سروکار تھا۔

"اٹھو بیٹی" ماں نے تھال زمین پر رکھ کر اس کا کندھا ہلایا۔

ناجی پھر سسکنے لگی۔

"اٹھ میری ناسمجھ بچی" ماں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ماں کی نرمی سے اور پیار سے مغلوب ہو کر ناجی بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے وہ اب بھی رو رہی تھی۔

ماں نے پیار سے اس کے الجھے بال درست کر کے دوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔

"تو ناسمجھ ہے میری بچی۔ زمانے کے رنگ نہیں دیکھے۔ ان مردوں کا کیا بھروسہ۔ پیار کے نام پر لوٹ لیتے ہیں۔ جب عورت کے پاس لٹانے کو کچھ نہیں رہتا تو اسی طرح منہ پھیر لیتے ہیں جیسے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ عورت کہیں کی نہیں رہتی۔ لوگ اسے فاحشہ اور بدکار کہہ کر اس کے سائے سے دور بھاگتے ہیں۔ اس کے دامن پر

ایسا سیاہ داغ لگ جاتا ہے جسے وہ اپنی زندگی دے کر بھی نہیں مٹا سکتی ۔"

ناجی سر جھکائے آنسو بہاتی رہی ۔

"ناجی میں نے اپنی بھرپور جوانی اس گاؤں میں گزاری ہے ۔ بیوگی میں جوانی کاٹنا دوبھر ہوتا ہے ۔ لیکن میرا دامن آج تک بے داغ ہے ۔ گاؤں بھر میں میری عزت ہے ۔ لوگ میرے نام پر شرافت کی قسم کھاتے ہیں ۔ تیری ذرا سی لغزش میرے بے داغ دنوں پر سیاہی پھیر دے گی ۔ گاؤں میں کسی کے کانوں میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی کہ تو راتوں کے اندھیرے میں کسی سے ملنے جاتی ہے تو قیامت مچ جائے گی ۔ جینا دوبھر ہو جائے گا ۔ تیرے پیار کی پاکیزگی کو کوئی نہیں دیکھے گا بلکہ تجھے ۔۔۔ تجھے ۔۔!"

"ماں" ناجی نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا ۔۔ اس کا دل پگھل پگھل کر آنسو بنا جا رہا تھا ۔ سیاں کو کیسے چھوڑ سکے گی وہ ۔۔ یہ تو خیال بھی سوہانِ روح تھا ۔

ماں نے اسے اپنی محبت کی شفقتوں سے سنبھالا دینے کی کوشش کی ، بہلایا ، پھسلایا ۔ گاؤں میں چند سال پہلے شیدو کا واقعہ پیش آیا تھا ۔ شہری بابو اسے کہیں کا نہ چھوڑ کر اپنے راستے پر چل دیا تھا ۔ شیدو اپنے گناہ کی سیاہی چھپانے کے لیے پہاڑی ندی میں ڈوب مری تھی ۔

اور

وہ جوشی کی کہانی تو گاؤں بھر میں مشہور ہے ۔ کیسے کیسے سبز باغ دکھا کر وہ بے وفا مرد اس معصوم کو لے اڑا تھا ۔ محبت کے سنہری سپنوں کی تعبیر ڈھونڈتی جوشی کے ہاتھ کچھ بھی تو نہ آیا تھا ۔ مان اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی تھی ۔ اور جب لٹی لٹائی وہ پھر اس گاؤں میں سر چھپانے کے لیے آ نکلی تھی تو اس کے گھر والوں نے اسے وہ عبرت ناک سزا دی تھی کہ گاؤں والوں کے دل کانپ کانپ اٹھے تھے ۔

ماں نے ناجی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شیدو اور جوشی کے واقعات سنائے ۔ ناجی سر تا پا کانپ گئی ۔

"کیا تو بھی اپنا ایسا ہی حشر دیکھنا چاہتی ہے ۔" ماں نے کہا ۔

"ماں ۔۔ وہ ایسا نہیں" ایک بار پھر پورے وثوق کے ساتھ وہ کہہ اٹھی ۔ "وہ ان سب سے بڑھ کر ہو گا ۔"

ماں ترشی سے جیسے چلا اٹھی ۔ "وہ نواب زادہ ہے ۔ چند دنوں کی دل لگی کا سامان اس کے ہاتھ آیا ہے ۔ وہ تجھ سے شادی کرے

گا ۔ ایسی بات بھی نہ سوچو ۔۔۔ یہ تو اک جال ہے جس میں پھنسانے کے لیے وہ تجھے پھسلا رہا ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھ لی اور تجھے بچا لیا ۔۔ ورنہ ۔۔"

انجام کا خیال کر کے ماں کو جھرجھری آ گئی ۔

ماں کی باتیں ناجی کے دل سے سیاں کی محبت تو زائل نہ کر سکیں ہاں وہ اس سے اس طرح چھپ چھپ کر ملنے کی قباحت کو ضرور سمجھ گئی ۔ اس نے آنسو دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیے ۔

ماں کے اصرار پر اس نے منہ دھویا ۔ چند نوالے زہر مار کیے اور پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی ۔

دن جوں توں کر کے گزر گیا ۔

رات آئی ۔

ناجی کا سینہ جذبات کے تلاطم سے شق ہو جانے کو تھا ۔

ماں کی دور رس نظریں اس کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف تھیں ۔

ناجی ماں کی عائد کردہ پابندیاں توڑ کر اپنے سیاں کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی ۔

لیکن ماں اک خاموش پہریدار کی طرح اس کی نگرانی کر رہی تھی ۔ ناجی میں ماں سے ٹکرانے کی بھی تو ہمت نہ تھی ۔ وہ اس کی ماں تھی ۔ جس نے اسے جنم دیا تھا ۔ اور بیوگی میں اپنی جوانی کے خون سے اس کے نخلِ حیات کو سینچا تھا ۔ ناجی ماں سے بغاوت کیوں کر دیتی ۔

ناجی کا ذہن پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا ۔ دل و دماغ گیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہے تھے ۔ اپنی چارپائی پر پڑی وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی ۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی ۔ اس کی تڑپ میں اضافہ ہو رہا تھا ۔

جذبات کی کش مکش میں تڑپتے تڑپتے جانے کب ناجی کی آنکھ لگ گئی ۔ ماں نے آہستگی سے اسے پکارا جواب نہ پا کر اٹھی اور ناجی پر جھک گئی ۔

وہ سو رہی تھی ۔ مضمحل سی نیند ۔

ماں نے اس کی پیشانی چوم لی ۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے گر کر ناجی کے بالوں میں جذب ہو گئے ۔

ہٹ کر وہ اپنی چارپائی پر آ بیٹھی ۔ ممتا کی چبھن سے اس کے سینے میں جلن سی

ہو رہی تھی ۔ کاش وہ اپنی بچی کی ہر خواہش پوری کرنے کی قدرت رکھتی ۔

وہ کافی دیر تک جاگتی رہی ۔ اپنی بے بسی پر رونا بھی آیا ۔ کاتبِ تقدیر سے اس نے اپنی بیوگی پر کبھی اس دکھ اور بے بسی سے گلہ نہیں کیا تھا جتنا آج کر رہی تھی ۔ کاش ناجی اس نواب زادے کے ہم پلہ ہوتی یا وہی نواب زادہ ہونے کی بجائے اسی کی طرح کوئی عام سا آدمی ہوتا ۔ وہ اپنی بچی کا مستقبل اس کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال دیتی ۔

ناجی بدستور سو رہی تھی ۔ ماں نے اسے پھر دیکھا ۔ اٹھ کر اس پر چادر ٹھیک کی اور پھر مطمئن ہو کر خود بھی لیٹ گئی ۔ جلد ہی اس کے تھکے ہوئے ذہن اور الجھے ہوئے دماغ کو نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔

اور

کافی رات ڈھلے ۔ جب پچھلی تاریخوں کا مضمحل چاند سینۂ چرخ پر معلوم مدھم سی روشنی بکھیرنے کی سعی کر رہا تھا ' ناجی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ۔

"سیاں" اس کے ہونٹوں سے فریاد سی نکلی ۔ گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا ۔ دیئے کی مدھم سی روشنی تھرک تھرک کر بجھنے کو تھی ۔ دروازہ بند تھا اور ماں گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی ۔

اس نے دونوں ہتھیلیوں پر اپنی آنکھیں رکھ دیں ۔ ذہن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا ۔ حقائق کی تلخی سامنے آ گئی تھی ۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی روح "سیاں ، سیاں" پکار رہی تھی ۔ پکار لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی ۔

"سیاں انتظار کر رہا ہو گا ۔ ۔" وہ اس خیال پر تڑپ اٹھی ۔

روح کی پکار اک خاموش شور بنتی گئی ۔

"نہیں ۔ ۔ نہیں" ناجی نے سر جھٹک دیا ۔ گھبرا کر اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ۔ لیکن یہ شور رکا نہیں ۔ رکتا بھی کیسے ؟ یہ شور تو اس کی روح کی گہرائیوں سے اٹھ رہا تھا ۔

ناجی اس شور میں ڈوبتی گئی ۔

ناجی ک

ماں کی نصیحتیں ڈوبتی گئیں ۔

دھمکیاں ڈوبتی گئیں ۔

اور

پھر ساری پابندیاں اس شور میں ڈوب گئیں ۔ ناجی چادر ہٹا کر بستر سے اٹھ بیٹھی ۔ ماں گہری نیند سو رہی تھی ۔

اس نے ماں کی طرف دیکھا ۔

اپنے اور سیاں کے درمیان ماں اک سنگلاخ چٹان نظر آئی ۔

وہ مشتعل جذبات سے ماں کو گھورنے لگی ۔ اس نے چاہا کہ ایک ہی جست میں اس چٹان کو پھلانگ جائے ۔

دیئے کی تھرکتی لو میں اس نے قریب آ کر ماں کو دیکھا ۔ ماں اس وقت چٹان نہیں دکھائی دی بلکہ ایسا قابلِ تکریم مرقد معلوم ہوئی جسے پھلانگنا تو ایک طرف اس کی طرف پشت کر کے کھڑا ہونا بھی گناہ کبیرہ ہو ۔

بے دم سی ہو کر ناجی پیچھے ہٹی ۔ اپنے بستر پر گر کر وہ بے اختیار رونے لگی ۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے ۔ الجھن نے جیسے اس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے ۔

وہ پاگلوں کی طرح اٹھ کر پھرنے لگی ۔

اور

پھر اس نے سیاں کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ آخری بار جانے کا ۔ ۔ اس کے بعد اس سے نہیں ملے گی ۔ ۔ کبھی نہیں ملے گی ۔ لیکن آج آخری بار ضرور جائے گی ۔ ۔ سیاں کو اونچ نیچ سمجھانے ، ماں کے خیالات سے مطلع کرنے ۔ زمانے کی ہوا کا رخ بتانے ۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی ۔

وہ کشاں کشاں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی ۔ ماں کا ڈر دل سے نکل چکا تھا ۔ ماں نے پوچھا بھی تو وہ سچ سچ بتا کر پھر سیاں سے نہ ملنے کی قسم کھائے گی ۔

طاہر حسبِ معمول درختوں کے جھنڈ میں اس کا انتظار کر رہے تھے ۔ ناجی وقت پر نہ آئی تو ان کا دم گھٹنے لگا ۔ وقت گزرتا گیا ۔ رات کی نبضیں ڈوبتی گئیں ۔ طاہر ماہیٔ بے آب کی طرح کبھی کھلے میدان میں اور کبھی نشیبی خطے میں تڑپتے پھر رہے تھے ۔ بے

جب ہو کر کتنی بار انہوں نے ناجی ناجی پکارا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور طاہر کی بے چینی جنون بنتی جا رہی تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ طاہر سبزے پر سر تلے دونوں ہاتھ باندھے چت پڑے تھے۔ ناجی کے نہ آنے سے وہ بے جان سے نظر آ رہے تھے۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"سیاں" ناجی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز خاموشی کے سینے میں گونجتی ہوئی آئی۔

طاہر بے اختیارانہ اٹھ کر آواز کی سمت دوڑے۔ ناجی کا سایہ دیکھ کر وہ مقناطیسی کشش سے اس کی جانب کھنچے۔

"ناجی"! طاہر نے لاشعوری طور پر اپنے بازو پھیلائے۔ ناجی بے اختیارانہ ان بازوؤں کے حلقے میں سما گئی۔

"ناجی ۔۔ تم کہاں تھیں ناجی" طاہر نے اس کے حسین پیکر کو پوری قوت سے سمیٹ کر درد بھری آواز میں کہا۔

ناجی ان کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"ناجی" طاہر بے تاب ہو گئے۔

"سیاں" ناجی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طاہر کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ اس کے نہ آنے سے ہی سمجھ گئے تھے کہ وجہ کیا ہے۔ اب ناجی رو رہی تھی۔ طاہر جیسے زیرک انسان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ ان چاہلی فلک کی رفتار کو گوارا نہیں۔

ناجی ہچکیاں لے رہی تھی۔ طاہر نے اس کے کانپتے وجود کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اور پھر بڑی عقیدت سے اپنے لب اس کے بالوں پر رکھ دیئے۔ ناجی کے آنسوؤں سے ان کے کوٹ کا کالر اور قمیص بھیگ رہی تھی۔ طاہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا دے کر طاہر نے ناجی کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اونچا کیا۔

"سیاں" ناجی مجسم فریاد بن گئی۔

"سکھاں ناجی" طاہر نے اس کی متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں

دکھ کی آمیزش تھی۔

ناجی نے سر جھکا لیا۔ آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ طاہر کے بازوؤں کی گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ طاہر نے اسے وہیں سبزے پر اپنے قریب بٹھا لیا۔

پھر طاہر کے بار بار پوچھنے پر اس نے ساری بات طاہر سے کہہ دی۔

"ماں کہتی ہے" وہ بوجھل آواز میں بولی "تم مجھے برباد کر کے چھوڑ دو گے۔"

"ناجی" طاہر یوں چیخے جیسے کوئی بے گناہ جرم عائد ہونے پر چیخ اٹھے۔

"سیاں ۔۔ میں کیا کروں ۔۔!" وہ پھر رو دی ۔۔ "ماں کہتی ہے پیار دھنوانوں کا کھیل ہے ۔۔"

طاہر کے چہرے پر آثارِ کرب تھے۔ ہونٹوں کو کاٹتے پریشانی کے عالم میں وہ اپنی انگلیاں مسل رہے تھے۔

ناجی نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے۔

"میں جاتی ہوں سیاں ۔۔ ماں جاگ جائے گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

طاہر کسی دقیق سوچ میں الجھے تھے۔ ناجی کی آواز پر چونکے۔ اور پھر اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"جا رہی ہو ناجی؟" طاہر نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں" گلوگیر سا جواب تھا۔

"جاؤ" آہستگی سے کہا گیا۔

ناجی نے ان کی طرف دیکھا۔ بے قرار ہو کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر پھسل گئے۔

طاہر نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔۔ "ناجی ۔۔ یوں رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو ۔۔ تمہارے لیے میں زمانے سے ٹکرا جاؤں گا ۔۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا ناجی ۔۔ تمہاری ماں پر یہ ثابت کروں گا کہ پیار دھنوانوں کا کھیل ہی نہیں، ان کی زندگی بھی ہوا کرتا ہے۔"

"سیاں" وفورِ جذبات میں ناجی کی آواز گھٹ گئی۔ اس کی روتی آنکھوں میں جیسے دیئے سے جل اٹھے۔

"جاؤ ناجی" طاہر نے اپنے ہاتھ ہٹا دیے۔ "کل سے تم یہاں نہ آیا کرنا ۔۔"

ناجی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے طاہر کو دیکھا ۔

"اب میں تمہارے گھر آؤں گا" طاہر نے پختہ عزم سے کہا۔

"میرے گھر" ڈر اور حیرت سے ناجی کانپ گئی ۔

"ہاں ۔۔ تمہارے گھر ۔۔ تمہاری ماں سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مانگنے ۔۔"

ناجی تلخ حالات کو بھول کر فردا کے حسین تصور سے جھوم گئی ۔

"تمہیں چند دن انتظار کرنا پڑے گا ۔۔ لیکن گھبرانا نہیں ۔"

"سچ" سراسیمگی سے ناجی کہہ اٹھی ۔

"میری راہیں بڑی کٹھن ہیں ناجی ۔۔" طاہر نے اس کی سراسیمہ نظروں پر تیقن نظروں سے دیکھا۔ لیکن مشکلات حل کرنے ہی کو ہوتی ہیں۔ میرے والدین میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں گے ۔ انہیں رام کرنے کے لیے کچھ دن ضرور لگیں گے ۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائیں گے اور میں تمہیں اپنی خواہش کے مطابق اپنے خاندانی وقار کے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا ۔"

انہوں نے ناجی کے ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے دبائے ۔ "وعدہ کرو تمہارا انتظار نہیں توڑے گا ۔"

ناجی نے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ۔۔ "میں تمام عمر تمہارا انتظار کر سکتی ہوں ۔" ناجی کا ہاتھ تھامے طاہر آج اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے گئے ۔

دونوں ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھتے رہے ۔

آج دونوں ایک غیر معین عرصہ کے لیے جدا ہو رہے تھے ۔ گو اس عارضی جدائی کے عقب میں خوشیاں مسکرا رہی تھیں ۔ تاہم جدائی جدائی ہی تھی ۔ دونوں ہی جانگسل دنوں کے خیال سے افسردہ و اداس نظر آ رہے تھے ۔

انتظار کا وعدہ دے کر طاہر نے ناجی کو خدا حافظ کہا ۔

وہ لوٹ گئے ۔

ناجی کی آنکھیں ایک بار پھر چمک اٹھیں ۔

طاہر کا دل بھی ڈوب رہا تھا ۔ مڑ کر ناجی کو دیکھنے کی بجائے انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی ۔

(۱۰)

الحمراء میں جیسے کوئی بم پھٹا ۔

طاہر نے فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ۔

شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں ۔ جشن کے پروگرام بن رہے تھے شادی کو روایتی آن بان سے کہیں بڑھ چڑھ کر منانے کے اہتمام ہو رہے تھے ۔ طاہر نواب فاروق علی خاں کے چہیتے اور منظورِ نظر تھے ۔ اس لیے یہ شادی اک تاریخی اہمیت رکھتی تھی ۔

حسن بانو بڑے ارمانوں سے تیاریوں میں مصروف تھیں ۔ ریحان کی والدہ سعدیہ ان کا ہاتھ بٹانے میں پیش پیش تھیں ۔ ایک طرف دیور دوسری طرف بہن خوشی سے شادی کی گہما گہمیوں میں شریک تھیں ۔

طاہر نے اچانک اس شادی سے انکار کر دیا ۔

اس انکار سے اک ہنگامہ بپا ہو گیا ۔

اور

جب انہوں نے اپنے انتخاب کو والدین کے سامنے رکھا تو یہ ہنگامہ ایک قیامت خیز دور میں داخل ہو گیا ۔

صدیوں سے اک خاص آن بان کا حامل خاندان اپنے وسیع دامنوں تلے ایک پہاڑی گنوارن دوشیزہ کے لیے جگہ نہ بنا سکتا تھا ۔ ایک ایسی لڑکی کو جسے تہذیب و تمدن کی روشنی نہ ملی ہو ۔ جس کا غیر معروف خاندان کسی طرح بھی اس عالی مرتبت خاندان سے مناسبت نہ رکھتا ہو' کیسے قبول کر لیا جاتا ۔

یہ اس پُر شکوہ خاندان کی بے عزتی تھی ۔

یہ وقار کی ہتک تھی ۔

یہ جاہ و جلال کی توہین تھی ۔

طاہر کی نادانی سمجھ کر انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے نرمی سے سمجھایا گیا۔ منت و سماجت بھی کی گئی ۔ ساحرانہ کشش کے حامل سرسبز باغ بھی دکھائے گئے ۔ لیکن طاہر اپنے عزم سے ذرہ بھر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے ۔ ایک بار جو فیصلہ کر لیتے وہ پتھر پر لکیر ہوا کرتا تھا ۔ یہ تو ان کی زندگی کا سوال تھا ۔ ان کے پیار کا معاملہ تھا ۔

نرمی سے سمجھانا بجھانا راس نہ آیا ۔

تو

پدرانہ وقار جلال میں آگیا۔

مامتا زخمی ناگن کی طرح پھنکاری ۔

خاندانی وقار ، نام نمود ، ظاہر داری ، عظمت و آن کی خون آشام تلوار لہرائیں ۔

لیکن

کوئی بات بھی طاہر کو اپنے عزمِ صمیم سے ہٹا نہ سکی ۔ کوئی بات بھی انہیں متزلزل نہ کر سکی ۔ ان کا ایک ہی جواب تھا کہ شادی ہوگی تو صرف ناجی سے ہوگی ۔

معاملہ کسی طرح بھی نہ نپٹ سکا تو نواب فاروق علی خاں نے آخری داؤ کے لیے انہیں اپنی خواب گاہ میں طلب کیا ۔

رات کے کھانے کے بعد سب اپنی اپنی خواب گاہوں میں جا چکے تھے ۔ ایک مضمحل سا سکوت اور مبہم سی اداسی الحمراء کے در و دیوار پر چھائی رہتی تھی ۔ شام ہی گہری رات کا احساس ہوتا ۔ رونقیں دم توڑ چکی تھیں۔ کھانے کے بعد بیٹھنے کا شاید کوئی تمنائی ہی نہ رہا تھا ۔

نواب فاروق اپنی خوابگاہ میں بے تابی سے ٹہل رہے تھے ۔ طاہر کی سرکشی ان کے وقار کو ہو گزند پہنچی تھی، اس کے آثار ان کے پُر رعب چہرے پر نظر آتے تھے ۔ وسیع اور شاہانہ ٹھاٹھ سے آراستہ خواب گاہ میں بھی انہیں اپنا دم محسوس ہو رہا تھا ۔

بیٹے کا پیار دل میں درد بن کر سلگ رہا تھا لیکن خاندانی آن کے محافظ اور نواب فاروق اپنے نظریے میں لچک کے روادار ہی نہ تھے ۔

طاہر اجازت لے کر اندر داخل ہوئے ۔

فاروق کمرے کے وسط میں کھڑے تھے ۔

باپ بیٹے کی [illegible] ملیں۔ طاہر نے نظریں جھکا لیں۔

لیکن

اس جھکاؤ میں شکست نہ تھی ۔ احترام تھا ۔

"طاہر" پُر رعب آواز کمرے میں گونج پیدا کر گئی ۔

"جی" مؤدبانہ جواب تھا ۔

"میں نے جس مقصد کے لیے تمہیں بلایا ہے ، تم جانتے ہو۔" سنگین لہجے میں کہا گیا ۔

"جی ہاں" جواب میں اٹل فیصلے کی گونج تھی۔

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے ؟"

"جو پہلے تھا"

"طاہر"!

"ابا حضور"

"خوب سوچ لو ۔ یہ سودا خسارے کا ہے ۔ اس وقت عالمِ جنون میں تم کچھ سوچ نہیں سکتے ۔ لیکن یہ جنون جتنی تیزی سے آتا ہے، اسی طرح سے اتر بھی جاتا ہے ۔ ۔ اپنے کئے پر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

"میں نے بہت سوچ بچار کر لی حضور!"

"تو اس دیہاتی گنوارن لڑکی کے ۔ ۔"

"ابا حضور ۔ ۔"

"یہ لڑکی غالباً حسین ہوگی" باپ نے بیٹے کو قطعاً نظرانداز کر کے پھر طنز کیا "لیکن یاد رکھو کہ یہ گنوار حسن تہذیب یافتہ ماحول میں کبھی نہیں پنپ سکتا۔ جنگلی پھول کانٹے دار جھاڑیوں میں ہی زیب دیتے ہیں۔ نکھرے ہوئے آراستہ چمنوں میں وہ بھدے اور بے زیب دکھائی دیتے ہیں ۔"

طاہر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا ۔ آدابِ فرزندی مانع تھے ۔ بمشکل ضبط کیے کھڑے تھے ۔ ورنہ وہ نواب فاروق کو اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دے دیتے ۔

طاہر نہ نرمی سے مرعوب ہوئے نہ طنز سے ۔ باپ کی برداشت جواب دے

تھی ۔
فاروق جلال میں آ گئے ان کی آواز شیروں کی چنگھاڑ اور طوفانوں کی گرج تھی ۔
طاہر اپنے برافروختہ جذبات کو قابو میں رکھنے کی سعی کر رہے تھے ۔

"تو اس دیہاتی لڑکی کے لیے تم ہم سے ٹکرا رہے ہو ؟"

"میں اس کے لیے زمانے سے ٹکرا سکتا ہوں ۔"

"جنون ان حدود کو چھو رہا ہے ۔"

"آپ کی دور رس نظریں بہت کچھ دیکھ سکتی ہیں ۔"

"اس کا انجام جانتے ہو ؟"

"جو ہو گا ۔ ذمہ دار میں خود ہوں ۔"

"پھر سوچ لو ۔۔!"

"اتنی دفعہ سوچا کہ اب سوچنے کی گنجائش ہے نا ضرورت ۔"

"طاہر ۔۔"

"جی"

"تم خودسری پہ آمادہ ہو ۔"

"اگر آپ نے بخوشی اجازت نہ دی تو میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا ۔"

"یاد رکھو تمہاری مجبوری ہماری مجبوری سے ٹکرائی تو انجام تمہارے لیے خطرناک ہو گا ۔"

طاہر نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا ۔۔ چپ ہو گئے ۔۔ لیکن بے چینی ان کے رگ رگ میں سے مترشح تھی ۔ سرخ انگارہ سی آنکھیں ، پھڑکتے ہونٹ ۔۔ اور جسم کی ہر جنبش سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی بات پر اسی طرح قائم ہیں ۔

نواب فاروق بھی اپنے مشتعل جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں تھے ۔ کے بیباک اور بے دھڑک جوابات سے ان کی آتش غضب بری طرح بھڑک اٹھی تھی ۔ بھی دل کے کسی گوشے میں درد بن کر سلگتا ہوا پیار طاہر کو سوچ کا اور موقع دینا چاہتا تھا ۔ ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں ۔ ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا پاپ میں بار بار تمباکو بھرنا ان کے ہیجانی جذبات کا آئینہ دار تھا ۔

"طاہر" وہ گدے دار کرسی پر بیٹھتے ہوئے قدرے نرمی سے بولے "ہم

غور کرنے کا موقعہ دیتے ہیں ۔ اپنی تقدیر پر سیاہی پھیرنے سے پہلے پھر ایک بار اچھی طرح سوچ لو ۔ جس راستے پر آنکھیں بند کر کے گامزن ہو ، آنکھیں کھول کر اچھی طرح جائزہ لے لو ۔۔ جاؤ سوچو ۔۔ اور پھر ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع کرنا ۔۔ جاؤ ۔۔!"

طاہر کھڑے رہے ۔ باپ کی نرمی نے ان کے سینے کا کشیدگی دورہ ختم کر دیا تھا ۔ بپھرے ہوئے جذبات اس نرمی سے درد بن گئے تھے ۔

"تم جا سکتے ہو" نواب فاروق نے آہستگی سے کہا ۔

لیکن طاہر واپس جانے کی بجائے بے تابانہ باپ کی طرف بڑھے ۔

"ابا حضور !" وہ معصوم بچے کی طرح باپ کے قدموں پر گر گئے ۔

بیٹے کی اس حرکت پر باپ کا دل پگھل گیا ۔ لیکن وہ اپنے اٹل فیصلے پر سختی سے کاربند تھے ۔

"ابا حضور ! مجھے مجبور نہ کیجیے" طاہر نے سر اٹھا کر باپ کے زانو پر ٹکا دیا ۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح سسک رہے تھے ۔

"طاہر" باپ کی گلوگیر آواز ابھری ۔۔ وہ اپنے ہاتھ بے ساختہ طاہر کے بالوں پر شفقت سے پھیرنے لگے ۔

وہ چپ تھے ۔ اور خواب گاہ کا خوابیدہ ماحول طاہر کی سسکیوں سے لرزیدہ تھا ۔

"میرے بچے !" کافی دیر چپ رہنے کے بعد نواب فاروق بولے "حالات کو سمجھو بیٹے ، ہمارے خاندانی حالات کیا ہیں ۔ تمہیں فوزیہ سے منسوب ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے ۔ وہ تمہاری خالہ زاد ہے ۔ تمہاری خالہ بیمار رہتی ہیں ۔ یہ خبر ان کے لیے سم قاتل ہوگی ۔ منگنی ٹوٹ جانا کتنی معیوب بات ہے ۔"

"میں فوزیہ کو ایک مستقل آزار کے کچھ نہ دے سکوں گا ابا حضور ! اتنی زندگیاں برباد ہو جائیں گی ۔۔ فوزیہ کے لیے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے میں ۔۔ میں ناجی کے بغیر ۔۔ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ابا حضور ۔۔ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے ۔۔ میں آپ کی شفقتوں کے سایہ سے محروم نہیں رہنا چاہتا ابا حضور ۔۔!"

طاہر نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا ۔

باپ نے منہ پھیر لیا ۔ شاید بیٹے کے ملتجیانہ تاثرات سے ان کے سینے کا پتھر

سوم ہوا جاتا تھا۔

"ابا حضور! مجھے بخوشی اجازت دیجئے۔" طاہر نے پھر اسی طرح باپ کی طرف دیکھا۔

"جاؤ بیٹے" باپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے جذبات بہکے ہوئے ہیں۔ جاکر آرام کرو۔"

"ابا حضور!"

"معاملے کو نبھانے کے متعلق سوچو۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے اور ۔۔ ہم مرتے دم تک اس پر کاربند رہیں گے ۔۔ آوازیں یوں نکل رہی تھی۔ جیسے کوئی زبردستی ان کے منہ سے یہ باتیں اگلوا رہا ہو۔"

طاہر مایوس ہو گئے۔

وہ اٹھے اور کمرے سے یوں نکل گئے جیسے روح قالب سے مرنے کے بعد سب بندھن توڑ کر نکل جاتی ہے۔

O

۱۱

"یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا۔ خواہ مخواہ کی خفت ہی اٹھانی وہاں جاکر۔"

"آپ نے جلدی سے کام لیا حضور ۔۔ ورنہ میں ناجی کی ماں کو ضرور مجبور کر دیتا ۔۔ پیسہ بڑی چیز ہے جناب ۔۔ ایمان بک جاتا ہے۔ وہ ضرور اپنی بیٹی کو صاحب زادے کی راہ سے ہٹانے کی حامی بھر لیتی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے سیفو۔ ہم نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا۔ وہ ایک غیرت مند عورت ہے۔ دولت اسے خرید نہیں سکتی۔"

"ہے تو غیرت مند"

"نوٹ دیکھ کر وہ کس طرح جھپٹی تھی۔ کتنا جلال تھا اس کے چہرے پر، اُف کتنے نادم ہوئے تھے ہم اس لمحہ ۔۔ پتہ ہوتا تو پیسے کی بات ہی نہ کرتے۔ منت سماجت سے کام لیتے۔"

"پھر تو کام منٹوں میں بن جاتا۔"

"اچھا خیر ۔۔ اب اس بات کو چھوڑو ۔۔ کوئی دوسرا حل تلاش کرو ۔۔ طاہر کو اس راہ سے ہر طور ہٹانا ہے ہاں طاہر کو علم نہ ہونے پائے کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

"میں سمجھتا ہوں سرکار ۔۔ انہیں کیسے علم ہوگا۔"

شومئ تقدیر دونوں کی باتیں طاہر نے بھی سن لیں۔ وہ خواب گاہ میں آج باپ سے آخری فیصلہ کرنے آئے تھے۔ آخری دو ٹوک فیصلہ۔ سیفو اور باپ کی باتوں سے حقیقت سامنے آئی۔ ان کی اس بے رحمانہ ذہنیت پر ان کا خون کھول اٹھا۔

بپھرے ہوئے جذبات لیے وہ خواب گاہ کا پردہ اٹھا کر بغیر اجازت اندر آپہنچے۔ سیفو انہیں دیکھ کر بے طرح گھبرا گیا۔ فاروق نے ان کے تیوروں سے ہی بھانپ لیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے۔

شکست خوردہ تو تھے ہی۔ بیٹے کی گستاخانہ حد تک ضد سے جھلا گئے۔ پیشانی پر بل پڑے۔ آنکھوں میں غصہ کی چمک لہرائی۔ گھور کر بیٹے کو دیکھا۔

"ابا حضور۔ میں آخری بار آپ کی خدمت۔۔" طاہر غصہ پر قابو پانے کی کوشش میں بولے۔

"یوں وبالِ جان بننے سے بہتر تھا کہ تمہیں موت آجاتی۔۔" انہوں نے تلخی سے گرج کر کہا۔

"آپ اب بھی یہی سمجھئے کہ طاہر مر گیا۔۔" وہ پلٹے۔

"اس خودسری کی سزا بھیانک ہوگی۔" نواب گرجے۔

"مجھے اس کی پرواہ نہیں۔۔" اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

سیفو جلدی سے اٹھ کر طاہر کے سامنے آگیا۔ شانے سے پکڑتے ہوئے انہیں واپس باپ کی طرف لانا چاہا۔

لیکن جوانی کے طوفانوں کو یوں بھی کبھی روکا جا سکتا ہے۔ طاہر نے اس کا ہاتھ غصے سے جھٹک دیا۔

"انہیں جانے دو سیفو۔۔"

"نواب صاحب! آپ ہی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے۔"

"ہم نے سب سوچ لیا۔ اس خودسری کی سزا اسے بھگتنے دو۔" وہ رعد و برق کی طرح کڑکے۔

"ہم انہیں ان کے حق وراثت سے محروم کرتے ہیں۔"

"نواب صاحب!"

"جاؤ۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔ اگر تم اپنی ضد پر قائم ہو تو اسی وقت الحمراء کو چھوڑ کر دفع ہو جاؤ۔"

"بہت بہتر" طاہر اک لمحہ ضائع کیے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ سیفو انہوں تھا پکڑنے کو لپکا۔ لیکن وہ اسے دھکا دے کر چل دیئے۔

سیفو اس خاندان کا پرانا نمک خوار تھا۔ بات بڑھتے دیکھ کر سیدھا بیگم صاحبہ کے پاس پہنچا۔ وہ نشست گاہ سے نواب گاہ کی طرف جا رہی تھیں۔

سیفو نے ہانپتے ہوئے ساری روداد انہیں کہہ سنائی۔

"آپ چل کر نواب صاحب کو سمجھائیے بیگم صاحبہ۔۔ طاہر تو نا سمجھ ہیں۔ ضد کر بیٹھے ہیں۔ وہی اپنے فیصلے میں ترمیم کر لیں۔"

"انہیں جانے دو۔۔" بیگم صاحبہ نے فرمایا۔

سیفو نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ بیگم صاحبہ کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ لیکن روایت پرستی میں وہ شوہر سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔

"بیگم صاحبہ!"

"سیفو۔۔ طاہر والدین سے ٹکرا رہے ہیں۔ انہیں اس خودسری کا نتیجہ بھی دیکھ لینے دو۔"

"نواب صاحب نے انہیں عاق کر دینے کی دھمکی دی ہے۔"

"دھمکی نہیں یہ حقیقت ہوگی۔ انہوں نے بہتر کیا۔ طاہر کو سیدھی راہ صرف اسی صورت میں نظر آسکے گی۔۔"

"آپ طاہر میاں ہی کو سمجھائیے۔"

"فضول ہے۔۔ طاہر کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ وہ جو کہیں، کر گزرتے ہیں۔"

"پھر بیگم صاحبہ۔۔ کیا ہوگا۔۔؟"

"جو ہوگا ہونے دو۔"

سیفو جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ بھی بھوئی آن کی خاطر ممتا کے تڑپتے جذبوں کو موت کی نیند سلانا چاہتی ہیں۔

مایوس ہو کر وہ لوٹا۔ طاہر کے کمروں کی طرف آیا وہ ابھی اپنے کمرے ہی میں تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ باپ کی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر وہ رات الحمراء کی چھتوں تلے ہرگز نہ گزاریں گے۔

وہ سیدھا اظہر کے پاس گیا۔ بڑا بھائی ہونے کی صورت میں ان پر بھی تو کچھ ذمہ داریاں تھیں۔

اظہر سیفو کے ساتھ آئے۔ سعدیہ بھی روند اوسن کر ان کے پیچھے آئی۔ طاہر اپنے کمرے میں تھے۔ غصے سے کانپ رہے تھے۔ دماغی نسیں جیسے پھٹ جانا چاہتی تھیں۔ جب والدین کی محبت مر چکی تھی تو پھر انہیں کس بات کی فکر تھی۔

جوانی کا خون جوش لعار با تھا۔
اپنا بڑا سا چرمی صندوق کھولے وہ اپنی ذاتی چیزیں اس میں الٹ پلٹ ٹھونس رہے تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے کا آراستہ کمرہ اب الٹ پلٹ چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔
طاہر نیم دیوانگی کے عالم میں چیزیں رکھ رہے تھے۔ بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ رنج و غم سے زرد چہرہ اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ باپ سے انہیں کس قدر محبت تھی، شاید یہ حالت اسی وجہ سے ہو رہی تھی لیکن وہ مجبور تھے۔
میز کی دراز کھول کر انہوں نے کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ بینک میں ان کی ذاتی رقم کافی تھی۔ فکرِ فردا سے مہینوں بے غم رہ سکتے تھے۔
اپنا چرمی بکس اٹھا کر جوش غیظ و غضب سے تپتے وہ کمرے پر الوداعی نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکلے۔
دروازے پر اظہر اور سیفو مل گئے۔
"کہاں جا رہے ہو طاہر؟" اظہر نے لپک کر انہیں شانے سے پکڑ لیا۔
"جہاں تقدیر لے جائے۔"
"پاگل ہو گئے ہو۔"
"چھوڑ دیں مجھے۔۔"
"طاہر بچے کیوں بنتے ہو۔۔" سعدیہ نے بھی بڑھ کر انہیں تھام لیا۔
بھائی بھاوج نے بہتیرا سمجھایا۔ سیفو نے منتیں کیں۔ لیکن طاہر کہاں ماننے والے تھے۔ سبھی کو پہچان گئے تھے۔ یہی بھائی بھاوج تو ان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔
"نواب صاحب کو میں منا لوں گا صاحب زادے۔ اس وقت وہ غصہ میں تھے۔ کچھ دن صبر کرو۔۔" سیفو منت کرتے ہوئے بولا۔
"مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں۔۔" طاہر نے بھڑکتے ہوئے جواب دیا۔
"ایسی خود غرضی بھی اچھی نہیں ہوتی طاہر۔" سعدیہ نے روہانسی آواز میں کہا۔
"خود غرضی کیسی۔۔ مجھے تو عاق کر دیا گیا ہے۔ آپ ہی کا مفاد ہے۔۔" طاہر بھڑک کر بولے۔
"طاہر تمہاری سوچ کے رخ یوں بدل گئے ہیں۔ ایک لڑکی کی خاطر۔" اظہر

پورا نہ کر سکے۔
"ایک لڑکی نہیں بھائی جان۔۔ ایک وعدہ۔۔ طاہر اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتا۔ وراثت تو ایک طرف، مجھے اپنی جان بھی دینا پڑے تو گریز نہ کروں گا۔"
کندھا جھٹک کر انہوں نے بھائی کا ہاتھ ہٹایا۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر اپنا صندوق اٹھاتے نکل گئے۔
ایک بار انہوں نے مڑ کر ضرور دیکھا۔ سعدیہ اور اظہر ابھی تک برآمدے کے ستون سے لگے کھڑے تھے۔ سیفو گردن جھکائے ہاتھ مل رہا تھا۔
انہوں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتے الحمراء کے بیرونی پھاٹک سے باہر نکل گئے۔
آج ایفائے عہد اور پیار کی خاطر طاہر واقعی زمانے سے ٹکرا گئے تھے۔ عارضی قیام کے لیے وہ اپنے دوست آصف کے ہاں چلے گئے۔

○

۱۲

رات بھر کی ادھوری اور بے قرار نیند طاہر کی آنکھوں میں سرخی بن کر چھلک رہی تھی ۔ اپنے پیار اور وعدے کی خاطر وہ والدین، بھائی بہن اور ایک پُر تعیش ماحول چھوڑ آئے تھے ۔ صبح اٹھے تو طبیعت بوجھل تھی۔ سینے میں ہلکی ہلکی کسک بھی تھی ۔ والدین سے ٹکراؤ گستاخانہ صورت اختیار کر گیا تھا ۔ اس پر انہیں ندامت بھی ہو رہی تھی ۔

لیکن

اس کے باوجود ان کا عزم راسخ تھا ۔ ناجی جو مقام حاصل کر چکی تھی ، اس سے اسے ہٹانا ان کے بس میں نہیں تھا ۔ افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ والدین نے ان کی خوشی میں خوشی سے شرکت نہ کی ۔ وہ ایسا کرتے تو طاہر کی خوشیوں کا رنگ ہی اور ہوتا ۔

صبح ہی صبح وہ ناجی کی ماں سے ملنے کے لیے تیار ہو گئے ۔ آصف ان کی ہٹ اور ضد سے واقف تھا ۔ اس لیے انہیں سمجھانے بجھانے کی فضول کوشش نہ کی ۔ طاہر ناجی کے ہاں چل دیئے ۔

دن بڑا روشن تھا ۔ آغاز سرما کی یہ صبح بڑی خوش گوار تھی ۔ نم آلود سی دھوپ گل پوش پہاڑیوں کے بلند و پست پر پھیلی ہوئی تھی ۔

طاہر اپنی دھن میں مست ٹیڑھے پہاڑی راستے پر اک فاتح کے سے انداز سے بڑھے جا رہے تھے ۔ پہلے موڑ پر انہوں نے لاشعوری طور پر نیچے گھاٹی میں دیکھا ۔ ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں انہیں سفید آنچل لہراتے دکھائی دیئے ۔ انہیں یہ جاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ وہ ناجی تھی ۔

اوپر جانے کی بجائے وہ گھاٹی میں اترنے لگے ۔ چھوٹے موٹے پتھروں پر پاؤں رکھتے، خاردار جھاڑیوں سے الجھتے، پھولوں کی چھیڑ سے بچتے بچاتے طاہر غیر ہموار زمین پر راستہ بناتے بے اختیار جانِ آرزو کی طرف بڑھے جا رہے تھے ۔

ناجی پتھر پر بیٹھی تھی ۔ اس کے سیاہ لانبے ریشمی بال ہوا کے جھونکوں سے پریشان ہو رہے تھے ۔ دوپٹہ سر سے کھسک کر شانوں پر آگرا تھا ۔ آنچل اڑ رہے تھے ۔ لیکن ناجی بے سدھ بیٹھی تھی ۔

طاہر دبے قدموں سے بڑھے ۔ ناجی کی ان کی جانب پشت تھی ۔

ناجی بے خبر بیٹھی تھی ۔ رات بھر رونے سے آنکھیں متورم تھیں ۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا ۔ پیار کیا ۔ اپنے اور نواب صاحب کے درمیانی خلا کا احساس دلایا لیکن ناجی تو سیاں کے پیار میں اس طرح ڈوب چکی تھی کہ یہ بہلاوے اسے کنارے پر لانے کی بجائے اور گہرائیوں میں لے جا رہے تھے ۔

ساری رات تڑپ تڑپ کر روئی تھی ۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اس گھاٹی میں آ بیٹھی تھی جہاں اس کے سادہ سے ذہن پر عشق و محبت کی گل کاریاں ہوتی تھیں ۔ جہاں اس کی بے بو و باس زندگی میں پھولوں کی مہک رچی تھی ۔

اور

جہاں اس کا ننھا سا دل اک انوکھی کسک اور درد بھری لذت سے آشنا ہوا تھا ۔

وہ اپنے غم میں ڈوبی تھی ۔ طاہر دھیرے دھیرے بڑھے اور چپکے سے اپنے ہاتھ ناجی کی آنکھوں پر رکھ دیئے ۔

"سیاں" ناجی بے اختیار چیخ اٹھی ۔ اس نے جلدی سے طاہر کی کلائیوں کو تھام لیا ۔

"ناجی" طاہر کی انگلیوں میں آنسو جذب ہو گئے ۔ تڑپ کر انہوں نے ہاتھ کھینچے اور گھوم کر اس کے سامنے آ گئے ۔

"سیاں !" ناجی کی جل بھری آنکھوں میں درد بھرا شکوہ تھا ۔ فراق کی گھٹن تھی ۔ عشق کی تپش تھی ۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے طاہر کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی ۔

طاہر نے بازو پھیلا دیئے ۔ ناجی ان بازوؤں کی گرفت میں آ گئی ۔ طاہر کے کندھے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی ۔

طاہر کی زبان گنگ تھی ۔ ہجر کے جانگسل لمحوں کا انہیں اب احساس ہو رہا تھا ۔

چند لمحے ناجی کی سسکیاں طاہر کی خاموشی سے ٹکراتی رہیں ۔

پھر

طاہر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ناجی کی ٹھوڑی کو انگلیوں کے سہارے اونچا کیا ۔

"ناجی!"

"تم آگئے سیاں ۔۔ تم آگئے ۔۔" وہ روتے روتے مسکرا دی ۔۔ یوں جیسے شبنم سے دھلی گلاب کی پتیاں ہوا کے ہلکورے سے لرز گئی ہوں ۔

"میں آگیا ہوں ناجی ۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگیا ہوں ۔"

"سچ ؟"

"ہاں ناجی" طاہر نے اسے پوری شدت سے بازوؤں کی گرفت میں جکڑ لیا ۔

"اب ہمیں کسی دیوار کا ڈر نہیں ناجی ۔۔ ہم دونوں ایک ہو گئے ہیں ۔۔ ایک ۔۔"

ناجی نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر طاہر کے کندھے پر ٹکا دیا ۔ اک رومانی سکون کا احساس اس کے رگ و پے میں مسرت کی لہر بن کر دوڑنے لگا ۔

اس دن کافی دیر تک دونوں اس پتھر پر بیٹھے رہے ۔ طاہر ناجی کی مخروطی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے اپنے مستقبل کے خاکے میں رنگ بھرتے رہے ۔ ناجی ان کی سنگت کے کیف جاودانی سے مسحور سی بیٹھی رہی ۔ طاہر اسے اتنے دنوں کی روداد سناتے رہے ۔ ناجی ان کے عزم سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی ۔

"چلو ناجی" کافی دیر کے بعد طاہر اٹھے ۔ ناجی کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا ۔

"کہاں ؟"

"تمہارے گھر"

"میرے گھر ؟"

"ہاں"

"کیوں ؟" ۔۔ وہ جھجک گئی ۔

"ماں جی کے پاس"

"آپ جائیں گے ۔۔ آپ ماں کے ۔۔ پاس جائیں گے ۔"

"کیوں ؟ ۔۔ عجیب کیوں لگ رہا ہے ۔ اب کونسی بات مانع ہو گی

ہے ۔۔"

ناجی کی لمبی لمبی پلکیں حسین آنکھوں پر جھک کر تھرکنے لگیں ۔

"ماں جی سے مل کر ہی تمہارا ہاتھ طلب کر سکتا ہوں نا ۔"

ناجی شرمائی شرمائی سی کھڑی تھی ۔ حسن کا یہ محجوب انداز کتنا پیارا تھا ۔ طاہر دل تھام کر رہ گئے ۔

"آؤ نا"

"میں نہیں جاتی ۔"

"کیوں ؟"

"تم اکیلے جاؤ ۔۔" ناجی اپنا چہرہ چھپا کر بھاگ گئی ۔

"میرے واپس آنے تک یہیں رہنا ۔۔" طاہر نے آواز دی ۔

ناجی شوخی سے مسکراتی ان سے دور بھاگتی گئی ۔

طاہر چند لمحے اسے دیکھتے رہے، پھر مڑے اور اوپر چڑھنے لگے ۔

وہ سیدھے ناجی کے گھر گئے ۔ ماں مٹی کے چولھے کے پاس بیٹھی ہنڈیا پکا رہی تھی ۔ اس نے طاہر کو دیکھا ۔

بوکھلائی

گھبرائی

اور جلدی جلدی ہانڈی میں چمچ ہلانے لگی ۔

طاہر شفقت آلود تبسم ہونٹوں پر لیے ادب سے سلام کرتے ہوئے بلا جھجک کمرے میں چلے گئے ۔

ماں کو یہ جاننے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ یہی وہ نواب زادہ ہے جس کے لیے اس کی باولی بیٹی جان کی بازی لگا بیٹھی ہے ۔

طاہر کے بے پناہ مردانہ حسن ، وقار آمیز جلال اور شائستہ انداز تخاطب سے وہ بڑی مرعوب ہوئی ۔

کتنا موزوں جوڑ تھا ۔ اس کے دل کے کسی گوشے سے صدا بلند ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے طبقاتی حد بندیوں کا احساس ہوا ۔ اس کے دل کے گوشے سے اٹھنے والی صدا مدھم پڑ گئی ۔

طاہر کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے ۔

ماں اٹھ کر اندر آئی ۔ سر تا پا انہیں دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی ۔

"آپ کے لیے میں اجنبی نہیں ہوں ۔" طاہر نظریں جھکا کر مسکراتے ہوئے بولے "میرا نام طاہر ہے ۔۔ میں نواب فاروق علی خاں کا لڑکا ہوں ۔"

ماں نے نگاہ اٹھا کر پھر انہیں گہری نظروں سے دیکھا ۔

"میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ۔۔ کہ ۔۔ کہ ۔۔" طاہر ہچکچا گئے ۔ سمجھ نہ آئی تھی کہ اپنے آنے کا مدعا ماں پر کیوں کر بیان کریں ۔۔

"رات آپ کے والد صاحب بھی تو آئے تھے ۔۔" ماں طاہر کی ہچکچاہٹ سے ان کا مدعا سمجھتے ہوئے بولی ۔

طاہر نے ماں کے لہجے کی چبھن اچھی طرح محسوس کی ۔

"آپ کو ہمارے حالات معلوم ہو چکے ہیں ۔۔" طاہر جلدی سے بولے ۔۔

"بڑی اچھی طرح سے ۔۔" ماں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی ۔ طاہر سے بھی اس نے بیٹھنے کو کہا لیکن طاہر بیٹھے نہیں ، نادم سے کھڑے تھے ۔

"مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے پیسے کے زور سے آپ کو مرعوب کر کے اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی ۔"

"انہوں نے کوئی انہونی بات نہیں کی ۔" ماں گھمبیر سنجیدہ آواز میں بولی ۔ "بھٹکی ہوئی اولاد کو راہ راست پر لانے کے لیے والدین کو ہر جتن کرنا پڑتا ہے ۔"

"ہوش مند اور جوان اولاد اپنے راستے کا تعین خود کر سکتی ہے ۔ والدین کی کم فہمی ہے جو سیدھے راستے کو بھی الٹا سمجھیں ۔"

ماں نے اک بار پھر گہری نظروں سے طاہر کو دیکھا ۔

"آپ کیا چاہتے ہیں اب ۔۔ ؟"

"وہی جس کی مخالفت میرا پورا خاندان کر رہا ہے ۔"

"اس کے باوجود آپ یہاں آ گئے ۔"

"میں اپنے راستے کا تعین کر چکا ہوں ماں جی ۔۔ اس راہ سے مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہ ہٹا سکے گی ۔"

طاہر کی آواز میں صداقت و استحکام اتنے نمایاں تھے کہ ماں چند لمحوں کے لیے سکتے میں آگئی ۔

"جوانی اندھی ہوتی ہے صاحب زادے ۔۔ اپنی حیثیت کو نہ بھولیئے آپ اتنے بڑے نواب ۔۔"

"میں ایک معمولی آدمی ہوں ماں جی ۔۔" طاہر ماں کے گھٹنے پر جھک گئے ۔۔ "میں نے ناجی کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا ہے ۔۔ والدین ۔۔ گھر بار ۔۔ جاہ و حشم ۔۔ سب کچھ چھوڑ دیا ہے ۔۔ میری ضد کو دیکھ کر والد صاحب نے مجھے حق وراثت سے محروم کر دیا ہے ۔ لیکن مجھے کچھ پروا نہیں ۔ میرے بازوؤں میں اتنی ہمت ہے کہ میں اپنا اور ناجی کی زندگی کا بار آبرو مندانہ طریق سے سہار سکوں ۔"

طاہر چارپائی کے قریب گھٹنا ٹیکے ماں کے زانو پر ہاتھ رکھے اسے اک خوش گوار مستقبل کا یقین دلا رہے تھے ۔

اور

ماں

پوری آنکھیں کھولے طاہر کو دیکھے جا رہی تھی ۔ طاہر کے انکشاف سے اس کا سارا جسم لرز گیا تھا ۔ طاہر کی محبت ان حدود کو چھو لے گی ۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ۔ وہ تو اس پیار کو ایک امیر زادے کے تعیش پسند ذہن کی تفریح کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھی ۔

طاہر نے ساری روداد ماں کو کہہ سنائی ۔ ماں بت بنی ان کی باتیں سنتی رہی ۔

"ماں جی" طاہر نے بے حس و حرکت بیٹھی ماں کے گھٹنوں کو ہلایا ۔ "مجھے مایوس نہ کیجیئے آپ کا انکار مجھے زندگی اپنے ہاتھوں ختم کر لینے پر مجبور کر دے گا ۔ ناجی ! میری زندگی ہے ماں ۔۔ اس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔۔"

طاہر کی آواز فرط جذبات سے رندھ گئی ۔ بے بس ہو کر انہوں نے اپنا سر ماں کے گھٹنے پر رکھ دیا ۔

ماں کے لیے یہ لمحات انتہائی کٹھن تھے ۔ طاہر نے جس اپنائیت اور خلوص سے اپنا سر ماں کے گھٹنے پر رکھا تھا ۔ مروت کا تقاضا تھا کہ ماں اپنا دست شفقت ان کے سر پر پھیرتے ہوئے انہیں زندگی کی سب سے بڑی مسرت کا یقین دلا دے ۔

لیکن حالات کی تلخی کو وہ کیونکر نظر انداز کر دیتی ۔ جذباتی رو میں بہہ کر کیے

ہوئے فیصلے ہمیشہ پشیمانی کا باعث بنتے ہیں ۔

"صاحب زادے ۔۔ جلد بازی کا نتیجہ پشیمانی ہوتا ہے ۔"

"ماں جی !" طاہر نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا ۔

"بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے ابھی سوچ سمجھ سے کام لیا جائے ۔" ماں ان کی نظروں سے نظریں چار نہ کر سکی ۔۔

"والدین اتنے کٹھور کیوں ہو جاتے ہیں ؟" طاہر جھلا سے گئے ۔ "اولاد کی چھوٹی سی چھوٹی خوشی پر جان قربان کرنے والے والدین ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو روندنے میں دریغ نہیں کرتے ۔۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے ۔

ماں بیچارگی سے ہاتھ ملتے ہوئے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہی تھی ۔

"ہم بہت غریب ہیں بیٹا ۔۔" بالآخر وہ کہہ اٹھی ۔ "ناجی کسی لحاظ سے بھی تو اس قابل نہیں ۔۔ کہ ۔۔"

"ماں جی ۔۔ ایسا کہہ کر میرے جذبات کو مجروح نہ کیجیے ۔"

ماں اور طاہر میں کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی ۔

ماں مرعوب تو ہو گئی ۔ لیکن اس اعتراف میں ہچکچاہٹ تھی اپنی کم مائیگی کا احساس ہو تھا ۔

طاہر نے امکان بھر سعی کی ۔ منت کی ۔۔ خوشامد کی ۔۔ اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا ۔ اپنی وفا کے استحکام کی قسم کھائی ۔

ماں سوچ میں پڑ گئی ۔

طاہر اس کے ہونٹوں سے اسی وقت مژدۂ جانفزا سننا چاہتے تھے جس طرح بھی ہو ۔ انہوں نے ناجی کی ماں کو مجبور کیا ۔

اور

ماں مجبور ہو گئی ۔

لیکن

ایک دم ہاں نہ کہہ سکی ۔۔ "مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو بیٹے ۔۔"

طاہر نے ماں کی طرف دیکھا ۔ وہ اپنے ہونٹوں پر پھیلتے تبسم کو چھپانے کی

کوشش کر رہی تھی ۔ اس کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی ۔ اس کے رویے میں لچک بھی تو کافی آگئی تھی ۔

"ماں جی" طاہر خوشی سے جھوم اٹھے ۔ "خوب سوچ لیں لیکن آخر میری بات آپ کو ماننا پڑے گی ۔"

ماں ضبط کے باوجود مسکرا رہی تھی ۔

طاہر مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے ۔ کسی انجانی سی لذت کا احساس ان کے حواس پر چھایا جا رہا تھا ۔

بہکے بہکے قدم اٹھاتے وہ گھاٹی کی طرف جا رہے تھے ۔ جہاں ان کی جانِ تمنا ہمہ انتظار بنی بیٹھی تھی ۔

○

(۱۳)

ماں کئی دن ٹال مٹول کرتی رہی ۔

اور

یہ کئی دن طاہر کے حق میں سودمند ثابت ہوئے ۔ وہ ماں کے بہت قریب آ گئے ۔ اور ان کی فطری ضد اپنا مطالبہ منوانے کے کام آ گئی ۔

ماں نے ان کا دامنِ مراد امید کے پھولوں سے بھر دیا ۔

"ناجی تمہاری ہے بیٹا" ماں نے اپنی زندگی بھر کی متاع ان کے حوالے کر دی ۔

"ماں !" فرطِ جذبات سے طاہر کی آواز گھٹ گئی ۔ ان کی آنکھوں میں اک للک چمک ابھری اور عقیدت سے انہوں نے اپنا سر جھکا دیا ۔

ماں نے شفقت و محبت سے ان کے جھکے ہوئے سر کو بوسہ دے کر انہیں اپنی فرزندی میں قبول کرنے کے وعدے پر مہر لگا دی ۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔

"ناجی میرے اجڑے سہاگ کی نشانی ہے بیٹا ۔ میں نے اس پھول کو جوانی کا خون دے کر سینچا ہے ۔ اللہ کے بعد تمہیں سونپ رہی ہوں ۔ ناجی کے پاس کچھ بھی نہیں ۔ نہ دولت ہے نہ تعلیم نہ پختہ ذہن ۔ ۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر پھیل گئے ۔ دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھ کر اس نے اک گہری سانس لی ۔

طاہر عقیدت سے سر جھکائے کھڑے تھے ۔ اپنی بے پناہ خوشیوں کو دل کی گہرائیوں میں سمونے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ماں کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا ۔

"اک رنگین کھلونا ہے ۔ جسے تم نے دل بہلانے کو چن لیا ۔ اسے سنبھال کر رکھنا ۔ جی بھر گیا تو توڑ پھوڑ نہ دینا ۔"

"ماں جی" طاہر ان جملوں کی تاب نہ لا کر بے تاب ہو گئے ۔ "ناجی میری زندگی ہے ماں ۔"

"میں ماں ہوں بیٹا ۔ ۔ یہ باتیں کہنا تو نہیں چاہئیں ۔ لیکن دل بھول جاتا ہے ۔ ۔ تم نے ناجی کی خاطر گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا ہے ۔"

"اس کے سوا کیا کر سکتا تھا ۔"

"کسی وقت ناجی کو بھی چھوڑ ۔ ۔"

"ماں" طاہر چیخ اٹھا ۔ ۔ "وہ وقت میری زندگی میں نہیں آئیگا ماں ۔ ۔ ناجی سے مجھے میری موت ہی جدا کر سکے گی ۔ دنیا کی اور کوئی طاقت نہیں ۔ ۔"

ماں کا دل سنبھل گیا ۔ وہ مسکرانے لگی ۔

"آئندہ ایسی باتیں نہ کرنے کا وعدہ کیجئے ماں ۔ ۔ آپ میری خوشیوں کے گلے پہ چھری رکھ دیتی ہیں ایسا کہہ کر ۔ ۔"

"اچھا بیٹا ۔ ۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے ۔"

"میں آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں ۔ ۔"

"اللہ تمہیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے ۔"

طاہر خوش ہو گئے ۔

طاہر بہت جلد شادی کر کے اس معاملے کو نپٹانا چاہتے تھے ۔ ماں سے بات کی ۔ وہ خود بھی جلد اس فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی تھی ۔ سارے گاؤں میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں ۔ جتنے منہ اتنی باتیں ۔ کوئی ناجی کی تقدیر پر رشک کر رہا تھا اور کوئی اسے ماں بیٹی کی حماقت سے تعبیر کر رہا تھا ۔

"میں خود بھی جلدی چاہتی ہوں ۔ لوگوں کے منہ تو بند ہو جائیں گے ۔" گاؤں والوں کے لیے یہ انہونی سی بات ہے ۔ ۔ چاہتی ہوں جتنی جلد ہو سکے معاملہ نپٹ جائے ۔"

"میں خود بھی دیر کا حامی نہیں ۔ ۔ صرف چند دن اور چاہئیں مجھے جگہ مل گئی ہے ۔ اسے ٹھیک ٹھاک کروا لوں ۔"

طاہر نے شہر کے اک پرسکون اور پربہار حصے میں چھوٹی سی کوٹھی کرایہ پر لے لی تھی ۔ الحمراء جیسی آراستگی تو میسر نہ آ سکی ۔ ہاں رہنے کے لیے انہوں نے اسے اچھا خاصہ سنوار لیا ۔

ناجی کے لیے اک ایسی عورت کا بندوبست بھی کیا جو اس کی دیکھ بھال کے ... اسے تہذیب جدید سے شناسا بھی کر دے۔ خود ساختہ ماحول کے باضابطہ اصولوں ... روشناس بھی کرا سکے۔ ادھیڑ عمر عورت کافی سیانی تھی۔ اس نے طاہر کو یقین دلایا کہ ... دنوں میں وہ ناجی کو تہذیب و شائستگی کا مجسمہ بنا دے گی۔

آصف کی بیوی کی مدد سے انہوں نے ناجی کے لیے خوبصورت ترین ملبوسات بنوائے۔ نفیس زیور خریدے۔ آرائش کی چیزیں لیں۔

اور

پھر

مقررہ دن وہ اپنے چند دوستوں سمیت ناجی کے ہاں جا پہنچے۔ نکاح کی تقریب خاموشی اور سادگی سے انجام پائی۔

ناجی دلہن بنی۔

گورے گورے ہاتھوں میں مہندی رچی۔ مانگ میں سندور بھرا۔ ... شبنمی آنکھوں میں کاجل کی ڈوریاں کھینچی گئیں۔ خوشبوؤں سے اس کا مجسمے کی طرح تراشا ہوا جسم مہک اٹھا۔

سرخ جھلملاتے جوڑے نے ناجی کے حسن کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کا ... شباب پھوٹ پھوٹ گیا۔ طلائی زیورات اس نے زندگی میں پہلی بار پہنے تھے۔ ناجی کا معصوم حسن اس حسن و زیبائش سے دمک اٹھا۔

ماں کی دعاؤں کے زیرِ سایہ۔۔ سہیلیوں کے وداعی گیتوں اور رخصتی آنسوؤں کی چھاؤں میں ناجی کومل ٹہنی کی طرح شرم سے دوہری ہوتی طاہر کے ساتھ ان کے ... گھر میں آ گئی۔

(۱۴)

طاہر و ناجی ایک دوسرے کی محبت میں سرشار زندگی کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ اُن کے مہکتے ہوئے شب و روز معصوم محبت کے استحکام کے ضامن تھے۔

جُوں جُوں دن گزر رہے تھے۔ اُن کی محبت کے والہانہ پن میں شدت آ رہی تھی۔ ناجی اگر پہلے پھول تھی تو اب بھرپور بہار تھی۔ کتنا نکھر گیا تھا اس کا حسن۔ کتنی جاذبیت سمو گئی تھی اس کی کافر جوانی میں۔ طاہر اسے پا کر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتے تھے۔ اپنی تقدیر پر خود ہی رشک آ جاتا تھا۔

کتنے مسرور تھے دونوں۔۔۔ خُوشیاں ہی خوشیاں بکھری تھیں ہر سُو۔

اور اُس دن یہ خوشیاں دوچند ہو گئیں جس دن انہیں احساس ہوا کہ ان کے چمنستانِ محبت میں اک گُل کھلنے والا ہے۔

دن مہینوں میں بدلتے گئے۔ طاہر کو گھر چھوڑے تقریباً دس ماہ ہو گئے۔

محبوب بیٹے کی جدائی کا غم باپ کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ خود ساختہ حد بندیاں طاہر کا تو کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ہاں فاروق کا سینہ چھلنی ضرور کر گئیں۔

دل کا روگ بیماری کی صورت میں پھوٹ پڑا۔

پہلے تو تکلیف معمولی سمجھی گئی لیکن جلد ہی بیماری نے تشویش ناک موڑ لیا۔

اور

مہینے کے اندر اندر نواب فاروق کی جان کے لالے پڑ گئے۔ چوٹی کے ڈاکٹر بیماری کے بھوت سے نبرد آزما تھے۔ لیکن

"مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" والا معاملہ تھا۔

دوائیں بے کار تھیں۔

دعائیں کارگر نہ ہوتی تھیں۔

ہر لمحہ حیات کا ناطہ موت سے جوڑ رہا تھا۔

الحمراء کی ساری رونقیں معدوم ہو گئی تھیں۔ طاہر کی شادی سے گھر کی فضا پر سکوت سا چھا گیا تھا۔ اب تو ہر دل سہما ہوا تھا۔ ہر آنے والا لمحہ کسی ناخوش گوار واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کا ضامن ہو سکتا تھا۔

شیرازۂ حیات آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا۔ فاروق کی حالت دن بدن نازک ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر ان پر غشی طاری رہتی۔

اور

عالم بے ہوشی میں ان کے کانپتے لبوں پر ایک ہی نام تھرکتا

"طاہر"

لیکن ہوش میں انہوں نے کبھی طاہر کا نام نہیں لیا تھا۔ اہل نظر دیکھ رہے تھے کہ حیات کی ڈوریاں آہستہ آہستہ منقطع ہو رہی ہیں۔ تجربہ بتا رہا تھا کہ بجھتے چراغ کی آخری لو تھرک رہی ہے۔ وضع داری کا دامن اب تک فاروق تھامے ہوئے تھے لیکن محبوب بیٹے سے ملنے کے لیے پگھل پگھل کر ختم ہوا چاہتا تھا۔

خاندان کے چیدہ اور جہاں دیدہ بزرگوں نے مشورہ دیا کہ طاہر کو اس حالت میں بلانا انتہائی ضروری ہے۔ کون جانے کب تنفس کے تار ٹوٹ جائیں۔ اور فاروق کی روح اک مستقل خلش لے کر کب تک بھٹکتی رہے۔

سیفو طاہر کو واپس لانے میں پیش پیش تھا۔ باپ کے دل میں اٹھتے طوفان کو اس نے بار ہا دیکھا تھا۔ محبت کی تڑپ سے باپ کو اکثر تڑپتے بھی دیکھا تھا۔ تجویز حسن بانو کے سامنے پیش کی گئی۔ وہ اپنی آن کی خاطر بیٹے کو منہ لگانے کے لیے تیار نہ تھیں۔

"یہ وقت رنجشوں کو بھلا دینے کا ہے حسن بانو" آخر ان کے بڑے بھائی بولے۔

"کب لے جانے کا ارادہ ہے..."

"بھائی فاروق کی حالت سے کچھ تو اندازہ کرو..."

"یہ حالت اسی کی وجہ سے تو ہوئی ہے..."

"فاروق بھائی عالم بے ہوشی میں طاہر کو پکارتے ہیں۔ کتنی دردناک ہوتی ہے ان کی پکار۔"

"ان کا دل طاہر میاں سے ملنے کو تڑپ رہا ہے بیگم صاحبہ۔" سیفو ہاتھ ملتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

"ان کی خواہش پوری ہونی چاہیئے... مبادا..." کوئی اور بزرگ بولے۔

سب نے حسن بانو کو مجبور کیا۔ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے طاہر کو بلانے کی حامی بھر لی۔

"سیفو تم ہی جاؤ... اور طاہر کو لے آؤ۔"

"ہاں سیفو... صرف طاہر کو... وہ ڈائن ساتھ نہیں آئیگی۔ سمجھے..." بیگم صاحبہ نے اک قید لگا دی۔

"بیگم صاحبہ..."

"مجھے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ آنا ہے تو طاہر اکیلے آئیں۔ ورنہ نہ آئیں۔ میں اس چڑیل کا وجود اس گھر میں برداشت نہ کر سکوں گی۔"

سیفو چپ ہو گیا۔

طاہر کو باپ کی بیماری کی خبریں آصف اور دوسرے لوگوں سے مل رہی تھیں۔ جوں جوں بیماری تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی' طاہر کی بے قراریوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ابا کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن وہاں جانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ آصف سے انہیں اپنے گھر والوں کے خیالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ ان کی حالت اس پرندے کی سی تھی جس سے قوتِ پرواز چھین لی گئی ہو۔

صرف خود جانا ہوتا تو بات اور تھی ساتھ ناجی کو بھی لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس بارے میں آصف نے مطلع کر دیا تھا کہ اگر اس لڑکی کے قدم الحمراء کی زمین سے چھو گئے تو قیامتِ صغریٰ بپا ہو جائے گی۔ اس کا وجود تو کیا وہ لوگ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

شام وہ آصف کے ہاں سے آئے تو بڑے پژمردہ تھے۔ ایک تو ابا کی بیماری خطرناک موڑ پر تھی۔ دوسرا ناجی کے متعلق گھر والوں نے آصف کے سامنے پر راز پر اگلا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

آخر طاہر نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کر لیا کہ وہ اگر الحمراء گئے تو ناہی کو ساتھ لے جائیں گے۔ شاید موقع کی نزاکت والدین کی ہٹ کو پگھلا دے اور ناہی کو اس کا اہم مقام مل جائے۔

اسی شام سیفو انہیں لینے آگیا۔ نواب صاحب کی بیماری کی داستان سنانے کے بعد ملتجی انداز میں بولا۔ "بیٹے یہ وقت کسی ہٹ یا ضد کا نہیں۔ نواب صاحب کی آنکھیں شاید آپ کو دیکھنے ہی کے لیے کھلی ہیں --- اللہ جانے کیا ہونے والا ہے ---"

طاہر پہلے سے پریشان تھے۔ سیفو کی آمد حالات کی نزاکت کا کھلا ثبوت تھی۔ طاہر کا دل تڑپ اٹھا۔ باپ کے حضور میں پہنچ کر وہ اپنی گستاخی کی معافی رو رو کر مانگنا چاہتے تھے۔

"جلدی کرو بیٹے ---!"

"ٹھہریئے۔ میں ناہی کو تیار ہونے کے لیے کہہ دوں" طاہر اٹھے۔

"لیکن --- اس --- وقت اگر ---"

"کیا ہے سیفو بابا؟"

"اگر آپ جلدی سے اکیلے ہی چلے چلیں تو اچھا ہو گا۔"

"ناہی میرے ساتھ جائے گی" فیصلہ کن انداز سے سیفو مرعوب ہو گیا۔

طاہر اندر آئے۔ ناہی پلنگ پر لیٹی تھی۔

طاہر نے اسے حالات سے مطلع کیا۔

محل والوں سے خوف زدہ ہونے کے باوجود وہ طاہر کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔ دل میں اب بھی یہی وسوسہ دھڑکا بنا ہوا تھا کہ کہیں طاہر وہیں نہ روک لیے جائیں۔ وہ تو طاہر کے جنم جنم کی ساتھی تھی۔ پھر بھلا ان کے بغیر رہنے کا تصور کہاں۔

طاہر ناہی کو لیے باہر آگئے۔ سیفو کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ناہی جیسے اسے جیسے کوئی آفاقی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ کتنی عقیدت تھی سیفو کے دل میں۔ کاش بڑی بیگم اپنے رویے میں تبدیلی کر لیں۔ وہ سوچتے ہوئے کالی موٹر کی طرف بڑھا۔ پٹ کھول کر ---

ناہی اور طاہر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے --- سیفو نے سیٹ سنبھال کر گاڑی کا رخ الحمراء کی طرف پھیر دیا۔

۱۵

محل اور محل کی زندگی کا تصور بھی ناجی کے فہم و ادراک سے بعید تھا ۔ شہر ... پُر بہار گوشے میں اس کی اپنی اقامت گاہ پُر تعیش لوازمات سے پُر تھی ۔ لیکن ... سے تو اسے کسی طور پر مناسبت نہ تھی ۔ ناجی محل میں داخل ہوئی تو اس کے ہوش ... حواس اُڑے جا رہے تھے ۔ اس محل کا جاہ و جلال دیکھ کر بوکھلا گئی تھی ۔

اور

کچھ اہلِ خانہ کا خیال معصوم دل و دماغ پر خوف بن کر چھایا ہوا تھا ۔ یہاں ... کی اسے کوئی لگن نہ تھی ۔

سہمی سہمی خوف زدہ سی وہ طاہر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی ۔ طاہر اس وقت اپنے آپ سے بہت دور جا چکے تھے ۔ ان کے جذبات میں تلاطم تھا ۔ تقریباً ... بعد وہ اپنے گہوارۂ عشرت میں داخل ہونے تھے ۔

نامساعد حالات نے کتنی تلخیاں بکھیر دی تھیں ۔ اس گھر میں داخل ہونے ... بعد انہیں شاید احساس ہو رہا تھا ۔

الحمراء میں داخل ہوتے ہی منجمد دل میں حرارت پیدا ہو گئی تھی ۔ والدہ ... بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب کی محبت اس حرارت سے پگھلنے لگی تھی ۔

بمشکل دل کو سنبھالے ، ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ، آنکھوں میں ... چھلکنے والی نمی کو روکتے وہ اپنے اباّ کی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے ۔

ناجی کے خوف زدہ سہمے ہوئے چہرے کو انہوں نے دیکھا ہی نہیں ۔

خواب گاہ کے بیرونی طویل و عریض کمرے میں روشنیوں کا سیلاب اُمڈ ... رات نہیں کسی روزِ روشن کا گمان ہوتا تھا ۔ دیوار گیر مجسمے روشنی اگل رہے ... اور فانوس جگمگا رہے تھے اور محرابی دروں میں گھاس کی چمکتی ہوئی ...

رہی تھی ۔ ناجی حیرت زدہ سی رنگ و نور کے سیلابوں میں غوطہ زن تھی ۔

طاہر سر جُھکائے قدم اٹھا رہے تھے ۔ ان کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا ۔ باپ کو زندگی کے مرغزاروں میں لہکتا چھوڑ کر گئے تھے لیکن ۔۔۔!

آج

آج وہ محبوب ہستی موت کی دہلیز پر کھڑی ان کی راہ دیکھ رہی تھی ۔ سارے تنفر تے ، ساری رنجشیں بھول کر طاہر ان کی متوقع جدائی کے جانگسل خیال سے سہمے جا رہے تھے ۔ دل و دماغ پاش پاش ہونے جا رہے تھے ۔

برآمدے کے زینے پر قدم رکھتے ہی ان کی نظریں خواب گاہ کے دروازے پر

پڑیں

پردہ ہٹا

اور

اتفاقاً حسن بانو باہر نکل آئیں ۔

ماں نے بیٹے

اور

بیٹے نے ماں کو دیکھا ۔

مامتا تڑپی ۔ طاہر کے سینے میں جیسے ایک دم سینکڑوں تیر پیوست ہو گئے ۔ درد کی شدت سے تڑپ اُٹھے ۔ بیقراری سے آگے بڑھے

اور

"امی حضور" کہہ کر ماں سے لپٹ گئے ۔

ضبط و صبر کے بند ٹوٹ گئے ۔ ملن کا موقعہ ہی کچھ ایسا دردانگیز تھا ، کوئی بھی تو اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا ۔ ماں رو رہی تھیں اور طاہر ان کے سینے سے لگے معصوم بچوں کی طرح ہچکیاں بھر رہے تھے ۔

ناجی یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر اور سہم گئی ۔ اس کی خوب صورت خواب آلود آنکھیں بے قابو ہو کر برس رہی تھیں ۔

پیچھے کھڑا سیفو بھی اپنے آنسو نہ روک سکا ۔

رونے کی آواز سنتے ہی خواب گاہ کے دروازے سے آگے پیچھے حواس باختہ سی

کئی صورتیں نکل آئیں۔
انجم ۔۔۔ حسن آراء ۔۔۔ سعدیہ ۔۔۔ فخر ۔۔۔ اظہر اور کئی رشتہ دار باہر آ گئے۔

بہنیں طاہر کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئیں ۔ جدائی کا صدمہ انہوں نے بھی تو جھیلا تھا۔

ملن کی گھڑیوں کو آنسوؤں کا خراج ملنے لگا۔

چند ساعتوں میں تقریباً سارا خاندان برآمدے میں جمع ہو گیا ۔ طاہر سر جھکائے کھڑے تھے ۔ بار بار اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھ رہے تھے ۔ عورتوں اور مردوں نے انہیں یوں گھیرے میں لے رکھا تھا جیسے بڑی تگ و دو کے بعد کسی مفرور کو نرغے میں لے لیا گیا ہو۔

ناجی مرمریں ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی ۔ اس کے اور طاہر کے درمیان کئی افراد آ گئے تھے ۔ ناجی کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ۔ یوں بھی کئی خشمگیں نگاہیں اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں ۔ اپنے چاروں طرف اس نے ہمیشہ نرم و ملائم نظریں پائی تھیں ۔ ان سینہ چیرنے والی نگاہوں سے وہ کانپ گئی ۔

برآمدے میں اچھا خاصا شور ہو رہا تھا ۔ جتنے منہ اتنی باتیں ۔ یہ شور مریض کے لیے ضرر رساں تھا۔

وقار احمد جلدی سے باہر آئے اور سب کو خاموشی سے کسی دوسری طرف چلے جانے کی تلقین کی۔

قدم اُٹھنے لگے۔

طاہر کھڑے رہے۔

"چلو بیٹے!" کسی نے طاہر کا کندھا پکڑ کر کہا۔

"میں ابا حضور کو دیکھوں گا۔۔۔" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔

"تم اکیلے آ جاؤ طاہر میاں" وقار احمد نے انہیں بلایا ۔ "آپ لوگ سب یہاں سے چلے جائیں ۔۔۔ بہت شور ہو رہا ہے ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہلکا سا شور بھی کتنا مضر ہے ان کے لیے۔"

طاہر خواب گاہ میں داخل ہوئے ۔ باپ کی مسہری کی طرف نگاہ گئی۔

اُف ۔۔۔ وہ سرتاپا کانپ گئے ۔ نواب فاروق کی جگہ ان کا بے رنگ و نور ڈھانچہ پڑا تھا۔ آنکھیں البتہ اب تک روشن تھیں ۔ جیسے شمعِ انتظار جل رہی ہو ۔۔۔ اس وقت ہوش میں تھے ۔

طاہر بے تاب ہو گئے ۔

وقار نے مضبوطی سے ان کا بازو تھام لیا۔ طاہر ان کے بازو کی گرفت میں طائرِ مجروح کی طرح پھڑپھڑائے ۔

"صبر ۔۔۔ حوصلہ ۔۔۔ جذباتی کمزوری کا مظاہرہ ان کے لیے مضر ہو گا" وقار احمد نے سرگوشی کی ۔

لیکن

ایسی صورتِ حال بھلا ان مشوروں کی تابع کیسے ہو سکتی تھی ۔ طاہر کمان سے تیر کی طرح نکلے ۔۔۔ فاروق نے بھی انہیں دیکھا ۔

"ابا حضور! ۔۔۔" پٹی کے قریب قالین پر دو زانو ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا سر باپ کے کندھے پر رکھ دیا ۔

پھر

آنسوؤں کا ایسا طوفان پھوٹا جسے روک لینا کسی کے بس میں نہ تھا ۔

"طا ۔۔۔ ہر ۔۔۔ طا ۔۔۔ ہر" خشک سسکتے لبوں پر یہ نام کئی دفعہ تحرک گیا ۔

"ابا حضور ۔۔۔" طاہر نے ان کی طرف دیکھا۔ "میرے ۔۔۔ ابا ۔۔۔!"

بے قرار ہو کر انہوں نے اپنا سر باپ کی چھاتی پر ٹکا دیا ۔۔۔

"طا ۔۔۔ ہر ۔۔۔ میر ۔۔۔ ے ۔۔۔ بچے ۔" نحیف و ناتواں سی آواز ابھری ۔۔۔ "تم ۔۔۔ یہ ۔۔۔ تم ۔۔۔ ہی ۔۔۔ ہو نا ۔۔۔ تم ۔۔۔ آ گئے ۔۔۔؟"

مجھے معاف کر دیجئے ابا ۔۔۔ حضور ۔۔۔ اپنے گناہ گار بیٹے کو معاف کر دیجئے ۔۔۔ "طاہر سسک رہے تھے ۔

فاروق کا زرد اور کانپتا ہوا ہاتھ اُٹھا ۔۔۔ اور انہوں نے طاہر کو پوری قوت سے اپنے سینے سے بھینچ لیا ۔

"کیا ۔۔۔ حضور ۔۔۔"

"تمہیں ۔۔۔ نے ۔۔۔ تمہیں معاف کیا میرے بچے ۔۔۔ دعا کرو ۔۔۔ خدا مجھے ۔۔۔ بھی معاف ۔۔۔ کرے ۔۔۔ ہم ۔۔۔ ہم ۔۔۔ نے تمہیں ۔۔۔ ناحق سزا دی ۔۔۔ تمہی ۔۔۔ نا ۔۔۔ حق ۔۔۔"

طاہر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے ۔ وقار احمد کی آنکھیں پرنم تھیں ۔۔۔

نواب فاروق شاید اس اچانک خوشی کا بار نہ سہار سکے ۔ ان کی سانس غیر ہموار ہو گئی ۔ اور ہڈیوں کے اس کھڑکھڑاتے ڈھانچے پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی ۔

وقار احمد جلدی سے ان پر جھک گئے ۔ گھنٹی بجائی ۔ ساتھ والے کمرے سے ڈاکٹر لپک کر آئے ۔ سب مسہری کے گرد ہو کر آلات کی مدد سے مریض کے سینے کا زیر و بم اور خون کا دباؤ دیکھنے لگے ۔

○

(۱۶)

طاہر کے خواب گاہ میں جاتے ہی ناجی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ زندگی کے لق و دق صحرا میں اکیلی رہ گئی ہو ۔ اس کے اور طاہر کے درمیان طوفان گرد و باد اٹھ رہے ہوں ۔ اور وہ کسی حقیر تنکے کی طرح بے رحم ہواؤں کے تھپیڑوں سے ادھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہو ۔

خاندان کے بے شمار افراد طاہر کے جانے کے بعد اس کے گرد جمع ہو گئے تھے ۔ تیز کام اور قہر برساتی نظریں اُسے گھور رہی تھیں ۔ اس کے بے پناہ ملکوتی حسن سے معترف دل بھی نفرت و حقارت کے اظہار کے لیے چبھتی ہوئی نظروں کے تیر برسا رہے تھے ۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے یہ غیر مانوس چہرے دیکھ رہی تھی ۔ اس کا رنگ سفید لباس ہی کی طرح تھا ۔ بھیگے بھیگے ہونٹوں کی مضطرب سلوٹیں کانپ رہی تھیں ۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا ۔ ستون سے متعلق سنگ سرخ کا جالی دار کٹہرا نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ گر چکی ہوتی ۔

"سیفو" اچانک جیسے رعد و باراں کی کڑک سنائی دی ۔ بڑی بیگم صاحبہ کسی خونخوار شیرنی کی طرح غراتی ہوئی اس کی جانب بڑھیں ۔

"جی حضور" سیفو جلدی سے ناجی کے سامنے آگیا ۔

"یہ غالباً طاہر کی بیوی ہے" خشمگیں نگاہوں سے انہوں نے ناجی کو سر تا پا گھورا ۔

"جی ۔۔ جی حضور ۔۔۔" سیفو ان کے تیوروں سے سہم کر بولا ۔

"یہ کیوں آئی یہاں ۔۔۔؟"

سیفو کے جواب دینے سے پہلے عقبی دروازے سے ڈاکٹر وحید نکل آئے ۔

"براہ مہربانی آپ سب لوگ کسی دوسری طرف چلے جائیے ۔ شور ہو رہا

ہے ۔۔۔ مریض کے لیے خطرناک ہے ۔۔۔ نواب صاحب کو آرام کی ضرورت ہے ۔۔۔"

"واقعی بہت شور ہو رہا ہے ۔۔۔ ادھر چلئے ۔۔۔ یہاں تو اونچی آواز میں بولنا تو در کنار ، پاؤں کی آہٹ بھی ممنوع ہے ۔۔۔" ہجوم میں سے کسی نے کہا ۔

"چلئے ۔۔۔ ادھر کو چلئے ۔۔۔" کئی آوازیں آئیں ۔

انجم آرا نے بڑھ کر ماں کو کندھے سے ہلایا ۔۔۔ "امی جان ابا حضور کی حالت آپ دیکھ چکی ہیں ۔۔۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلئے ۔۔۔ آپ سب بھی یہاں سے اُدھر ہی جائیے ۔۔۔ اتنا ہنگامہ ۔۔۔ توبہ ۔۔۔"

حسن بانو نے بھوکی شیرنی کی طرح ناجی کو دیکھا ۔ اور پھر غصے میں پیچ و تاب کھاتی پلٹیں ۔۔۔ وہ بڑبڑا رہی تھیں ۔ ان کے قدم اٹھاتے ہی مجمع منتشر ہو گیا ۔ بہت سے لوگ ان کے پیچھے پیچھے دبے قدم اٹھاتے وہاں سے چل دیئے ۔

چند لمحوں بعد ناجی کے پاس صرف سیفو اور انجم آرا کھڑے تھے ۔ طاہر جو کچھ کر چکے تھے ، سزاوار صرف ناجی تو نہ تھی ۔ انجم آرا مومن دل رکھتی تھیں ۔ ناجی کی پیاری پیاری صورت اور بھولا بھالا انداز دل کی ساری کدورتیں ختم کر دینے کو کافی تھا ۔ گھر والوں کے رویے سے انہیں سخت کوفت ہوئی تھی ۔ اور پھر ناجی کی حالت دیکھ کر تو ان کا دل جذبۂ ترحم سے معمور ہو گیا تھا ۔

وہ آگے بڑھیں اور کمال شفقت سے ناجی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرائیں ۔ ناجی کیلئے یہ التفات غیر متوقع تھا ۔ "کیا نام ہے تمہارا" انجم نے پیار سے پوچھا ۔

"بتاؤ نا بیٹی اپنا نام" سیفو انجم آراء کے رویے سے بیحد خوش ہوا ۔۔۔ "آپ طاہر میاں کی بڑی بہن ہیں ۔۔۔"

"میں تمہاری بڑی نند ہوں ۔ تم میری پیاری سی بھابی ہو ۔" انجم نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے سے لگا لیا ۔

"بتاؤ نا اپنا نام" انجم نے اسے اپنے سے جدا کرتے ہوئے پھر پوچھا ۔

ناجی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھی ۔ ٹکر ٹکر انجم کو دیکھنے کے سوا وہ منہ سے ایک لفظ نہ بولی ۔

"گھبرا گئی ہے شاید ۔۔۔" سیفو نے ناجی کی ذہنی و جسمانی حالت کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا ۔ "انجم بیٹی انہیں کہیں آرام سے بٹھا دو ۔۔۔"

واقعی ۔۔۔ کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی ۔ آؤ میرے ساتھ ۔۔۔!"

انجم نے ناجی کا صندلی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا ۔

"آؤ"

اور ناجی ان کے ساتھ یوں چل دی جیسے انجم آرا کوئی ایسی عامل ہوں جسے اپنے عمل کے زور سے معمول کو ہر راہ پر چلانا آتا ہو ۔

انجم آرا اسے دانستہ زنانہ حصے کی طرف لے کر نہیں گئیں ۔ ماں کا مزاج مشتعل تھا ۔ ناجی کو دیکھ کر اور بھڑک اٹھنے کا احتمال تھا ۔ وہ ناجی کو طاہر کی خواب گاہ میں لے گئیں ۔

"یہ تمہارے میاں کا کمرہ ہے" انجم آرا نے پیار سے ناجی کا ہاتھ دبایا ۔ ناجی ششدر سی خواب گاہ میں داخل ہوئی ۔ اس کے حواس اب تک ٹھکانے پہ نہ آئے تھے ۔

"بیٹھ جاؤ ۔" انجم آرا نے اسے مسہری پر بٹھا دیا ۔۔۔ ناجی آنکھیں پھاڑے کبھی انجم اور کبھی کمرے کو دیکھ رہی تھی ۔

"لیٹ جاؤ" انجم اس کے پاس بیٹھ گئی ۔۔۔ "یہ طاہر کی خواب گاہ ہے ۔ امی حضور نے طاہر کے جانے کے بعد بھی اس کی اسی طرح دیکھ بھال کروائی ، جس طرح ان کے جانے سے پہلے کرواتی تھیں ۔۔۔"

انجم اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا دل بہلانا چاہتی تھیں ۔ لیکن ناجی گُم سُم بیٹھی تھی ۔ تیز و تند نظروں سے زخمی ذہن اب تک خوف زدہ تھا ۔

"تمہیں باتیں نہیں آتیں؟" انجم نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر پوچھا ۔ ناجی غیر ارادی طور پر مسکرا دی ۔۔۔ وہ انجم سے کچھ کچھ مانوس ہو گئی تھی ۔۔۔

"نام بھی نہیں بتایا ۔۔۔ کیا نام ہے؟"

"ناجی ۔۔۔"

"شکر ہے تمہاری آواز تو سُنی ۔۔۔ ماشاءاللہ شکل و صورت کی طرح آواز بھی پیاری ہے ۔"

ناجی پھر مسکرائی ۔ ہونٹوں کے مضمحل سلوٹوں پر اُبھرتا ہوا تبسم ناجی کے ملکوتی حسن میں اضافے کا باعث تھا ۔ انجم کا جی چاہا اسے اپنے سینے سے لگا لیں ۔

"لیٹ جاؤ ۔ تھک گئی ہو گی تم تو ۔۔۔" انجم نے زبردستی ناجی کو مسہری پر لٹا دیا ۔

انجم اس سے باتیں کرنے لگیں ۔ اور ناجی سہمے سہمے لہجے میں ان کی باتوں کا جواب دینے لگی ۔ انجم آرا کے مشفقانہ رویے کے باوجود اس کے حواس پر خوف چھایا ہوا تھا ۔

"تم آرام سے لیٹی رہو ۔۔۔ اب میں جاتی ہوں ۔۔۔"

"آپ ۔۔۔ آپ ۔۔۔"

"گھبراؤ نہیں ۔۔۔ یہاں تم پورے اطمینان سے لیٹی رہو ۔۔۔ میں ابا حضور کو دیکھ آؤں ۔۔۔"

"سیاں کہاں ہیں؟"

"سیاں؟" انجم آرا نے حیران ہو کر ناجی کی طرف دیکھا ۔ ناجی کچھ شرماسی گئی ۔ اور انجم کو یہ جاننے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ اس کا استفسار طاہر کے متعلق تھا ۔

"طاہر کو پوچھ رہی ہو؟" مسکراتے ہوئے انجم بولیں ۔

ناجی نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

انجم اس کی سادگی پر مسکرا دیں ۔

"اچھا تم آرام کرو ۔۔۔ میں تمہارے سیاں کو یہیں بھیج دوں گی ۔ وہ شاید ابھی ابا حضور کے کمرے ہی میں ہیں ۔۔۔ ابا حضور کی حالت تشویش ناک ہے ۔ ناجی دعا کرو ۔ اللہ اُن پر اپنا رحم کرے ۔۔۔"

ادھر انجم آرا ناجی سے باتوں میں مشغول تھیں ۔

اور

اُدھر

زنان خانے میں جیسے کوئی قیامت ٹوٹ پڑی تھی ۔ نواب صاحب کی تشویش ناک حالت کو جیسے سبھی نے فراموش کر دیا تھا ۔ ناجی موضوع تھی اور ہر فرد اس کے خلاف زہر اگل رہا تھا ۔ حسن بانو کا غصہ آخری حدود کو چھو رہا تھا ۔ سعدیہ آتش زنی کر رہی تھیں ۔۔۔ اور فوزیہ کے آنسو جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے ۔ رشتہ دار حسن بانو کا اعتماد جیتنے اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر

ناجی کے خلاف باتیں کر رہے تھے ۔

"چڑیل کہیں کی ۔ ہمارے سینے پر مونگ دلنے یہاں آ پہنچی ہے ۔"

"دیدہ دلیری دیکھو ۔ یہاں آنے کی جرأت کیسے کر لی ۔"

"آنکھ میں ڈر خوف تو تھا ہی نہیں ۔"

"ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی ۔ اتنا نہ ہو سکا بیگم صاحبہ کے پاؤں پڑ کر معافی ہی مانگ لیتی ۔"

"گنوارن ۔۔۔ دیہاتن ۔۔۔ یہ آداب کون سکھاتا اسے ۔"

حسن بانو کے گرداگرد خاندان کی عورتوں کا جمگھٹا تھا ۔ حسن بانو کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بجائے زیادہ ہمدرد بننے کی کوشش میں انہیں اور اشتعال دلا رہی تھیں ۔

سعدیہ اور فوزیہ تو اسے ذلیل کرنے کے لیے خود ذلالت پر اُتر آئی تھیں ۔ "نام سن سن کر ہی دل جل رہا تھا ۔ اب ڈائن گھر میں بھی آ پہنچی ہے ۔" سعدیہ ٹسوے بہانے لگی ۔ فوزیہ پہلے ہی آنسو بہا رہی تھی ۔ دونوں بھانجیوں کو روتے دیکھ کر حسن بانو کے ابال کا جوش بڑھتا جا رہا تھا ۔

"میرے تو سینے میں لوہے کی میخ کی طرح چبھی جا رہی ہے ۔ ڈاکٹر نہ آجاتا تو اُسی وقت گھسیٹ کر پھاٹک سے باہر کر آتی ۔۔۔"

"ایک دفعہ اُس نے یہاں قدم جما لیے تو پھر کوئی حیلہ کارگر نہ ہو گا" سعدیہ شاکی لہجے میں بولی ۔

"قدم جمانے کون دے گا ۔۔۔ میرا نام حسن بانو نہ ہوا ۔۔۔ جو یہاں ٹکنے دیا ۔۔۔"

"لیکن طاہر ۔۔۔؟"

"طاہر نے کوئی چوں چراں کی تو اس گھر کے دروازے اس پر پھر بند ہو سکتے ہیں ۔"

"امی حضور ۔۔۔" انجم آرا چند لمحے پہلے یہاں آئی تھیں ۔ کمرے کی مسموم فضا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں ۔

حسن بانو نے گردن گھما کر پیچھے کھڑی انجم آرا کو دیکھا ۔

انجم ماں کے دائیں ہاتھ بیٹھتے ہوئے بولیں ۔۔۔ "امی حضور ۔۔۔ آپ طاہر

کو پھر ہاتھوں سے گنوانا چاہتی ہیں۔ شکر کا مقام ہے خدا نے جیتے جی بیٹے کو ملادیا۔۔۔ طاہر آگئے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ اور خوشی کونسی ہو سکتی ہے۔۔۔"

"لیکن ساتھ وہ چڑیل بھی آگئی ہے نا؟"

"وہ طاہر کی بیوی ہے امی حضور۔۔۔ جہاں طاہر ہوں گے وہیں وہ بھی ہوگی۔"

"تو گویا آپ پر بھی جادو چل گیا ہے ساحرہ کا؟" بڑے ہی طنزیہ انداز میں سعدیہ نے کہا۔

"جادو کیا؟" انجم نے سعدیہ کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بڑی طرف داری کر رہی ہیں نا اس چڑیل کی۔" سعدیہ غصے سے برس پڑی۔

"ہماری پے در پے بے عزتی ہو رہی ہے۔۔۔ لڑکی کو گھر بیٹھے داغ لگ گیا۔ رسوائی جو ہوئی الگ۔ اس پر طرہ یہ کہ اب یہ آوارہ لڑکی ہمارے ساتھ رہے گی۔۔۔ ہماری برابری کرے گی۔۔۔"

"سعدیہ بیٹی" حسن بانو اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "اس گھر میں تمہاری برابری تو کیا۔۔۔ نوکرانی بن کر بھی نہ رہنے دوں گی اسے۔۔۔ غضب خدا کا۔ ٹکے کی چھوکری نے سارے خاندان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس کی یہ مجال کہ ہماری برابری کرے۔ آنکھیں نہ پھوڑ دوں گی اس کی۔" انجم آرا نے بیچ بچاؤ کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن ایک اکیلی کہاں تک مقابلہ کرتیں۔ سعدیہ کی پشت پناہی حسن بانو کر رہی تھیں اور حسن بانو کے اشارۂ ابرو پر پورا خاندان ناچ سکتا تھا۔

○

(۱۷)

ناجی مسہری پر لیٹی آج کے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ انجم آرا کا تلطف نہ ملتا تو اس غیر مانوس ماحول میں اس کا دم آج ہی گھٹ جاتا۔

انجم آرا اس کا کھانا بھی اس کمرے میں لے آئی تھیں۔ اس کے خلاف جو زہر اُگلا جا رہا تھا وہ اسے اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھیں۔

کھانا کھلا کر اسے سو جانے کی تلقین کرتے ہوئے انجم چلی گئی تھیں۔ لیکن ناجی سو نہ سکی۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ دماغ تپ رہا تھا۔ آج شام سے رات کے مختصر وقفے میں کتنے غیر متوقع واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے۔ یہ غیر متوقع واقعے اس کی طبع پر بُری طرح اثرانداز ہوئے تھے۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ یہاں سے دور۔۔۔ بہت دور چلے جانا چاہتی تھی۔ میاں کی سنگت میں۔۔۔ اپنی پُرسکون دنیا میں۔۔۔ جہاں محبت کی نرم و نازک رُوپہلی کرنوں کے جال تھے۔ جہاں عشق کی حرارت سے ہر غیر مانوس جذبہ پگھل جاتا تھا۔

اور

جہاں پیار کی نغمگی سے موسیقی وجد میں ڈھل جاتی تھی۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات بھیگ گئی تھی۔

لیکن

میاں ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ کب آئیں گے؟ انتظار کا اک اک لمحہ سوہانِ روح تھا۔

وہ کافی دیر تک کمرے میں بے قرار روح کی طرح پھرتی رہی۔ میاں نہ آئے۔

وہ تھک گئی۔

ہار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی کمر کچے پھوڑے کی طرح دُکھ رہی تھی، بستر پر پڑی وہ بے ہنگم طریق سے آج کے واقعات کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ سوچتی رہی۔

اور

اس کا اُلجھا ہوا ذہن اور تھکا ہوا جسم ماؤف سا ہوتا گیا۔

پھر

جانے کب نیند کی پریوں نے لوریاں دے دے کر اسے تھپکا اور وہ گہری نیند سو گئی۔

اور

کافی رات گئے جب نواب فاروق علی خاں کی حالت کچھ سنبھلی اور دواؤں کے اثر سے وہ کچھ اونگھ گئے۔ تو طاہر کو ناجی کا خیال آیا۔

وہ خواب گاہ سے باہر نکلے۔ اتفاق ہی تھا جو برآمدے میں انجم آرا مل گئیں۔

"ناجی کہاں ہے ---؟" طاہر نے ان سے پوچھا۔

"تمہاری خواب گاہ میں" انجم دھیرے سے مسکرا دیں۔

"وہاں؟"

"ہاں ہاں --- میں ہی انہیں لے گئی تھی۔ آرام سے لٹا دیا تھا۔ کچھ غیر مانوس سا ماحول تھا نا ان کے لیے --- گھبرا گئی تھیں۔"

طاہر کچھ بے قرار سے نظر آئے --- انجم بھانپ گئیں۔ "فکر نہ کرو۔ اب سو رہی ہیں۔ میں ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔"

طاہر کو کچھ تسلی ہوئی۔

دونوں بہن بھائی کچھ دیر اپنی کہتے اور دوسرے کی سنتے رہے۔

"آپ حضور نے ناجی کو دیکھا ---؟" باتوں ہی باتوں میں طاہر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" انجم جلدی سے بولیں۔

"کیا خیال ہے ان کا؟"

"خیال کیسا ہو"

"سنا ہے وہ اس کے خلاف اب بھی ---؟"

"یہ سب وقتی باتیں ہیں طاہر --- سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو ان کی بھانجی تم سے منسوب تھی۔ اس نسبت کے ٹوٹنے کا انہیں کتنا غم ہے --- اس غم کا اظہار اگر وہ غصہ کی صورت میں کریں بھی تو خاموشی ہی میں مصلحت ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ناجی کی پیاری پیاری معصوم صورت دیکھ کر ان کے سینے کا پتھر خود بخود پگھل جائے گا۔"

طاہر عقیدت سے سر جھکائے بہن کی باتیں سُن رہے تھے۔

"ناجی کی صورت اور سیرت بہت جلد اسے اس کا اصل مقام دلا دے گی طاہر ---"

طاہر نے فخر سے سر اُٹھایا۔ اور مسکرا کر بہن کی طرف دیکھا --- "آپ کو پسند آئی ناجی ---؟"

"تمہارے انتخاب کی داد نہیں دی جا سکتی" انجم آرا نے پیار کی شدت سے مغلوب ہو کر طاہر کے سر پر بوسہ دیا۔ یہ ان کے انتخاب کی کھلی داد تھی۔

طاہر کے دل میں گھر والوں کی طرف سے جو وسوسہ تھا وہ انجم آرا کی باتوں اور رویے سے کسی حد تک ٹوٹ گیا۔

بہن سے الگ ہو کر وہ اپنی خواب گاہ میں گئے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی کئی مانوس یادیں ذہن میں اُمنڈ آئیں۔ اتنی مدت بعد اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ کچھ عجیب سی کی کیفیات سے دوچار تھے۔

چند لمحے وہ ساکت سے کھڑے رہے۔

ناجی نے ہلکی سی ہائے کے ساتھ کروٹ بدلی۔ طاہر کا انہماک ٹوٹ گیا۔ جلدی سے مسہری کی طرف بڑھے۔ ناجی پر جھک گئے۔

ناجی کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔ نرم نرم تکیوں پر ناجی کے سیاہ بال بکھرے تھے۔ طاہر نے جھک کر ان بالوں کو چھوا۔ لیکن ناجی کو جگایا نہیں۔ وہ جانتے تھے اسے پُر سکون نیند کی کتنی ضرورت ہے۔

وہ اسے بغور دیکھتے رہے۔ اک گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ان کے رگ و پے میں مسرت کی ہلکی ہلکی لہریں دوڑا رہا تھا۔ آج ناجی کو اس کا اصلی مقام مل گیا تھا۔ وہ الحمرا میں بہو بن کر آگئی تھی۔

طاہر گھر میں سلگنے والی فضا سے قطعاً بے خبر تھے۔ انجم آرا کی باتوں سے وہ پہلے ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ اس پر ناجی کو اس طرح اپنی خواب گاہ میں محوِ خواب پایا تو انہوں نے طمانیت کا گہرا سانس لیا۔ اس سانس کی گہرائی میں جذباتِ تشکر بھی تھے۔ ناجی کو اپنانے کی حقیقی خوشی کا احساس انہیں آج پوری طرح ہوا۔

چند لمحے رُکنے کے بعد طاہر پھر نواب فاروق کی خواب گاہ میں لوٹ آئے۔ ان کی آمد نے نواب فاروق کی زندگی کی گرتی دیوار کو عارضی سہارا دے دیا تھا۔ اس رات وہ کافی دیر تک ہوش و حواس میں رہے تھے۔ طاہر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا تھا۔ مدتوں درشن کی پیاسی آنکھیں ہمیشہ کو بند ہو جانے سے پہلے پوری پوری طرح سیراب ہونا چاہتی تھیں۔

طاہر کے دل میں جدائی کی کسک تھی۔ وہ ملن کے ان لمحوں سے آسودگی پا رہے تھے۔ باپ کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ چند لمحوں کے لیے انہیں غنودگی آئی تو ناجی کو جا کر دیکھ لیا۔ پھر وہیں آ کر بیٹھ گئے۔ باپ کی شفقتوں کے سمٹے دامن آج پوری وسعتیں لیے لہرا رہے تھے۔ طاہر ان دامنوں تلے قلبی سکون پا رہے تھے۔

سحر ہو چکی تھی۔ طاہر پلنگ کی پٹی پر سر رکھے قالین پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے تھے۔ دوسرے دونوں بھائی اور رشتہ کے کئی بزرگ کمرے میں باری باری آتے جاتے رہے تھے۔ لیکن طاہر نے باپ کی پٹی نہیں چھوڑی تھی۔

بالوں میں انگلیوں کا لمس محسوس کرتے ہی طاہر کی آنکھ کھل گئی --- جلدی سے سر اٹھایا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

وہ جاگ رہے تھے اور ان کی بے نور سی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ طاہر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے۔ کمرے میں ہلکی ہلکی برقی روشنی دریچوں سے آنے والی صبح کے ملگجے اجالوں میں الجھ رہی تھی۔ پھیکی پھیکی بے نور سی روشنی میں نواب فاروق کا چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے موت کے ہاتھ نے اس بے رنگ خاکے میں زردی کی آخری تہہ بھی بھر دی ہو۔

گھبرا کر طاہر نے باپ کی طرف دیکھا۔

"ابا --- حضور ---" وہ دھیرے سے پکارے۔

[illegible] فاروق ہوش میں تھے۔ تکیے پر رکھے سر کو طاہر کی طرف موڑ کر انہوں نے [illegible] کر دیکھا۔ ان کی کانپتی انگلیوں کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی۔ طاہر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور پریشان نظروں سے باپ کو دیکھنے لگے۔

"طا --- ہر" آواز میں انتہائی نقاہت تھی۔

"جی"

"تمہاری --- دلہن کہاں --- ہے --- انہیں --- ساتھ نہیں --- لائے --- تھے ---؟"

"ہم نے اپنی --- بہو کو --- نہیں --- دیکھا --- وہ --- وہ --- کہاں --- ہے ---؟"

رکتے رکتے الفاظ میں نواب فاروق نے ناجی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"وہ میرے ساتھ ہی آئی تھیں ابا حضور ---" طاہر نے باپ کے ہاتھ پر سر رکھ دیا۔

"انہیں یہاں --- لاؤ --- ہم --- دیکھنا --- چاہتے --- ہیں ---"

"ابا حضور ---" طاہر کا دل شدتِ جذبات سے بھر آیا۔ "آپ --- آپ نے ہمیں معاف کر دیا --- ابا --- حضور ---"

فرطِ عقیدت سے طاہر نے باپ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

"انہیں --- یہاں لاؤ ---!"

"اس وقت ---"

"ہاں --- پھر --- شاید --- ان آنکھوں --- میں --- روشنی --- نہ --- رہے ---"

"ابا حضور ---" طاہر بے قرار ہو گئے۔ ان کی آواز رقت سے رندھ گئی۔

"جاؤ طاہر --- انہیں لے آؤ --- جاؤ --- بیٹے۔" باپ کے لہجے کی مایوسی سے طاہر تڑپ گئے۔ ڈوبتے دل سے باپ کو دیکھا۔ انہوں نے پھر ناجی کو دیکھنے کا اصرار کیا۔ طاہر غمگین و افسردہ وہاں سے اٹھے اور اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیئے۔

ناجی صبح سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ طاہر خواب گاہ میں داخل ہوئے تو وہ مشرقی دریچہ کھولے کھڑی تھی۔

"تمہیں ابا حضور بلا رہے ہیں ناجی۔ ان کی حالت اچھی نہیں۔ آؤ --- ان کے پاس چلو ---"

"نہیں ۔۔۔ میں چلوں۔" ناجی نے انہیں بے یقینی سے دیکھا ۔۔۔ اور بادلِ نخواستہ ان کے ساتھ چل دی ۔ نواب صاحب سے بچپن ہی سے خوف کھاتی چلی آئی تھی ۔ اس پر جو حالات رونما ہو چکے تھے ، وہ ڈرنے میں حق بجانب ہی تو تھی ۔

دونوں خواب گاہ میں اکٹھے داخل ہوئے ۔ نواب فاروق کی منتظر نظریں ادھر ہی کو تھیں ۔ طاہر نے ناجی کا ہاتھ تھام کر اسے مسہری کے قریب کر دیا ۔

ناجی اپنے آپ کو سمیٹتی شرماتی ۔۔۔ اور خائف زدہ سی مسہری کے قریب جھک گئی ۔ بڑے مؤدبانہ لیکن سہمے ہوئے طریق سے سلام کیا ۔

ناتواں سا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھا اور ناجی کے سر پر ٹک گیا ۔ اور زندگی کی روشنی سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی آنکھیں دھندلا گئیں ۔

عین اسی وقت حسن بانو خواب گاہ میں آئیں ۔ یہ منظر دیکھ کر آگ بگولا ہو گئیں ۔ طاہر کی پشت تھی ۔ انہوں نے ماں کے چہرے پر عتاب کے طوفان نہیں دیکھے تھے ۔ وہ گرجنے کو تھیں کہ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے وقار بھائی نے بڑھ کر انہیں بازو سے تھام لیا ۔ اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں لے گئے ۔

وقار نے انہیں حالات کی نزاکت اور موقع کی غنیمت سمجھا کر چپ رہنے کی تلقین کی اور سمجھا بجھا کر خواب گاہ میں لائے ۔

ناجی مسہری کی پٹی پر جھکی بیٹھی تھی ۔ فاروق دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے ۔۔۔ "دعا کرو ۔۔۔ بیٹی ۔۔۔ خدا ہمیں ۔۔۔ ہمارے کئے کی ۔۔۔ معاف کر دے ۔۔۔ ہم نے ۔۔۔ تم ۔۔۔ سے ۔۔۔ بڑی ۔۔۔ زیادتی ۔۔۔ کی ۔۔۔"

نواب فاروق اعترافِ جرم کرکے اپنی روح کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے ۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بہت بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو ۔۔۔ اور اب عاقبت کا راستہ وہ بغیر کسی تردد کے طے کر سکتے ہوں ۔

ناجی رو رہی تھی ۔ طاہر کی آنکھیں بھی نمناک تھیں ۔

حسن بانو کا دل اس منظر سے بھی نہیں پسیجا ۔ انتقامی جذبات طوفان اٹھا رہے تھے ۔ دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں لیکن ظاہر داری کو چپ ہونا پڑا ۔ کوئی بھی نواب فاروق کی زندگی کا جھلملاتا چراغ اک لمحے میں گل کر سکتا تھا ۔

حسن بانو مسہری کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی ۔ شوہر کو دیکھ کر غمزدہ بھی تو تھیں ۔ عمر بھر کی رفاقت کتنی سرعت سے ٹوٹتی جا رہی تھی ۔

"حسن بانو ۔۔۔" انتہائی نحیف آواز میں نواب فاروق بولے ۔ حسن بانو آگے جھک گئیں ۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔

"بہو ۔۔۔ دیکھی ۔۔۔ تم نے ۔۔۔" اسی لہجے میں فاروق بولے ۔

طوفان سینے کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا لیکن مصلحت اس طوفان کو روک لینے میں تھی ۔

دل پر پتھر رکھ کر بولیں "آپ کو پسند ہوئی تو ہمیں پسند ہی پسند ہے ۔" نواب فاروق کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آئے ۔ اور ماں کے منہ سے یہ کلمے سن کر طاہر کے سینے میں مسرت و انبساط کی لہریں سے اٹھنے لگیں ۔ سارے وسوسے مٹ گئے ۔ جذباتِ عقیدت سے ان کا دل لبریز ہو گیا ۔ جی چاہا ماں کے قدموں پر سر رکھ دیں ۔

پھر

نواب فاروق نے وصیت کی کہ طاہر کے حصہ کے سارے زیورات ناجی کو دے دیے جائیں ۔ ان کا حقِ وراثت بھی بحال کر دیا اور انہیں پورے پورے حقوق کے ساتھ الحمرا میں رہنے کی اجازت بھی دے دی ۔

۱۸

لیکن

نواب فاروق کا التفات ناجی کے حق میں سودمند ہونے کے بجائے زہرناک ثابت ہوا ۔ اس کی راہوں میں کانٹے ہی کانٹے بکھر گئے ۔

لبِ مرگ نواب فاروق نے عاقبت سنوارنے کے لیے بیٹے کی خطا بخشی کر دی تھی ۔ بہو کو دامانِ شفقت تلے لے لیا تھا لیکن گھر کے دوسرے افراد کے دل سے کینہ نہ نکل سکا ۔ نواب فاروق کی دی ہوئی مراعات نے اس کینے کو خوفناک بنادیا۔ ناجی گھر والوں کے سینے پر لوٹتا ہوا سانپ تھی ۔

حسن بانو تو اسے ایک نظر نہ دیکھ سکتی تھیں ۔ سعدیہ اسے کچا چبا جانے کی فکر میں تھی ۔ اور فوزیہ ۔۔۔ فوزیہ کا بس چلتا تو اس کا گلا گھونٹ دینے میں بھی دریغ نہ کرتی ۔ اس کی کنواری محبت کے سینے میں چبھا ہوا نشتر تھی ناجی ۔ طاہر اس کے منسوب تھے اور دل ہی دل میں فوزیہ نے اس منسوب کو محبوب مان لیا تھا ۔

ناجی کو ذلیل کرنے ، گنوار اور بد تمیز ثابت کر کے رُسوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ۔ اس کا تمسخر اڑایا گیا ۔ دیہاتن اس کا جیسے نام ہی منتخب ہو گیا تھا۔

یہ سب شر پسند طبیعتوں اور للّٰہی بُغض کی پیداوار تھی ۔ ورنہ ناجی تو طاہر کی قربت میں بہت کچھ سیکھ چکی تھی ۔ شادی کے بعد ایک بدلے ہوئے طرزِ زندگی سے اس تہذیب یافتہ اور مہذب طبقے کے بہت کچھ عادات و اطوار اپنا چکی تھی لیکن اہلِ خانہ کو اسے ذلیل کرنا مقصود تھا ۔

ناجی کی حالت اس پرندے کی سی تھی جسے کھلی فضاؤں سے زبردستی پکڑ کر سونے چاندی کی سلاخوں والے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ سوال صرف قید کا ہوتا تو اور بات تھی ۔ یہاں تو ذہنی کچوکے جان لیوا تھے ۔ غریب ناجی کے تو وہم و گمان میں

نواب فاروق کی حالت بگڑتی جارہی تھی ۔ طاہر باپ کی پٹی سے لگے تھے ۔ دن بھر میں بمشکل چند گھڑیاں ناجی کو دیکھنے کے لیے آتے ۔ وہ گھر والوں کی طرف سے مطمئن تھے ۔ ناجی سے کچھ پوچھتے بھی نہیں تھے ۔ ناجی بھی کچھ کہہ نہ سکتی ۔

تین دن تین صدیاں تھیں جو گزرنے ہی میں نہ آتی تھیں ۔ ناجی نے یہ تین دن سیاں سے الگ گزارے تھے ۔ وہ دن اور رات کے تنہا لمحوں میں کئی بار رو چکی تھی ۔ اپنے آزاد ماحول میں لوٹ جانے کے لیے زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی تھی ۔

لیکن

ایسا ممکن کہاں تھا ۔ نواب فاروق کی حالت خطرناک حدود کو چھو رہی تھی ۔ اور ان کی حالت سے سب سے زیادہ متاثر طاہر ہی تھے ۔ دس ماہ کی طویل جدائی اس تاثر کی سب سے بڑی وجہ تھی ۔

اس رات نواب صاحب کی حالت مخدوش تھی ۔ الحمرا میں عیادت کو آنے والوں کا ہجوم تھا ۔ زنانہ مردانہ دونوں حصے مہمانوں سے بھرے تھے ۔ یہ وقت ناجی کے لیے سخت ترین تھا۔ طاہر سارا دن اس کے پاس نہ آسکے تھے ۔ سعدیہ اور فوزیہ کی انتقامی حس نے تو جیسے آج انتقام کی قسم کھالی تھی ۔ سب لوگوں کے سامنے کس کس طرح اُسے ذلیل کیا گیا۔ ناجی غریب خون کے آنسو روتی رہی ۔ انجم آرا باپ کی حالت سے متفکر تھیں ۔ ناجی کو صرف انہی کا التفات نصیب تھا۔ آج دن بھر ان کی صورت بھی دیکھ نہ سکی ۔

حسن بانو تو اپنی پریشانی ناجی پر قہر برسا کر مٹا رہی تھیں ۔ ایک رشتہ دار عورت کے استفسار پر کہ "یہ طاہر کی بیوی ہے" حسن بانو یوں شعلہ فشاں ہوئیں۔

"یہی ہے ڈائن جس نے میرا بیٹا ہتھیا کر میری کوکھ پر وار کیا ۔ اور اب چڑیل میرے سہاگ کا چراغ بھی گُل کرنے کو آپہنچی ہے ۔۔۔"

بڑی بھابی درمیان میں نہ آجاتیں تو بعید نہ تھا حسن بانو ناجی کو چٹیا گھسیٹ کر گھر سے باہر کر دیتیں ۔

رات گہری ہو چکی تھی ۔ ناجی طاہر کی خواب گاہ کے بیرونی برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی ۔ روتے ہوئے اس کا بُرا حال تھا۔ دن بھر طنز و تمسخر کے

تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کیا تھا۔ سہمی سہمی سی کھڑی اپنی زندگی کے اس غیر متوقع حادثے پر غور کر رہی تھی ۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر چند یوم اور اُسے اسی ماحول میں گھٹ گھٹ کر جینا پڑا تو یقیناً اس کی کشتیِ حیات موت کے بھنوروں میں کھو جائے گی ۔

اُسے کھڑے چند لمحے گزرے تھے کہ قدموں کی آہٹ ہوئی ۔ "سیاں" ناجی کی روح ہمک گئی ۔

لیکن پلٹ کر دیکھا تو دم بخود رہ گئی ۔ سیاں نہیں فوزیہ اِدھر آ رہی تھی ۔ ناجی گھبرا گئی ۔ فوزیہ سے سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی ۔ سارا وجود سمیٹ کر اس نے ستون کی اوٹ میں ہو جانا چاہا ۔

لیکن

فوزیہ آگے بڑھنے کی بجائے وہیں رُک گئی ۔

"طاہر کا انتظار ہو رہا تھا؟" وہ اس کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولی ۔

ناجی کا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔ چہرہ خوف و ہراس سے سپید ہو گیا۔

فوزیہ نے سرتاپا اُسے یُوں دیکھا جیسے قصاب بچھڑا ذبح کرنے سے پہلے اُسے دیکھتا پرکھتا ہے ۔

ناجی کے سارے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی ۔ آج فوزیہ کی آنکھوں میں ایک طوفان تھا۔ اک آگ تھی ۔ اک کھولن تھی ۔ ناجی سرتاپا کانپ گئی ۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھتی رہی ۔

"خوبصورت بلا" فوزیہ غرائی ۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں ۔ دل کے خوردہ جذبے تملا اٹھے ۔ اس کا جی چاہا ناجی کا گلا گھونٹ دے ۔ اس حسین ساحرہ کو اپنے انتقام کی آگ میں جھلس دے ۔

ناجی کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی ۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن خوف سے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی ۔

"جادوگرنی" فوزیہ دو قدم آگے بڑھی ۔ تُو نے میرا محبوب چھینا ہے ۔ میرا منسوب چھینا ہے ۔ میں دن رات انگاروں پر لوٹ رہی ہوں ۔۔۔ اور تُو ۔۔۔ زندگی کی ساری مسرتیں سمیٹ رہی ہے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ لیکن یاد رکھ میرا نام فوزیہ ہے ۔ میں سائے کی طرح تجھ سے چمٹی رہوں گی ۔۔۔ میں تیری مسرتوں کو خون

چوس لوں گی ۔ تیری خوشیوں کو ہڑپ کر جاؤں گی ۔۔۔"

"سیاں" ناجی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس پر غشی کا سا عالم تھا ۔

"طاہر میرا ہے ۔۔۔ وہ میرا رہے گا۔ میں اس کی راہ سے تجھے ہٹا کر رہوں گی ۔۔۔ اسے اپنا کر رہوں گی ۔۔۔ صرف چند دنوں میں ۔۔۔ تُو دیکھے گی ۔ طاہر میرا ہو گا ۔۔۔"

"سیاں ۔۔۔" ناجی کے منہ سے چیخ نما پکار نکلی اور سناٹے میں ڈوب گئی ۔ وہ لڑکھڑائی ۔۔۔ لہرائی ۔۔۔ بیچارگی میں سہارے کے لیے فوزیہ ہی کو پکڑنا چاہا ۔

لیکن

وہ اس کا ہاتھ اس بری طرح جھٹک کر چل دی کہ ناجی توازن قائم نہ رکھ سکی ۔ چکرا کر مرمریں زینے پر گری اور لڑھکتی ہوئی سیڑھیوں سے بجری والی سڑک پر آ رہی ۔

انسانیت دم بخود تھی ۔ انتقام اور خود غرضی نے اخلاقی قدروں کا گلا گھونٹ دیا۔

فوزیہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کی ۔ ناجی بے ہوش ہو گئی ۔

قدرت کو شاید ناجی کی زندگی مقصود تھی ۔ اتفاق ہی سے انجم آرا اُدھر سے گزریں ۔ کسی کو یوں سڑک پر پڑے دیکھ کر وہ پہلے ڈر گئیں ۔ لیکن جب برقی روشنی میں قریب سے دیکھا تو ناجی کو یوں پڑے دیکھ کر بے حد گھبرا گئیں ۔

"ناجی" اس پر جھک کر بیتابی سے پکارا ۔ لیکن ہلانے جُلانے پر انہیں اس کی بے ہوشی کا علم ہوا ۔ پریشان ہو کر اس پر جھک گئیں ۔ کند حا ہلا کر اسے ہوش و حواس میں لانا چاہا ۔ لیکن وہ تو گہری غنودگی میں ڈوبی تھی ۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور رنگت خوفناک طور پر زرد ہو گئی تھی ۔

بھاگ کر وہ گئیں اور دو تین کنیزوں کو ساتھ لے آئیں ۔ ناجی کو مل کر سب خواب گاہ میں لے گئیں ۔

ڈاکٹر جنید نواب فاروق کے کمرے میں تھے ۔ انجم نے جلدی سے انہیں بلا بھیجا ۔ ناجی کے بے ہوشی کی خبر طاہر کے حواس پر بجلی کی طرح گری ۔ ڈاکٹر جنید سے پہلے ہی وہ تیر کی سی تیزی سے بھاگے ۔۔۔ خواب گاہ میں گھبرائے ہوئے داخل ہوتے

اور لپک کر ناجی پر جھک گئے ۔

"کیا ہوا؟" وہ سراسیمگی کے عالم میں انجم سے پوچھنے لگے ۔

"اللہ جانے ۔۔۔ میں ادھر سے گزری تو زمین پر بے ہوش پڑے پایا۔" انجم بھی حواس باختہ سی تھیں ۔

"شاید زینے سے پاؤں پھسل گیا ہے" ایک کنیز ناجی کے پاؤں سہلاتے ہوئے بولی ۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" دوسری نے تائید کی۔

"ہو سکتا ہے ۔۔۔" انجم نے کہا ۔

طاہر کی بیتابی و بے قراری دیدنی کے قابل تھی ۔ کبھی اس کے کندھے ہلاتے ۔ کبھی جھک کر پکارتے ۔ کبھی چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر مایوسی سے آوازیں دیتے ۔

"گھبراؤ نہیں طاہر ۔۔۔!" انجم آرا ان کی تڑپ سے متاثر تھیں ۔

ڈاکٹر جنید آگیا ۔ مختلف آلات کی مدد سے اس نے ناجی کا معائنہ کیا ۔ اسے ہوش میں لانے کی سعی کرتا رہا ۔

رات گئے ناجی کو ہوش آیا۔ لیکن ہوش میں آتے ہی وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگی ۔

ڈاکٹر جنید نے لیڈی ڈاکٹر کو بلانے کی رائے دی ۔ کچھ ہی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر نرس لے کے آگئیں ۔

اور

وہ رات

وہ رات کسی قیامت سے کم نہ تھی ۔ ایک طرف فاروق کی زندگی کا چراغ شدید ہوا کے آخری تھپیڑے کا منتظر تھا ۔ دوسری طرف ناجی دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی ۔ دونوں مرغِ بسمل تھے ۔ کبھی باپ کی پٹی پہ جھکے بیٹھے ۔ کبھی ناجی کے لیے برآمدے میں دیوانہ وار ٹہل رہے ہوتے ۔ گھر والوں کو ناجی سے کیا واسطہ تھا ۔ اور کچھ موقع ہی ایسا تھا ۔ سب فاروق کی خواب گاہ کے ارد گرد پروانہ وار منڈلا رہے تھے ۔ ایک انجم تھی جو کبھی باپ کی حالت دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں ۔ کبھی ناجی کی ۔۔۔ اور کشتۂ غم طاہر کو دلاسا بھی [illegible]

دے رہی تھیں ۔

طوفانی رات کا سلسلہ ابد سے ملا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اک اک لمحہ ٹھنک ٹھنک کر گزر رہا تھا۔ سحر ہونے ہی میں نہ آ رہی تھی ۔ فاروق موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے ۔ موت حیات کا رنگ چوس رہی تھی ۔ فاروق کا خاکہ لمحہ بہ لمحہ بے رنگ ہوا جا رہا تھا ۔

پچھلے پہر لیڈی ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کر دیا۔ ناجی کو فوری طور پر ہسپتال پہنچانے کی ضرورت تھی ۔ ڈاکٹر کی رائے پر اسی وقت عمل کیا گیا۔ انجم اور طاہر دو ایک کنیزوں کو ساتھ لے کر ناجی کو ہسپتال لے آئے ۔

بقیہ رات اضطراب میں گزری ۔ طاہر و انجم کو کچھ دیر بعد ہی واپس گھر لوٹنا پڑا ۔ نواب کی حالت کے بارے میں انہیں فون کیا گیا تھا۔

صبح بیدار ہوئی ۔ الحمرا کے لیے یہ اک خونی صبح تھی ۔ شب بیدار سرخ آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں ۔ ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششیں مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گئیں ۔ نواب فاروق عالمِ نزع میں تھے ۔ ڈاکٹروں نے سب آلات ہٹا لیے ۔ عزیزوں کو قریب آنے کی اجازت دے دی ۔

ہسپتال میں ناجی کی حالت خطرے میں تھی ۔ وہ زندگی کی بازی لگا کر اک نئے وجود کی تخلیق کر رہی تھی ۔ آپریشن کے بغیر بچے کی ولادت ممکن نہ تھی ۔ طاہر پھر ہسپتال پہنچے ۔ ان کی اجازت سے ڈاکٹروں نے آپریشن کیا۔

طاہر کی حالت قابلِ رحم تھی ۔ آپریشن کے دوران انہیں گھر جانا پڑا ۔ جان ناجی میں اٹکی تھی ۔ گھنٹہ بھر بعد پھر واپس آئے ۔

ناجی پیٹ کے آپریشن کے بعد ایک پیاری سی بچی کو جنم دے کر بے ہوش پڑی تھی ۔

نرس نے برآمدے ہی میں طاہر کو بچی کی ولادت کی خبر سنائی ۔ طاہر بے تحاشہ ناجی کے کمرے کی طرف بڑھے ۔

وہ ابھی تک بے ہوش تھی ۔ سفید سفید نرم بستر میں زرد زرد ناجی کے چہرے پر تقدس کی ایسی جھلک تھی کہ طاہر کا سر عقیدت و احترام سے جھک گیا۔ وہ بڑھے اور ناجی کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ۔

"تم نے جان پر کھیل کر میری خواہش کا احترام کیا۔ تم قابلِ تعظیم ہو۔" ناجی کی حالت خطرے سے باہر تھی ۔ ڈاکٹر نے آکر انہیں تسکین و تسلی دی ۔

طاہر نے بچی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ۔

دوسرے کمرے سے نرس سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی پیاری سی بچی کو لے کر آ گئی ۔ طاہر نے ایک نظر اس پر ڈالی ۔ پیار و محبت کے کچھ نا فہم سے جذبے ان کے دل میں مچل اُٹھے ۔

"عالیہ" انہوں نے پیار کی شدتوں سے پکارا ۔

لیکن اپنے چمنستانِ محبت کے اس شگوفے کی مہک سونگھنے سے پہلے ہی دوسری نرس گھبرائی ہوئی اندر آئی ۔

"الحمرا سے فون ۔۔۔ آیا ہے کہ ۔۔۔" وہ کپکپاتی آواز میں بولی ۔ طاہر بوکھلائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے ۔

اور

جب وہ فاروق کی خواب گاہ میں پہنچے تو وہ ابدی نیند سو جانے کو تھے ۔ بچی کی ولادت کی خبر یہاں بھی پہنچ چکی تھی ۔

پہلا لفظ جو اس سے منسوب کیا گیا وہ "منحوس" تھا ۔

موت و زیست کی کشمکش نے آخری مرحلہ طے کر لیا ۔ زندگی نے ہتھیار ڈال دیئے اور موت نے اپنی حکمرانی کے سیاہ جھنڈے گاڑ دیئے ۔

اک کہرام بچ گیا ۔

اک قیامت ٹوٹ پڑی ۔

آہ و فغاں نے الحمرا کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے ۔

زندگی کی شکست پہ آنسو بہانے کے سوا چارہ ہی کیا ہوتا ہے ۔

(۱۹)

سکون ناجی کی تقدیر سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا تھا۔ بچی کی ولادت سے کمزوری بے حد ہو گئی تھی ۔ باپ کی وفات سے طاہر کئی جنجالوں میں پھنسے تھے ۔ ناجی ہسپتال سے واپس گھر آگئی تھی ۔ لیکن طاہر کو اطمینان کا ایک لمحہ بھی اس کی قربت میں نصیب نہ ہو سکا ۔ تعزیت کرنے والوں سے پیچھا چھوٹتا تو جاگیر کے تنازعے ، جائیداد کے بکھیڑے اور کاروبار کے جھنجھٹ گھیر لیتے ۔ انہی جنجالوں میں اُلجھ کر رہ گئے ۔ اکثر ہفتہ ہفتہ بھر گھر سے باہر رہنا پڑتا ۔ دوڑ دھوپ میں انہیں ناجی کے پاس رہنے کی فرصت ہی میسر نہ آسکی ۔

ناجی گیلی لکڑیوں کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی ۔ طائرِ آزاد کو صرف قفس ہی میں ڈال دیا ہوتا تو بات بھی تھی ۔ یہاں تو قید کے ساتھ ساتھ نشتروں کی چبھن بھی تھی ۔ اک اک لمحہ بھرپور اذیت تھی ۔

فوزیہ کسی بد روح کی طرح اس کی زندگی کا تعاقب کیے جا رہی تھی ۔ وہ جب بھی ناجی کے سامنے آتی ، سر تا پا کانپ جاتی ۔ اُسے یہی محسوس ہوتا جیسے فوزیہ عورت نہیں ڈائن ہے جس کے خونی جبڑوں میں لمبے لمبے نوکیلے دانت ہر وقت اس کی حیات کو چبا جانے کے لیے تیار رہتے ہیں ۔

"چڑیل ۔۔۔ تجھے میں اپنی راہ سے ہٹا کر دم لوں گی" دانت پیستے ہوئے فوزیہ کئی بار یہ جملہ اس سے کہہ چکی تھی ۔

اور

ہر بار ناجی کے خوف و ہراس میں اس جملے سے کپکپاتا ہوا اضافہ ہوا تھا ۔

گھر کے دوسرے افراد بھی تو فوزیہ سے کم نہ تھے ۔ طاہر جتنے دن گھر سے باہر رہتے ان لوگوں کو اپنی زخم ... [illegible]

لطف و کرم میسر تھی لیکن ان دنوں وہ بھی اس قدر مصروف تھیں کہ ناجی کی سلگتی آگ کی آنچ محسوس ہی نہ کر سکیں ۔

بات صرف ناجی کی ذات تک ہی محدود ہوتی تو شاید وہ دل پر پتھر رکھ کر سہہ سکتی ۔ لیکن اب تو اس کے ساتھ ساتھ ننھی منی جان کو بھی موردِ عتاب بنایا جارہا تھا ۔ صاعقہ ۔۔۔ چند دنوں کی معصوم بچی سب کی نظروں میں منحوس قرار دی جاچکی تھی ۔ نواب فاروق کی موت کی ذمہ دار جیسے وہی تھی ۔

قدرت بھی بسا اوقات عجب ستم ظریف ہوتی ہے ۔ نحوست کو صاعقہ کی ذات کا جزو سمجھا ہی جارہا تھا ۔ شومئ تقدیر جس دن ناجی اپنی بچی سمیت ہسپتال سے گھر آئی ۔ اسی دن آیا کی نااہلی سے چھوٹی پھوپھی حسن آرا کا غسل خانے میں پاؤں پھسلا اور کولہے کی ہڈی اُتر گئی ۔

اس واقعے سے صاعقہ کی نحوست پر جیسے مہرِ تصدیق لگ گئی ۔

محض اتفاق ہی تھا ۔ لیکن انہی دنوں روئی کے گوداموں میں کسی ملازم کی شرارت یا تساہل سے آگ لگ جانے سے کم و بیش تین چار لاکھ کا نقصان ہوگیا ۔ بات پھر کر صاعقہ کی نحوست سے وابستہ ہوئی ۔

ستم بالائے ستم یہ کہ انہی دنوں حسن آرا کے شوہر فضائی حادثہ میں پیرس کے قریب جاں بحق ہوگئے ۔ جس وقت یہ اطلاع قصرِ احمر میں پہنچی ، حسن آرا صاعقہ کو گود میں لیے بیٹھی تھیں ۔ اب تو صاعقہ نحوست کا ایسا نشان سمجھی جانے لگی ۔ جس کے عقب میں تباہی ہی تباہی تھی ۔

ناجی کے سامنے ہی اسے وہ کوسنے دیے جاتے کہ ظلم بھی پناہ مانگ اُٹھتا ۔ گھر والوں کا بس چلتا تو ننھی سی جان کو پاؤں تلے کچل کر فنا کر دیا جاتا ۔ جارحانہ ۔۔۔ بہیمانہ رویہ روا رکھنے میں ہر فرد پیش پیش تھا ۔

ناجی سب کچھ دیکھ رہی تھی ۔ اپنی ذات پر تو شاید اس سے بھی زیادہ جھیل لیتی لیکن اس ننھی معصوم روح کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سن کر اس کا دل شق ہو جاتا ۔ اسے سینے سے لگائے پہروں روتی رہتی ۔ محل کے پچھواڑے درختوں کی چھاؤں میں بہتی پہاڑی ندی کے کنارے چپ چاپ بیٹھی اپنی تقدیر کے اس پیچ کے متعلق سوچتی رہتی ۔ اسے میاں کی بے مہری کا بھی تو شکوہ تھا ۔ الحمرا میں آنے

اس سے اتنی دور ہوگئے تھے ۔

لیکن یہ سب ناجی کے دُکھے ذہن کی اختراع تھی ۔ طاہر کو مصروفیت نے اُلجھا رکھا تھا ۔ اُن کے پیار کے مدارج تو نہ بدلے تھے ۔

باپ کی وفات نے کئی بکھیڑے کھڑے کر دیئے تھے ۔ اُلجھنیں بڑھتی جارہی تھیں ۔ ان سب کا تدارک انہی دنوں ضروری تھا ۔ سب بھائی ان تنازعوں ، بکھیڑوں اور اُلجھنوں کو دُور کرنے میں کوشاں تھے ۔

طاہر فرصت نکال کر ناجی کے پاس آتے ۔ شکوے مچل اُٹھتے گلے ہونٹوں پر تڑپ جاتے ۔ لیکن نہ شکووں کو راہ ملتی نہ گلوں کو زبان ۔۔۔ طاہر آتے تو اُن کی توجہ کا مرکز صاعقہ ہوتی ۔ اس کی پیاری پیاری صورت دیکھ کر وہ ہر اُلجھن ، ہر تنازعہ اور ہر بکھیڑا بھول جاتے ۔ کتنے مسرور نظر آتے تھے ۔ وہ ۔۔۔ ناجی کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کہہ نہ پاتی ۔

پورے دو ماہ گزر گئے ۔ ناجی کا سینہ گھر والوں کے طعنے سنتے سنتے شق ہوگیا تھا ۔ صاعقہ کی نحوست کی باتیں سُن سُن کر کان پک گئے تھے ۔ ہر حادثہ اس کی ذات سے منسوب تھا ۔ اور کوتاہئ تقدیر سے حادثے بھی انہی دنوں پیش آئے تھے ۔ پے در پے کئی واقعے پیش آئے ۔

آندھی کے ساتھ طوفانی بارش آئی ۔ الحمرا کے زنانہ حصے کی پچھلی دیوار گرنے سے دو کنیزیں مجروح ہوگئیں ۔ ملازم لڑکے سے بچہ گاڑی اُلٹی اور انجم کا چھوٹا بچہ زخمی ہو گیا ۔ دادی حسن بانو کے سر میں درد شروع ہوا اور کچھ مستقل صورت اختیار کر گیا ۔ ریحان کا کھیلتے کھیلتے پاؤں پھسلا اور موچ آگئی ۔

چھوٹے بڑے کئی واقعات پیش آئے اور ان سب کی محرک صاعقہ کی ذات کو سمجھا جانے لگا ۔ عورتیں تو عورتیں ، اس کنبے کے اکثر مرد بھی اس کو منحوس کہنے اور سمجھنے میں اپنے آپ کو حق بجانب کہنے لگے ۔

ناجی سب ستم اپنی جان پر جھیل رہی تھی ۔ اُسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شوخ و شنگ ندی کی لہریں کسی سرد رَو سے منجمد ہو چکی ہوں ۔ چہرے سے تازگی و شادابی عنقا تھی ۔ وہ مُرجھائے ہوئے اس پھول کی طرح دکھائی دیتی تھی جسے عالمِ شباب میں شاخ سے توڑ کر گلدان میں سجا دیا گیا ہو اور جہاں وہ اپنے قدرتی وسائل سے محروم

ہو کر رنگ و بو کھو رہا ہو ۔

اس دن طاہر تقریباً ڈیڑھ ہفتے کے بعد الحمرا واپس آئے ۔ جاگیر پر تنازعہ کی وجہ سے اتنے دن غیر حاضر رہنا پڑا ۔

طاہر نے اس دن ناجی کو ایک عرصے کے بعد غور سے دیکھا ۔

اور

جیسے

کسی نے ان کا دل مسل کر رکھ دیا ۔

ناجی کا صبیح و ملیح چہرہ اس سپاٹ میدان کی طرح نظر آ رہا تھا جہاں کوئی حسین وقت چند دن رُک کر رونقیں بکھیرنے کے بعد جا چکا ہو ۔ اور چند روزہ رونقوں کے بعد سناٹے میں اب اُداسیاں ہی اُداسیاں اُمڈ آئی ہوں ۔

چہرے کی رنگت زرد تھی لیکن آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کتنے گہرے ہو گئے تھے ۔ طاہر نے بے اختیار ہو کر ناجی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ۔ وہ اب تک اُن کی کمزوری کو بچی کی ولادت کا اثر سمجھ رہے تھے ۔ لیکن آج اُن کا دل سہم کر رہ گیا ۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ناجی ۔۔۔ کتنی کمزور ہو گئی ہو ۔۔۔ کیا تکلیف ہے تمہیں ۔۔۔؟"

اس بے پناہ ہمدردی اور چاہت نے محسوسات کے نازک نازک آبگینوں کو ٹھیس لگا دی ۔ رُکا ہوا طوفان پھوٹ پڑا ۔ ناجی نے طاہر کے چھاتی میں منہ چھپا لیا ۔ وہ ان کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ۔

"ناجی" طاہر گھبرا گئے "کیا ہوا ۔ کچھ تو کہو ۔۔۔!"

"سیاں" ناجی ان کی چھاتی سے لگی سسکتی رہی ۔

"ناجی" طاہر نے پیار کی شدتوں سے مغلوب ہو کر اسے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا ۔

"سیاں"

"کچھ تو کہو ناجی ۔۔۔ کیا ہوا ۔۔۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ۔۔۔ ناجی ۔۔۔ کیوں روتی ہو ۔۔۔ کچھ تو کہو ۔۔۔" اس کے بالوں میں منہ چھپائے طاہر [illegible] تھے ۔

"سیاں" وہ مضطرب و بے قرار تھی ۔

"کیا ہوا؟" طاہر نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا ۔ اور اس کی جل برساتی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "اُداس ہو گئی تھیں ۔ بہت دن لگ گئے مجھے ۔۔۔ کیا کرتا ۔ کام ہی ایسا تھا ۔۔۔ مجبوری تھی ناجی ۔۔۔ وعدہ کرتا ہوں ۔ اب اتنے طویل عرصے کے لیے کہیں نہیں جاؤں گا ۔"

"مجھے یہاں سے لے چلو سیاں ۔۔۔" ناجی نے سر جھکا کر پھر ان کی چھاتی سے لگا دیا ۔۔۔ "میں یہاں مر جاؤں گی ۔۔۔ مجھے کہیں لے چلو ۔"

"ناجی" طاہر نے سہارا دے کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا ۔ وہ اب بھی اسی بے اختیاری سے روئے جا رہی تھی ۔

طاہر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے ۔ کچھ افسردہ سے نظر آنے لگے تھے وہ ۔۔۔

"ناجی ۔۔۔ کیا بات ہے ۔ یہاں دل نہیں لگا ۔۔۔ یہ میرا گھر ہے ۔ تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

ناجی روئے گئی ۔ وہ انہیں کیسے بتا دیتی کہ یہ گھر نہیں، سونے چاندی کی سلاخوں والا ایسا بند پنجرہ ہے جہاں ہر لمحہ اس کی نشتروں اور زہر آلود تیروں سے دیکھ بھال ہوتی ہے ۔ اور جس کی بند سلاخوں سے اپنا ماتھا پھوڑ پھوڑ کر بھی راہِ فرار نہیں پا سکتی ۔

"اکیلی گھبرا جاتی ہو ۔۔۔ امی حضور کے پاس چلی جایا کرو ۔ وہاں سب لوگ تمہارا دل بہلائیں گے ۔"

"نہیں سیاں ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔"

"کیا؟"

ناجی روتی رہی ۔

"امی حضور سے ڈر لگتا ہے؟" طاہر نے اس کی ذہنی کیفیت سے اندازہ لگایا ۔

"ہاں ۔۔۔" ناجی نے معصومیت سے کہا ۔

"کیوں؟"

"سیاں ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ مجھے یہاں سب ۔۔۔ برا سمجھتے ہیں ۔۔۔ سب ۔۔۔"

"یہ تمہارا وہم ہے ناجی" طاہر بے ساختہ ہنس پڑے ۔

"نہیں ---- میاں نہیں ----"

"ناجی ---- امی حضور نے ابا کی وفات کا جانکاہ صدمہ جھیلا ہے۔ اور پھر نجم آرا کے شوہر کی موت نے ان کے حواس پر بجلی گرائی ہے۔ ان کا مزاج چڑچڑا سا ہو گیا ہے لیکن گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب پیار کریں گے۔ ان دو اموات سے تو سب کی جان پر بنی ہے۔ تم دل تھوڑا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ناجی طاہر کے اعتماد کو کیوں کر جھٹلا دیتی۔ قہر کے طوفان تو اس کی ذات پر ٹوٹتے تھے۔ طاہر کے ساتھ تو گھر والوں کا رویہ معمول سے زیادہ خوشگوار تھا۔ یہی نئی پالیسی تھی۔ جو ناجی کو بن موت مارے جا رہی تھی۔

شومئی تقدیر، ناجی و طاہر کی باتیں فوزیہ نے سن لیں ---- حسن بانو کو اطلاع [illegible] کر دو غصے سے پیچ و تاب کھانے لگیں۔ ناجی کو کچل دینے کی انہوں نے قسم کھا لی۔

اب ناجی کے خلاف اک نیا محاذ قائم ہو گیا۔ انجم تو سسرال جا چکی تھیں۔ [illegible] سہارا ابھی جا رہا ہے۔ طاہر کو بھی اکثر گھر سے باہر رہنا پڑا۔ موقعہ غنیمت جان کر مظالم [illegible] گئے اور بے دریغ ڈھائے گئے۔ کوناگیا اور بیدردی سے لوٹا گیا۔

چال بدل لی گئی تھی۔ طاہر کے سامنے ناجی کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کیا جاتا۔ اس کے ساتھ ہمدردی جتائی جاتی۔ اس کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار ہوتی۔ لیکن طاہر فریب کھا رہے تھے۔ انہی ہاتھوں کا سہارا لیے جا رہے تھے جو بڑی مستعدی سے ان کی جیتی جاگتی محبت کو دفنانے کے لیے قبر کھود رہے تھے۔

ناجی بالکل چپ ہو گئی۔ مجسم گلہ تھا لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ ہاں کبھی کبھی بے بس ہو کر طاہر کی چھاتی میں منہ چھپا کر رو دیتی تو اس کی زبان پر ایک ہی [illegible] ہوتا ---- "مجھے کہیں لے چلو میاں ----"

طاہر اس کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے بھرپور پیار سے [illegible] [illegible] [illegible] سب ٹھیک ہو جائے گا [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

خاموشی اس کے سراپا پر چھائی رہتی۔ وہ دُکھتا ہوا زخم دکھائی دینے لگی۔ طاہر چاہتے وہ سارے محل میں شوخ ہرنی کی طرح طرارے بھرتی پھرے۔ پہلے سی شوخی، معصومیت اور الہڑپنے سے ان کے ساتھ باتوں کے طویل سلسلے چھیڑے۔ اچھلے، کودے اور مستانہ ہواؤں کی طرح الحمرا میں جھومتی پھرے۔

لیکن

ناجی پر تو اک جمود طاری تھا۔ آنکھوں میں جما ہوا آزار اب اتنا واضح تھا کہ طاہر دو رُخی پالیسی کے فریب میں آنے کے باوجود تڑپ کر رہ گئے۔

"ناجی ----!" انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر غور سے دیکھا ---- "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"میاں" طوفان اک بار پھر پھوٹ پڑا ---- ناجی بے اختیار ہو کر رو دی۔

"ناجی ---- کچھ تو بتا دو ----؟"

"مجھے یہاں سے لے چلو میاں ---- نہیں تو میں مر جاؤں گی ---- میرا دم گھٹ جائے گا ---- مجھے لے چلو میاں ---- لے چلو ----!"

"اچھا ---- میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا" طاہر نے فیصلہ کر لیا۔

"سچ؟"

"ہاں"

"کب چلو گے؟"

"بہت جلد ----"

"سچ کہتے ہو ----؟"

"یقین نہ کرنے کی وجہ تو کوئی نہیں ----"

"میاں ----!" ناجی کو جیسے اس کی کھوئی ہوئی جنت ملنے کا یقین آ گیا۔

طاہر نے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے بجھتے دیپ پھر سے روشن ہو گئے ہوں۔ مسرت کی اک بھرپور لہر اس کے کملائے ہوئے چہرے پر دوڑ گئی۔

"میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں ناجی ---- اگر تمہاری خوشی یہاں سے چلے جانے میں ہے تو میں تمہاری خوشیاں تمہیں لوٹا دوں گا ----"

"سیاں ۔۔۔ تم کتنے اچھے ہو سیاں" ناجی نے اک مدت کے بعد اپنی مخصوص ادا سے مسکرا کر طاہر کو دیکھا اور پھر شرما کر اپنا منہ ان کی چھاتی میں چھپالیا ۔

طاہر کو آج پہلی بار اس آزاد پرندے کی بند پنجرے میں پھڑپھڑاہٹ کا صحیح اندازہ ہوا ۔۔۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے لاشعوری طور پر وہ ناجی پر ظلم کرتے رہے تھے ۔ ان کا دل دُکھنے لگا۔

---

(۲۰)

اللہ جانے اُسے یہاں کیا تکلیف ہے۔ ہم تو صدقے واری ہوتے ہیں۔ اس کا مزاج ہی نہیں ٹھہرتا۔"

"یہ بات نہیں امی حضور۔ وہ اس ماحول سے مانوس نہیں۔ اس لیے سخت گھبرا گئی ہے۔"

"یہاں رہے گی تو مانوس بھی ہو جائے گی۔ دور دور بھاگے گی تو مانوس ہونے کا سوال ہی نہیں۔"

"اس کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصہ کے لیے اسے الگ رکھنا ہی پڑے گا۔ ورنہ۔!"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ خود ہی ہم سے دور بھاگنا چاہتے ہو۔"

"امی حضور۔۔!"

"اور کیا۔ ابھی تو باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ اس بات کو کہتے ہوئے تمہیں خود ہی خیال ہونا چاہئیے۔"

ماں کی گلوگیر آواز سے طاہر کا دل ڈول گیا۔

طاہر نے ماں کے سامنے ناجی کو الگ رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن وہ ہاتھ میں آیا ہوا شکار کب چھوڑنا چاہتی تھیں۔ ناجی ایک بار پھر ان کے وقار کا تمسخر اڑاتے ہوئے طاہر کو لے کر الگ ہو جائے یہ بات بھلا انہیں کیونکر گوارا ہو سکتی تھی۔ انتقامی جذبے تو اسے لمحہ لمحہ کی موت مار کر تسکین پا رہے تھے ناجی کے الگ ہو جانے سے یہ تخریبی کارروائی کہاں ممکن تھی۔

ماں نے مخالفت کی۔ سعدیہ اور فوزیہ نے ماں کی حمایت کی لیکن سب نے وطیرہ ایسا اختیار کیا کہ طاہر کے لیے نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن والا معاملہ ہو گیا۔

"سال بھر تمہاری جدائی میں تڑپتے گزرا تھا۔ خدا خدا کر کے شکل دیکھنا نصیب ہوئی۔ جانا ہی تھا تو پھر آئے کیوں تھے۔ ایک ہی صبر کی سل کلیجہ پر رکھ لی تھی۔"

"دنیا کیا کہے گی۔ باپ کی راہیں بھی میلی نہ ہوئیں اور بیٹے نے کنارہ کشی کر لی۔"

"کتنے خوش تھے تمہارے ابا تمہاری واپسی سے۔ انہیں فریب ہی دینے آئے تھے۔ چاہتے ہو ان کی روح ابد تک بھٹکتی پھرے۔"

"قسمت میں دکھ ہی دکھ لکھے ہیں۔ زخموں پر پھایا رکھنے کی بجائے انہیں کریدنا چاہتے ہو۔"

ماں نے روتی آنکھوں سے ایسے ایسے وار کیے کہ طاہر بے بس ہو کر رہ گئے۔ سر جھکا کر آہستگی سے ایک بار پھر اپنے ارادے کی وضاحت کی:

"امی حضور میں کوئی گھر چھوڑ کر پہلے کی طرح تو نہیں جا رہا صرف ناجی کی صحت کے پیش نظر۔۔"

"ہاں ہاں۔ یہی تو کہو گے۔ ناجی کے مقابلے میں تمہیں بیوہ ماں کا احساس بھی کیا ہو سکتا ہے۔" ماں ہچکیاں بھرنے لگی۔

"جب جانے پر بضد ہو تو پھر پوچھنے کا کیا محل۔ جاؤ جہاں خوش رہ سکتے ہو رہو۔" چھوٹی بہن حسن آرا نے تلخی سے کہا۔

"نہیں خدا کو سونپو۔" ماں نے رقت آمیز لہجے میں جیسے فریاد کی۔ "ہماری قسمت میں تو صدمے ہی صدمے دیکھنا لکھے ہیں۔" سعدیہ نے آنکھیں آنچل سے پونچھیں۔

حسن بانو اور ان کے حواریوں کے وار نشانے پہ بیٹھے۔ طاہر کا سر اور جھک گیا۔ ہونٹوں پہ مہر خاموشی لگ گئی۔ ان کی باتوں سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ ناجی کا یہاں سے کہیں اور چلے جانے کا اصرار بے محل سا نظر آنے لگا۔

نڈھال اور پریشان سے وہاں سے اٹھے۔ ماں کے لیے ان کے دل میں آگ ... گرہ میں لے رہا تھا۔

اور

اسی رات جب ناجی نے بڑے پیار سے طاہر کے گلے میں بانہیں ڈال کر سسکتے ہوئے پوچھا "اب چلو گے میاں؟"

تو

طاہر جھنجھلا گئے۔

ماتھے پر ہلکی سی شکنیں ابھریں اور جھلا کر بولے "خدا جانے تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟"

ناجی کے بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح گر گئے۔۔ آنکھیں پھاڑے وہ طاہر کو دیکھتی رہ گئی۔

طاہر نے منہ پھیرا۔۔ اور مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑائے "تم اتنا بھی تو سوچو میرے لیے یہاں سے جانا کتنا مشکل ہے۔۔ ابا کو فوت ہوئے ابھی عرصہ ہی کتنا گزرا ہے۔۔ لوگ کیا کہیں گے۔ دنیاداری کی خاطر کبھی کبھی اپنے اوپر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔"

وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔۔ اور ناجی انہیں آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میاں نہیں حسن بانو کے صاحبزادے طاہر اس سے ہم کلام ہوں۔۔ طاہر و میاں۔۔۔ ایک ہی شخصیت کے دو رخ قطعی متضاد معلوم ہو رہے تھے۔

ناجی کا معصوم دل طاہر کی ذرا سی جھنجھلاہٹ سے خون ہو گیا۔ آئینہ پر خراشیں ہی خراشیں تھیں۔

ان خراشوں سے لہو رستا رہا۔۔

طاہر اس کی پریشانی سے مضطرب تو ہوئے لیکن اظہارِ ہمدردی کی بجائے اسے سمجھانا ضروری تھا۔ اس لیے بڑے ناصحانہ طریق سے اسے سمجھاتے رہے۔

ناجی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پیار کی گرمی و شدت سے تسکین و ہمدردی کے چند الفاظ کہہ دیتے تو شاید ناجی کے دل کے زخم سل جاتے۔۔ لیکن آج طاہر کا ناصحانہ انداز اور سرد سا اجنبی رویہ ناجی کے دل و دماغ میں حشر اٹھا گیا۔ طاہر نے جو کچھ مصلحت سمجھ کر کیا، وہ ناجی کی بربادی کا پہلا قدم تھا۔

دوسرے دن موقع پاتے ہی حسن بانو نے دل کا غبار نکالا۔۔ سعدیہ نے لعن طعن کی۔ حسن آرا نے نفرت و حقارت کی آگ برسائی۔۔ فوزیہ نے دانت پیس کر دھمکی دی۔ "یہاں سے اب اکیلی ہی جاؤ گی۔۔ طاہر کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو ان کی لاش ہی ملے گی تمہیں۔۔ سمجھیں۔۔!"

ناجی پر قیامتیں ہی ٹوٹ گئیں۔۔ پریشان۔۔ نڈھال اور مضمحل ناجی کچھ سمجھ نہ پائی تھی کہ کیا کرے ... تو اس کی آنکھیں ... تو بھی خشک ہو گئے تھے۔ تکر تکر دیکھے

جاتی نہ آنکھوں میں آنسو آئے نہ ہونٹوں پر فریاد۔۔۔

طاہر کو ہفتہ بھر کے لیے باہر جانا پڑا۔

اور

یہ ہفتہ

ناجی کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔

چبھتی نظروں، کھولتے طعنوں اور ہولناک دھمکیوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔

وہ

جینے سے بیزار ہو گئی۔

خفتگی بیزار۔۔

اور

یہ بیزاری اس دن آخری حدود سے چھو گئی۔ ناجی نے محض اتفاقی طور پر سعدیہ، فوزیہ کی باتیں سن لیں۔

سعدیہ کہہ رہی تھی۔ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس چڑیل سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ مجھے قوی امید ہے تم طاہر کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی رہو۔"

"میری تو ہر دم یہی کوشش ہوتی ہے۔"

"بہت فرق آچکا ہے طاہر میں۔۔ میرے خیال میں تو اب ان کا دل ناجی سے بھر گیا ہے۔ ایک دیہاتن کب تک نظروں میں سما سکتی ہے۔"

"حسین تو ہے۔"

"حسین ہے تو کیا ہوا۔ تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔۔ تہذیب یافتہ حسن کے سامنے اس جنگلی کی کیا وقعت۔ تم بھلا کسی سے کم ہو۔ طاہر کو ہار کر آخر تمہیں اپنانا پڑے گا۔"

"انہیں پانے کے لیے میں سب کچھ سہہ گزروں گی۔ اگر۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں کوئی خوفناک قدم اٹھانے سے بھی گریز نہ کروں گی۔"

"تم مایوس نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کتنا زور لگایا اس نے الگ جا کر رہنے کے لیے لیکن بات نہ بنی۔ طاہر کو ہماری بات ہی ماننا پڑی۔"

"یہ تو واقعی کمال ہوا۔۔ طاہر نے ناجی کی بات ٹھکرا دی۔"

"آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ یہ محبت کا [illegible] تیزی سے چڑھا ہے

تیزی سے اتر جائے گا۔"

ناجی کا دماغ ریل کے پہیئے کی طرح گھوم گیا۔ طاہر کا رویہ مشکوک ذہن کے لیے قاتل ثابت ہوا۔

وہ دن رات اس ماحول سے نکلنے کے متعلق سوچنے لگی۔ کوئی ٹھکانہ نظر نہ آتا تھا۔ ماں مر چکی تھی۔ کوئی قریبی عزیز بھی نہ تھا اور پھر۔۔ پھر وہ کسی کے ہاں جا بھی کیسے سکتی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر صرف ایک ہی راہِ فرار کے متعلق سوچتی۔

خودکشی۔

یہی راہ اسے سکون دے سکتی تھی۔ اس کی ہمت ظلم سہتے سہتے جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس پر میاں کا ناصحانہ انداز۔۔ وہ بد ظن ہوتی گئی۔۔ میاں سے بھی بد ظن ہوتی گئی۔

ادھر طاہر ناجی کی پریشانی سے پریشان تھے۔ درس حالات اسے یہاں سے کہیں لے جا کر الگ رکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اور یہاں رکھنے سے دیکھ رہے تھے کہ ناجی بے موت مری جا رہی ہے۔ دن رات اس الجھاؤ کے متعلق سوچتے رہے۔ کبھی ناجی کو تسلیاں دیتے، کبھی جھنجھلا کر حالات سے تعاون کرنے کی نصیحت کرتے۔

ناجی بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اب اس نے کبھی کہیں اور جا بسنے کے لیے طاہر کو مجبور نہ کیا تھا۔ کبھی کسی کے متعلق شکایت نہ تھی۔ لبوں پر کسی کا شکوہ نہ آیا تھا۔ کبھی ہوائی دن رات کے چکر میں پستی جا رہی تھی۔

طاہر اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتے تھے۔ ناجی اگر یہیں رہی تو کوئی عجب نہیں

وہ

کسی مہلک مرض میں گرفتار ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ سر تا پا کانپ جاتے۔۔

بالآخر انہوں نے ایک تجویز سوچ لی۔ ناجی کو کچھ عرصہ کے لیے غیر ممالک کی سیر کے لیے لے جانے سے وہ یہاں کے غیر مانوس ماحول سے بھی نکل جائے گی اور گھر والوں کو اعتراض کا موقعہ بھی نہیں ملے گا۔

ناجی سے کوئی ذکر کرنے سے پہلے انہوں نے اپنی تجویز ماں کے سامنے پیش کی۔

"چند ماہ کے لیے اسے غیر ممالک کی سیر کے لیے لے جاؤں گا۔ وہ بہل جائے گی۔

اس کی صحت کس قدر گر چکی ہے۔ ہول آتا ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو۔ کچھ دیر یہاں سے دور رہے گی تو غیر مانوس ماحول کا احساس جاتا رہے گا۔"

ماں کب چاہتی تھیں کہ ان کے پنجہ میں آیا ہوا شکار یوں نکل جائے۔ وہ تو تڑپا تڑپا کر اس شکار کو مارنا چاہتی تھیں۔ انتقام کی آگ کو شکار کی تڑپ سے ٹھنڈا کرنا چاہتی تھیں۔

کافی لے دے ہوئی لیکن طاہر نے اس تجویز پر لمبی چوڑی بحث کی۔ اعتراض کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

ماں کو بالآخر چپ ہو جانا پڑا۔ وہ راضی تو نہ تھیں۔ یہ طاہر بھی جانتے تھے۔ طاہر تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ماں کی خفگی کا احساس تھا۔

لیکن

کیا کرتے۔ مجبور بھی تو تھے۔

کئی دن طاہر پاسپورٹ وغیرہ کی تیاری میں لگے رہے۔ ناجی کو سرسری طور پر اپنے باہر جانے کے پروگرام سے مطلع بھی کیا لیکن ناجی تو پتھرا چکی تھی۔ اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔

اس کے ذہن میں اک تتی بات گھر کر گئی۔ طاہر سب کچھ خوشی سے نہیں مجبوراً کر رہے ہیں۔ مشکوک ذہن اس احساس کو جان لیوا بناتا گیا۔

وہ زندگی سے تنگ آچکی تھی۔ ہر ارمان منجمد ہو چکا تھا۔

سیر و تفریح کے لیے جانے کی اسے مطلقاً خوشی نہ ہوئی۔ اور جب سے طاہر نے یہاں کی تیاریاں شروع کی تھیں، گھر والوں نے اس پر ڈھائے جانے والے مظالم کو کتنا تیز بنا دیا تھا۔

فوزیہ تو جان کی دشمن پہلے ہی تھی۔ اب تو اس کا خون پینے کو بے تاب تھی۔ خونخوار آنکھوں سے گھورتی۔ چبا جانے والی نظروں سے دیکھتی۔

حسن بانو نے بھی ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس دن کتنے ظالمانہ طریق سے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا "میرے بیٹے کو پھر مجھ سے جدا کر رہی ہو۔ دو چار ماہ سیر کر آؤ گی تو بہت ہے۔ ساری سیر کا مزہ چکھا نہ دیا تو۔۔ کتنے فریب جانتی ہے۔ دیکھو تو منہ سے زبان نکلتی نہیں آئی اور کرتوت۔۔ اللہ جانے کس کس طرح سکھا کر آمادہ کر لیا ہے ورنہ وہ تو یہاں سے جانے کا کبھی نام نہ لیتا۔۔"

سعدیہ، حسن آراء سبھی آزار دے رہی تھیں۔ ناجی دن رات مر جانے کے متعلق سوچتی۔ باہر جانے کا اب اسے ارمان بھی کیا تھا۔

فوزیہ طاہر کی تیاریاں دیکھ دیکھ کر زہریلی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ یہ تیاریاں ان کے منہ پر تھپڑ تھا۔

پے در پے شکستوں نے فوزیہ کو خونخوار بنا دیا۔ طاہر یہیں رہتے تو اسے اپنی سرگرمیاں تیز کر کے کسی امید کا سہارا ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کے چلے جانے سے امید خاک میں مل رہی تھی۔ ناجی کی خوش بختی پر وہ ناکامی کی مہر بن جانا چاہتی تھی۔

اور

اس رات

ناجی مایوسی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ آج طاہر نے پھر خفگی کا اظہار کیا تھا۔ یوں گم صم ہو جانے پر وہ اچھے خاصے برہم بھی ہوئے تھے۔ ناجی ابھی اس برہمی کے تاثر سے ہی تڑپ رہی تھی کہ فوزیہ اس کے کمرے میں آگئی۔ رات کے وقت اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ فوزیہ زہر اگل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اس نے ناجی کے بال جھنجھوڑ ڈالے اور کف آلود ہونٹوں سے دھمکی دی۔

"طاہر کو یہاں سے لے جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر تم انہیں یہاں سے لے جانے پر مصر رہیں تو یاد رکھو تمہیں، طاہر کی جگہ طاہر کی تڑپتی ہوئی لاش ملے گی۔ طاہر میرے ہیں اور میں انہیں حاصل کر کے رہوں گی۔ تم میرے اور طاہر کے راستے کی دیوار ہو۔ اگر یہ دیوار مجھ سے نہ ہٹ سکی تو میں طاہر کو ختم کر دوں گی۔ ایک ہی گولی اس کے سینے سے پار ہو کر سارا کام بنا دے گی۔ مجھ میں تڑپنے کی اب ہمت نہیں۔ میں تڑپوں اور تم طاہر کی سنگت میں سیر و تفریح کرتی پھرو، یہ خیال خام دل سے نکال دو۔۔"

ناجی دل برداشتہ تھی۔ کم عمری اور نافہمی بھی تھی۔ زندگی سے تنگ آچکی تھی۔ طاہر کی طرف سے بھی ذہن کسی حد تک بدظن تھا۔ ان ساری باتوں نے مل ملا کر اسے نیم دیوانہ بنا دیا۔ فوزیہ کی دھمکی نے تو اب ظلم سہارنے کی ہر قوت ختم کر دی۔

طاہر جب کمرے میں آئے تو وہ ناجی کی ذہنی کیفیت سے بے خبر تھے۔ وہ بے سدھ سی بستر پر پڑی تھی۔ طاہر ایک تو خود بھی دن کی دوڑ دھوپ سے تھکے ہوئے تھے،

دوسرا ناجی کو بے آرام نہ کرنے کے خیال سے انہوں نے اسے جگایا نہیں۔
چپ چاپ لباس تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ گئے۔
جہاں
چند ہی لمحوں بعد ان کا تھکا ہوا جسم نیند کی آغوش میں غافل ہو گیا۔ ناجی انگاروں پر لوٹتی رہی۔
طاہر کی بے حسی پر دل جل کر رہ گیا۔
فوزیہ کی دھمکی کے دھماکے سے ذہن لرز لرز اٹھا۔
اس نے زندگی کا جوا اتار پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ آئے دن کی کِل کِل اور جھک جھک سے فرار کا راستہ نظر آ رہا تھا۔
وہ اٹھی۔
اپنی شادی کی یادگار انگوٹھی اتار کر طاہر کے سرہانے رکھ دی۔ طاہر پر جھکے جھکے وہ کئی لمحے انکا چہرہ دیکھتی رہی۔
کتنی پریشانیاں دی تھیں انہیں اس نے۔۔ نہ ماں باپ سے نبرد آزمائی کر سکے تھے، نہ بیوی کی طرفداری کھل کر ہو سکتی تھی۔ بیزار ہی رہنے لگے تھے۔ اس بیزاری کو ناجی سراسر اپنی ذات سے منسوب کیے ہوئے تھی۔
اس کا ذہن متلاطم تھا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ بس ایک ہی دھن تھی۔ اپنی ذات کو ختم کر دینے کی۔ ہر بات معمول پہ آ جائے گی۔ ہر غم کا مداوا ہو جائے گا۔ پاگلوں کی طرح سوچتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔
چمن کو بھاگتے ہوئے عبور کر کے وہ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ اسی پتھر پر کھڑے ہو کر اس نے مڑ کر الحمراء کی بلند و بالا عمارت کی طرف دیکھا۔ پتھروں کی بنی ہوئی عمارت۔
جس میں ان پتھروں سے بھی کہیں زیادہ پتھر دل انسان بستے تھے۔
الحمراء پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد ناجی نے پُر شور ندی کی طرف دیکھا "ہی۔۔ یا۔۔ ں۔"
اک چیخ ویرانے میں گونجی۔
اک دھماکہ ہوا۔۔۔ اور
ناجی پہاڑی ندی کی تیز موجوں کی آغوش میں پہنچ گئی۔

(۲۱)

اور
عین اسی وقت
طاہر ہڑبڑا کر مسہری پر اٹھ بیٹھے۔
انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے دل پر زور سے گھونسہ مارا ہو۔ اپنے خطرناک حد تک دھڑکتے ہوئے دل پر انہوں نے بے اختیار ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔
چند لمحے یہی کیفیت رہی۔
پھر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اسی طرح دل پر ہاتھ رکھے رکھے انہوں نے گردن کو خم دے کر دائیں جانب دیکھا۔ ناجی ان کے پہلو ہی میں تو سو رہی تھی۔
لیکن
اس وقت وہ بستر پر نہ تھی۔
"اوہ" طاہر لیٹ گئے۔ "شاید ناجی کے اٹھنے سے پلنگ ہل گیا ہے۔" لیکن دل اسی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔
طاہر نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی۔ ناجی شاید غسلخانے میں جانے کو اٹھی ہو۔۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہونے کی کوشش کرنے لگے۔
لیکن
دل
کیا ہو گیا تھا اس دل کو۔۔ یوں بے اختیاری سے دھڑکے جا رہا تھا۔ طاہر نے گہرے گہرے سانس لے کر اس دھڑکن کو معمول پہ لانا چاہا لیکن سینے میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

بے تاب ہوکر کروٹ پھر بدلی ۔ آنکھیں بند کیں، پھر کھول دیں۔
ہاتھ بڑھا کر ہلکے سبز رنگ کا مدھم سا قمقمہ روشن کیا۔ بے چینی کو ختم کرنے کے لیے سگریٹ سلگایا۔

اور ناجی کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ ناجی نہ آئی۔

تکیہ ہٹا کر گھڑی نکالی۔

لیکن

ششدر سے رہ گئے۔

گھڑی کے ساتھ ناجی کی انگوٹھی پڑی تھی۔

کہنی کے بل اٹھے۔۔ انہوں نے انگوٹھی اٹھالی۔۔ یہ انگوٹھی دیکھ کر کچھ حیران ہو گئے۔ یہ انگوٹھی تو ناجی کی انگلی سے اسی طرح لپٹی رہتی تھی جس طرح ان کے دل میں ناجی کا پیار۔

آج یہ انگوٹھی اس حنائی انگلی سے جدا کیوں کر ہو گئی۔

انگوٹھی اپنی انگلی میں اٹکا کر انہوں نے گھڑی دیکھی۔ تین بجنے کو تھے۔ کچھ ...ست کر کے وہ پھر لیٹ گئے۔

انگلی میں انگوٹھی کو یونہی اٹکا کر خالی خالی ذہن سے کچھ سوچتے ہوئے وہ ناجی کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

انتظار بے سود تھا۔ ناجی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ گھبرا کر طاہر نے کمبل الگ پھینکا اور مسہری سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند منٹ یونہی کمرے میں پھرتے رہے۔ سینے میں گھٹن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گھبراہٹ سے جیسے دم گھٹتا جا رہا تھا۔

"ناجی" انہوں نے غسلخانے کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پکارا۔ آواز دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔

طاہر نے پھر پکارا۔

جواب نہ ملا۔

بے کلی بڑھ گئی۔ انہوں نے ہاتھ سے دروازہ دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا اور ناجی غسل خانے میں نہ تھی۔

طاہر پریشان ہو گئے۔ پھر سوچا شاید بچی کے پاس ہو گی۔ لیکن اس سوچ سے تسکین نہ ہوئی ۔

ساتھ والے کمرے میں گئے۔ آیا گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی اور گلابی جھالروں والے ریشمی بستر میں ان کی محبت کا شگفتہ پھول صاعقہ اک معصومانہ اور دلفریب انداز میں خواب استراحت کے مزے لے رہی تھی۔

ناجی وہاں بھی نہ تھی۔

طاہر جلدی سے پلٹ کر کمرے میں آئے۔ گھبرا کر برآمدے میں نکل آئے۔
انتظار ہر لمحہ آزار بنتا جا رہا تھا۔

"آخر وہ جا کہاں سکتی ہے ؟" انہوں نے الجھے الجھے ذہن سے سوچا۔ پھر انہیں خیال آیا "کوئی تکلیف نہ ہو گئی ہو۔ شائد ای کے کمرے میں گئی ہو۔"

سوچ میں گم طاہر واپس اپنی خواب گاہ میں آ گئے۔ لیکن قرار نہیں آیا۔ دل تھا کہ رہ رہ کر تڑپ رہا تھا۔ طبیعت بوجھل ہو گئی تھی اور روح تو جیسے لامتناہی اندھیروں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اپنے دل کو آپ ہی دلاسا دیا۔ سر جھٹک کر خیالات پریشاں سے نجات چاہی۔ انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور نہ جانے کیونکر لاشعور کے پردوں کو چیرتی ہوئی حجلۂ عروسی میں سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی ناجی شعور میں آ پہنچی۔

"یہ انگوٹھی مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گی میاں۔۔ موت ہی اسے میرے ہاتھوں سے جدا کرے گی۔ تمہارے پیار کی پہلی نشانی ہے نا؟"

گھبرا کر طاہر نے سر جھٹک دیا۔ دل زور سے دھڑکا اور روح بے چین ہو کر تڑپ اٹھی۔

وہ بے تابانہ کمرے سے باہر نکلے۔

دیوانہ وار ناجی کو ڈھونڈتے پھرے۔

لیکن

تلاش بے سود تھی۔

جانے والا ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا۔

دن نکلا۔

رات آئی

اور

پھر شب و روز کا چکر چلتا ہی گیا۔

ناجی کی تلاش میں طاہر نے زمین آسمان ایک کر دیئے۔

دیوانہ وار اسے ڈھونڈتے پھرے۔

لیکن

بے سود

لاحاصل

گھر والے بھی اس کی اچانک گمشدگی سے حیران تھے۔ دلوں میں اپنے مظالم سے چبھن بھی تھی۔ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا، انہی کی وجہ سے ہوا۔ لیکن ظالم ظلم کر کے پچھتانے لگے تو دنیا سے ظلم کا وجود ہی نہ مٹ جائے!

ناجی کی روپوشی کو اک نیا رنگ دے کر اچھالا گیا۔ "بھاگ گئی" ہر پوچھنے والے کو یہی جواب دیا جاتا۔

"رہنے والی تھوڑا ہی تھی۔ ایسے لوگ ایک جگہ زندگی گزار دیں تو رونا ہی کس بات کا۔ جگہ جگہ کی چاٹ ہوتی ہے۔ کوئی اور شناسا مل گیا ہو گا جس کے ساتھ بھاگ نکلی" گھر کے ہر فرد کی زبان پر بس پھر کر یہی باتیں تھیں۔

لیکن یہ سب کچھ بالا بالا ہوتا رہا۔ طاہر کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر تو ہر فرد اپنے آپ کو مجرم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔ ندامت سے سر جھک جاتے۔

طاہر دن رات مرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے تھے۔ "ناجی ناجی" ان کا رواں رواں پکار رہا تھا۔ نہ کھانے پینے کا ہوش۔ نہ تن بدن کی پرواہ۔۔۔ دن رات ناجی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اور یہ سرگردانی غم کی فراوانی سے مل کر ان کے حواس پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر ناجی کو آوازیں دینے لگتے۔ اپنی محبت کے واسطے دے دے کر اسے واپس آ جانے کو کہتے۔

درد ایسا تھا جس کا مداوا ممکن نہیں تھا۔

ناجی کہاں گئی۔ کیوں گئی؟ طاہر منتشر حواس سے بھی یہی باتیں سوچتے رہتے۔ دنیا کی انگلی بھی اس شبہ کی تقویت تھی کہ وہ زندگی سے ہراساں ہو کر موت سے ہمکنار ہو گئی

ہے۔

لیکن

زندگی سے ہراسانی کیوں؟

طاہر کا پاش پاش دماغ اور تھکا ہوا زخمی ذہن اس سوال کا جواب نہ دے پاتا۔

لیکن ایک دن اتفاقاً انہوں نے سعدیہ اور فوزیہ کی باتیں سن لیں۔

"کانٹا نکل گیا۔ خود ہی دفان ہو گئی کہیں" سعدیہ کہہ رہی تھی۔

"خود تو نہیں۔۔ ہمارے سلوک سے گھبرا کر بھاگ گئی۔۔ میں نے بھی تو قسم کھا رکھی تھی، اسے مٹا کر ہی دم لوں گی۔۔ وہ وہ اذیتیں دیں۔۔ کہ بس۔۔"

"اور میں نے کیا کم دل کا غبار نکالا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تنگ آ کر ضرور فرار ہو جائے گی۔۔"

"لیکن وہ گئی کہاں۔۔ طاہر نے تو زمین آسمان ایک کر دیئے اس کی تلاش میں۔"

"ہماری بلا سے۔ جیتی ہے یا مر گئی۔۔ اپنا راستہ صاف ہو گیا۔"

"لیکن طاہر تو دیوانے ہو رہے ہیں۔۔"

"چند دنوں کی بات ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ طاہر کے قریب رہا کرو۔ غم غلط ہو جائے گا۔ خود ہی راہِ راست پر آ جائیں گے۔۔ شادی ہونے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اگر وہ کہیں سے پھر آ دھمکی تو۔۔!"

"توبہ کرو۔۔ پھر کہاں سے آئے گی۔۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ سانپ بھی مر گیا، لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔۔ یہی میں چاہتی تھی۔۔ تم طاہر کے قریب رہا کرو۔ یہ وقتی صدمہ ہے بھول جائیں گے۔۔"

اور پھر ان دونوں کی باتوں میں حسن بانو اور حسن آراء بھی شریک ہو گئیں۔ ہر فرد اعتراف کر رہا تھا کہ ناجی اس کے رویے اور سلوک سے تنگ آ کر روپوش ہوئی ہے۔ ہر شخص اس کے فرار کی وجہ خود کو ثابت کر کے کامیابی کا سہرا اپنے سر لینا چاہتا تھا۔

طاہر نے سب کچھ سنا۔۔ ان کی تہ و بالا ہوتی ہوئی دنیا میں طوفان اٹھے۔ زلزلے آئے۔ محشر بپا ہو گئے۔

لیکن

ان سب سے بازپرس کرنے سے پہلے ہی ان کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ غم کی

شدت اور اس پر یہ انکشاف، طاہر کے حواس مختل تو تھے ہی۔۔ اب بالکل ہی منتشر ہو گئے۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو گئیں۔ ناجی کے سوا انہیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔

وہ پاگل ہو گئے تھے۔

سارا سارا دن گھاٹی میں پھرتے رہتے۔ ہر آہٹ پر انہیں ناجی کی آمد کا گمان ہوتا۔ وہ اٹھ کر بے تحاشا دوڑنے لگتے۔ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے انہیں ناجی کے لہراتے، پھڑ پھڑاتے آنچلوں کا خیال آتا۔ وہ اسے پکڑنے کو لپکتے۔

"ناجی۔۔ ناجی" وہ دیوانہ وار چیختے لیکن چیخ سناٹوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی۔۔

ان کی حالت دیکھ دیکھ کر سب کے دل کٹے جا رہے تھے۔ ناجی کی گمشدگی کا وہ اتنا اثر لیں گے، ان کے فہم و ادراک میں یہ بات نہ آئی تھی۔ ماں کی ممتا تڑپ تڑپ اٹھی۔ بھائی بہنوں کا پیار مچل مچل گیا۔ لیکن طاہر کی لٹی ہوئی دنیا آباد نہ ہو سکی۔

گھاٹی کے نشیب و فراز میں "ناجی ناجی" پکارتے پھرنے کے سوا انہیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

اس منحوس دن بھی وہ دیوانگی کے عالم میں چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ناجی کو پکارتے پھر رہے تھے۔ دو تین قریبی عزیز اور نوکر ان کی نگرانی کے لیے ساتھ ساتھ تھے۔

اچانک انہوں نے بڑے سے پتھر پر کھڑے ہو کر بازو پھیلا دیئے۔ "ناجی" پورے جوش اور قوت سے چیختے ہوئے وہ پتھر سے کود کر نشیب کی طرف دوڑ پڑے۔

لیکن پاؤں الجھا۔

اور

طاہر نگہداشت کرنے والوں کی پہنچ سے پہلے ہی لڑھکتے ہوئے گھاٹی کی گہرائیوں میں جا پہنچے۔

زخم اتنے شدید آئے کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اور انہی مہکتی فضاؤں میں جہاں ان کی محبت نے جنم لیا، پروان چڑھی اور ارتقائی منازل طے کرتی کامرانی سے ہمکنار ہوئی تھی۔۔ طاہر نے دم توڑ دیا۔

(۲۲)

وفا کے نام پر مٹنے والوں کی داستان کی اتنی دلدوز انتہا۔۔ چاہیئے تھا کہ پس ماندگان کے لیے درسِ عبرت بنتی اور وہ ناجی و طاہر کی واحد یادگار صاعقہ کو سینے سے لگا کر رکھتے۔

لیکن

معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اس سارے المیہ سانحے کو صاعقہ کی نحوست سے منسوب کیا گیا۔ نحوست تو یومِ پیدائش ہی سے اس سے منسوب کی جا چکی تھی۔ اور پے در پے واقعات بھی کچھ اس طرح رونپذیر ہو رہے تھے کہ اوہام پرست طبیعتیں اپنے خیالات کی تقویت پا رہی تھیں۔ اب طاہر کی جوانمرگی نے تو صاعقہ کی نحوست کو ایسا نقش بنا دیا تھا جسے مٹانا ناممکن تھا۔

طاہر کی ناگہاں موت کا صدمہ۔ ننھی سی جان کو کوس کوس کر بھلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس اندوہ ناک غم کو مٹانے کے لیے معصوم روح کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کیا جاتا۔

صاعقہ ماں باپ کی آغوشِ شفقت سے محروم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ گھر والوں کی نظرِ کرم سے بھی محروم ہو گئی۔ نظرِ کرم تو اس پر کبھی تھی ہی نہیں لیکن اب تو کھلم کھلا اس پر ظلم و ستم کے تیر برسائے جاتے۔

صاعقہ کی ساری ہستی نحوست کے گھنیرے بادلوں میں روپوش ہو گئی اور اس دن تو یہ بادل اور گھمبیر ہو گئے جس دن طاہر کے ماموں زاد بھائی بجلی کے تاروں سے چھو جانے سے ہلاک ہو گئے۔ شومئی تقدیر صاعقہ کو اس دن پہلی بار ہی اس کی آیا انکے ہاں لے گئی تھی۔

اب تو اسے تباہی کی علامت اور خطرے کا عنوان سمجھا جانے لگا۔ کوئی اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ بچوں کو اس کے سایہ سے یوں بچایا جاتا جیسے وہ خوفناک اندھیروں کی

کوئی ایسی لہر ہو جو آناً فاناً ہر سامنے آنے والے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

سعدیہ تو اس کی جان کی دشمن تھی۔ اپنے بچوں ریحان اور گل رخ کے ساتھ بھی صاعقہ کو دیکھ لیتیں تو بیچاری معصوم بچی کی شامت آجاتی۔ وہ زنانے دار تھپڑ پڑتا کہ وہ چکرا کر رہ جاتی خوبصورت بالوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالتیں۔ اپنے بچوں کو انتہائی سختی سے منع کر دیتیں کہ وہ صاعقہ کے قریب نہ آئیں۔

یہ ممانعت ان کے ناپختہ ذہنوں میں صاعقہ کی نحوست کے نقوش گہرے کر دیتی۔

حسن آراء کا سلوک بھی ناروا تھا۔ اور جب سے بیوگی کے بعد وہ مستقل طور پر اس گھر میں اٹھ آئی تھیں۔ انہیں دل کے پھپھولے پھوڑنے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔

دو سال یونہی گزر گئے عتاب کی چکی میں پستے ہوئے۔ بوڑھی آیا بھی صاعقہ سے بدظن تھی۔ پچھلے دنوں اس کا دوسرا لڑکا ٹرک کی زد میں آجانے سے دائیں ٹانگ کھو بیٹھا۔ آیا بدظن ہوگئی۔ صاعقہ کو اک وبال اور بدشگنی کا جیتا جاگتا نشان سمجھنے لگی۔ اس کی نگہداشت میں دانستہ تساہل برتنے لگی۔

یہ تو شاید صاعقہ کی خوش بختی تھی جو انہی دنوں ڈاکٹر جنید کی آیا نے صاعقہ کا بار اپنے کندھوں پر اٹھانے کی پیش کش کی۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ وہ بڑھیا اس ننھی سی بچی کا گلا گھونٹ دیتی۔

ننھی آیا صاعقہ کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی۔ دیکھنے میں وہ جتنی ہی کریہہ [illegible] تھی دل کی اتنی ہی حسین تھی۔ سوختہ چہرہ، تپا ہوا گوشت، کھنچی ہوئی ایک آنکھ اور [illegible] [illegible] وہ آیا شفقتوں کے دامن پھیلائے آئی اور صاعقہ کی [illegible] [illegible] کوششیں [illegible] دیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] جس سے وہ محروم تھی۔ وہ اس کے لیے ماں باپ دوست عزیز سب [illegible] گئی۔ اس کی جسمانی اور ذہنی نشوونما کے لیے اس نے اپنی انتھک کوششوں [illegible] دیئے۔

جلد ہی گھر والوں کا رویہ اور ماحول اس نے [illegible] کر لیا۔ دوسری خدمت گزاروں کی [illegible] [illegible] نحوست کے قصے بھی سنے۔ کنیزوں نے اسے ورغلایا۔ [illegible]

نے کسی کی بات پر دھیان نہ دیا۔ صرف اسی بات کا خیال رکھا کہ صاعقہ اہل خانہ کی ظالمانہ دست برد سے محفوظ رہے۔

لیکن

اس کی ساری کاوشوں کے باوجود صاعقہ گھر والوں کے لیے بدشگنی اور نحوست کا جیتا جاگتا نشان تھی۔ جب بھی موقع ملتا۔ اسے نفرت و حقارت کے تیروں سے چھلنی کرنے کی کوشش کی جاتی۔

آیا حتی المقدور اسے گھر والوں کی نظروں اور بچوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتی۔ لیکن آخر صاعقہ بھی تو بچہ ہی تھی۔ پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ کیونکر سب سے الگ تھلگ رہ سکتی تھی۔ گو بچوں سے ملنے جلنے کی اسے ایسی کڑی سزا ملتی۔ اتفاقاً کوئی دوڑتے ہوئے گر جاتا یا کھیلنے میں کسی کا پاؤں پھسل جاتا تو صاعقہ کے گھنگریالے بال جھنجھوڑے جاتے۔ پھول سے رخساروں پر تھپڑ پڑتے اور وہ آبدیدہ آنکھوں سے اپنے اوپر اٹھنے والے ظالم ہاتھوں کو دیکھتی رہ جاتی۔ اس کا قصور کیا ہوتا وہ بالکل سمجھ نہ پاتی۔

انہی دنوں کی بات ہے۔

ریحان کی دسویں سالگرہ کا جشن تھا۔ ہر سالگرہ انتہائی کر و فر کے ساتھ منائی جاتی۔ ریحان دادی کے چہیتے اور خاندان کے پہلے پوتے تھے۔ اس لیے جشن عظیم الشان ہوا کرتا تھا۔

ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ بچے رنگ برنگ لباس پہنے تھے۔ بڑوں نے بھی اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں خاص اہتمام کیا تھا۔ ہر فرد خوشی سے چہک رہا تھا۔ جگمگ نور کا سیلاب امڈا تھا جیسے خوشیوں اور مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے ہوں۔

ریحان سفید کمخواب کی اچکن اور ٹوپی پہنے شہزادوں کی سی آن بان لیے میز کے قریب کیک کاٹنے کو کھڑا تھا۔ خاندان کے بچے خوشنما لباس پہنے اس کے گرد جمع تھے۔

کیک پر دس موم بتیاں روشن کی گئیں۔ چھری ریحان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فوزیہ آگے بڑھی۔

فوزیہ اب طاہر کے چھوٹے بھائی فخر سے بیاہی جا چکی تھی۔ اور دوسالہ حمیرا اس شادی کا ثمر تھی۔

صاعقہ بھی اس حسین جھگمٹے میں گلابی فراک پہنے موجود تھی۔ کیک پر جلتی شمعیں

دیکھ کر چہار سالہ صاعقہ ریحان کے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی' جانے کیلئے جگہ بنا کر وہ ریحان کے دائیں طرف آکھڑی ہوئی۔

شور و غل اور گہما گہمی میں اس پر کسی گھر والے کی نظر ہی نہ پڑی ورنہ ایسے مبارک موقعہ پر تو اسے حتی المقدور نظروں سے اوجھل رکھا جاتا تھا۔

"بسم اللہ پڑھ کر شمع کو پھونک مارو۔" فوزیہ ریحان سے بولی۔

"ہاں ہاں بسم اللہ کرو۔۔ بسم اللہ" کئی مسرور آوازیں آئیں۔

"پھونک مارو۔" دادی نے کہا۔

لیکن ریحان کے پھونک مارنے سے پہلے صاعقہ نے پھونک مار دی۔

دو شمعیں گل ہو گئیں۔ ریحان چیخ پڑا۔

"یہ کس نے پھونک ماری" دو تین آوازیں بیک وقت آئیں۔

"میں نے۔۔ میں نے" معصوم صاعقہ نے تالیاں بجاتے ہوئے مسرور انداز میں کہا۔

"چڑیل" سعدیہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کی طرف لپکی۔

"تو کہاں سے آمری یہاں" پلٹ کر فوزیہ نے اسے کندھے جھنجھوڑ کر پرے دھکیل دیا۔ صاعقہ اوندھے منہ گری۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔

دادی حسن بانو مشتعل ہو کر اسے کوسنے لگیں۔ حسن آرا نے ڈائن کے لقب سے نوازا۔۔

مہمانوں کے دل اس بے دردی پر دہل گئے۔ کسی نے بڑھ کر صاعقہ کو اٹھایا چمکارا۔۔

"چھوڑ دو جی اسے۔۔۔ منحوس جانے کہاں سے آمری یہاں۔۔ ڈائن ہے ڈائن۔۔ چل ادھر دفع ہو جا۔۔ کہاں ہے۔۔ اس کی آیا۔۔ کم بخت نے عین موقع پر یہاں بھیج دیا۔۔ دو شمعیں گل کر دیں۔"

"میرا تو دل دھک سے رہ گیا ہے۔"

"اللہ ہی خیر کرے میرے بچے کی"

"صدقہ اتار دو لڑکے کا۔۔۔"

"بدبخت جانے کس وقت آ پہنچی یہاں۔"

"ڈائن۔۔"

"چڑیل۔۔"

"جی چاہتا ہے گلا گھونٹ دوں۔۔"

"ساری خوشی کر کری کر دی۔"

گھر کا ہر فرد صاعقہ کے خلاف زہر اگل رہا تھا' کچھ توہم پرست مہمان خواتین بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں لیکن پڑھے لکھے اور روشن دماغ لوگ اس توہم پرستی پر زیرِ لب مسکرا دیے تھے۔ غریب بچی کے ساتھ بہیمانہ سلوک دیکھ کر وہ ششدر رہ بھی تھے۔ اپنا ہی خون اتنا بیگانہ ہو سکتا ہے، یہ عجیب سی بات ہی تو تھی۔

صاعقہ کے شمع گل کرنے سے اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ انجم آرا اور فخر چچا اس کی حمایت میں سب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فخر چچا تو اپنی بیوی فوزیہ کی ناراضگی کے ڈر سے کچھ زیادہ نہ کہہ پائے۔ ہاں انجم آرا نے خوب خوب سنائیں۔

کافی دیر کے بعد ہنگامہ فرو ہوا۔ آیا کی بھی خوب شامت آئی۔ وہ بچی کو سینے سے لگا کر ہال سے لے گئی اور پھر رات تک کسی نے صاعقہ کو بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔

چھوٹے بڑے کئی واقعات اپنی لپیٹ میں لیے ماہ و سال گزرتے رہے۔ صاعقہ کا شعور بیدار ہوتا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں نکھرنے لگیں۔ ماحول کو پرکھنا آ گیا۔ وہ خود ہی سب سے الگ تھلگ رہنے لگی۔ اداس۔۔ خاموش تنہا۔۔ وقت گزرتا گیا۔

الحمراء کی چھتوں تلے کھیلنے والے بچے چند سالوں کے بیتے میں جوانی کی رنگین حدود میں داخل ہو گئے۔ ریحان، اسد، فرح، نعیم، فرید، ماہ رخ، گل رخ، سمیرا، صاعقہ، شاہدہ، ثمینہ۔۔۔ سبھی چمنستانِ شباب کے نوخیز پھول تھے۔ ان گلہائے رنگین سے الحمراء مہک رہا تھا۔

خوش رنگ پھولوں نے البیلی بیلوں کے سہارے بھی ڈھونڈ لیے تھے۔ ریحان سمیرا میں دلچسپی لیتے۔ اسد گلرخ کے ساتھ اکثر نظر آتے۔ فرخ ثمینہ کے بغیر کسی کھیل میں حصہ نہ لیتے۔۔ نعیم شاہدہ کے گرد منڈلاتے رہتے۔

صاعقہ پر کسی کی نگاہِ لطف و کرم نہ پڑی تھی۔ شروع ہی سے بچوں کے ذہن مسموم کر دیے گئے تھے۔ وہ اب تک صاعقہ سے مبہم سا خوف کھاتے تھے۔ حقہ بھی اپنی جگہیں مضبوط بنا چکا تھا' اسے کوئی در خورِ اعتنا ہی نہ سمجھتا تھا۔ نگاہِ لطف و کرم تو بڑی بات

تھی۔

وہ اکثر سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ کبھی کبھار سب سے مل بیٹھنا ہوتا بھی تو ہمیشہ انجام بدمزگی ہوتا۔۔ یا تو اس کے ساتھ دبا دبا اہانت آمیز سلوک ہوتا یا کھلم کھلا اس کی نحوست کا قصہ دہرایا جاتا۔۔ وہ شکستہ دل ہو کر اٹھ آتی۔

کوئی اس کے دل میں جھانک کر زخموں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ کوئی اس کے جلتے ہوئے سینے میں آگ کی تپش محسوس کرنے کی پرواہ نہ کرتا۔ وہ اپنے کمرے میں گھٹی گھٹی آہیں بھرتی رہتی۔ یا ندی کنارے پانی میں ڈوبے ہوئے پتھر پر پاؤں لٹکائے اپنی زندگی کے سانحے پر غور کرتی رہتی۔۔

اور

جب سے نادانستگی میں اس کے احمق دل نے ریحان کی پوجا شروع کر دی تھی، زندگی اس کے لیے اور بھی بوجھل ہو گئی تھی۔ احساسات کے آبگینے کچھ اور بھی نازک ہو گئے تھے۔ ریحان ہی تو اس کی ذات سے سب سے زیادہ خائف و متنفر تھے۔

اور یونہی بیس سال گزر گئے۔

پورے بیس سال۔۔

۲۳

الحمراء کے عقبی چمن میں بیڈ منٹن کھیلا جا رہا تھا۔ فرخ اور گلرخ، سمیرا اور ریحان کے مقابل تھے۔ باقی نوجوانوں کی پارٹی داد دینے اور شور و غل سے کھیل کا حسن دوبالا کرنے میں مصروف تھی۔

موسم انتہائی خوش گوار اور صحنِ چمن میں ان جیتے جاگتے پھولوں سے بہار نکھری ہوئی تھی۔

سمیرا اور ریحان برابر جیت رہے تھے۔ گل رخ اور فرخ جھنجھلا رہے تھے۔ دیکھنے والے آوازے بھی تو کس رہے تھے ان پر۔۔۔ جھنجھلاہٹ حق بجانب ہی تو تھی۔

"پہلے کھیلنا سیکھو۔ پھر ہمارے مقابلے پہ آنا۔۔" ریحان نے چوٹ کی۔ گلرخ فرخ سے الجھ پڑی۔۔ "ٹھیک طرح سے کھیلیں نا۔۔ نہیں تو ریکٹ کسی اور کو دے دیں۔۔!"

"کھیلنا خود نہیں آتا۔۔ دوش مجھے۔۔ اس دفعہ گیم جیتے جیتے رہ گئی محض تمہاری وجہ سے۔۔"

گلرخ نے غصے سے ریکٹ پھینک دیا۔

"بس۔ ہار گئیں؟۔۔ غصے میں ہار چھپانا چاہتی ہیں۔۔"

"لیکن ایسے کون چھوڑے گا۔۔ بزدلوں کی طرح میدان نہ چھوڑو۔"

"ریکٹ سنبھالو۔۔"

"مقابلہ کر کے دکھاؤ۔"

گلرخ نے پھر ریکٹ اٹھایا۔ سب اسے اشتعال جو دلا رہے تھے۔ فرخ بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ پہ آ گئے۔

کھیل شروع ہوا۔ ریحان شوخ شوخ فقرے کس رہے تھے۔ گلرخ سخت پشیمان

تھی۔ غصے میں وہ تیز تیز کھیل رہی تھی۔
سمیرا اور ریحان مشاق تھے۔ گلرخ کا ہر وار بچا رہے تھے۔ کھیل بہت زوروں پر تھا۔
ایک وار بچاتے بچاتے سمیرا کا پاؤں الٹ گیا۔
"آہ۔۔" وہ گر گئی۔۔
سب اس کی طرف دوڑے۔ ریحان نے ریکٹ پھینک دیا اور جلدی سے اس کی طرف بڑھے۔
"کیسے گریں؟"
"چوٹ تو نہیں آئی؟"
"گلرخ نے بد دعا دی ہو گی۔"
"موچ نہ آئی ہو۔"
"اس طرح لپکنے کی کیا ضرورت تھی؟"
سب سمیرا کے گرد جمع تھے۔ کوئی کھڑا تھا۔ کوئی گھٹنوں کے بل جھکا تھا۔ وہ درمیان میں کھڑی اپنے داہنے پاؤں کو بار بار سہلا رہی تھی۔
شاہدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔
"اوئی۔۔" وہ کچھ اٹھی لیکن پھر بیٹھ کر پیر کو پکڑ لیا۔
"دو قدم چلو۔ کہیں موچ نہ آگئی ہو" ریحان نے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔ سمیرا نے جلدی سے پاؤں کھینچ لیا۔
"اٹھو نا!۔۔" فرخ نے کہا۔
شاہدہ اور گلرخ نے مل کر اسے اٹھایا۔ لیکن وہ پاؤں پر دباؤ نہ ڈال سکی۔
"دو قدم چلو نا"
"نہیں چلا جاتا۔۔"
"معمولی بات ہے۔ چوٹ ووٹ کچھ نہیں آئی۔"
"ہونہہ۔ اتنا درد ہو رہا ہے۔۔ پاؤں زمین پر رکھا ہی نہیں جاتا۔"
"نہیں کھڑی رہو گی۔ اس بنچ تک تو چلو۔۔" شاہدہ نے کہا۔
"نہیں چلا جاتا۔۔ نہیں چلا جاتا۔۔ نہیں۔۔!" جھنجھلا کر چیخی۔

"واقعی موچ نہ آگئی ہو" فرخ نے جھک کر اس کے پیر کو ٹٹولا۔
"کمرے میں لے جا کر ہی کوئی چارہ ہو گا۔"
"ڈاکٹر کو دکھادیں۔۔"
"ضرور۔۔"
"کمرے تک تو چلنا پڑے گا۔"
"لیکن وہ تو پاؤں زمین سے لگا ہی نہیں رہیں۔"
"میں اٹھا کر لے چلوں۔" اسد نے پیش کش کی۔
سمیرا الجھ گئی۔
"میرے بازو پر بار ڈال لو۔ میں لے چلوں گا" ریحان نے بازو بڑھایا۔ سمیرا شرما گئی۔
"اوہو۔" ریحان نے بازو سمیٹ لیا۔
"کوئی اور تدبیر کریں۔"
"یہ لیجیے" فرخ نے بڑھ کر سمیرا کو اٹھایا اور اس کے احتجاج کے باوجود اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔ سمیرا کے گرنے کی خبر سن کر سب اس کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سب یوں تشویش کا اظہار کر رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ سمیرا کا معاملہ تھا نا؟ لاڈلی جو تھی گھر بھر کی۔
"صبح بھی غسل خانے میں پاؤں پھسلا تھا۔" سمیرا ناز و ادا دکھا رہی تھی۔
"دوسری بار گری ہو؟" دادی نے پوچھا۔
"جی"
"اللہ جانے کس کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی صبح" فوزیہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔
"صاعقہ کا۔" ریحان نے تمسخر اڑایا۔
"واقعی؟" کسی نے پوچھا۔
"ہاں" سمیرا اٹھلائی۔
صاعقہ دادی اور چچی کے خوف سے سمیرا کو دیکھنے آئی تھی۔ ریحان کا تمسخر سن کر اس کی روح تک جل اٹھی۔ موقع پاتے ہی وہاں سے کھسک گئی۔ ریحان نے اسے دیکھا تھا لیکن اپنے الفاظ سے ندامت محسوس کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔

اس رات نوجوان پارٹی سمیرا کے کمرے میں جمع تھی۔ پاؤں میں موچ تو نہ آئی تھی۔ اپنے ہی بوجھ سے ذرا دب گیا تھا۔ اور جانے اس دن سمیرا واقعی صاعقہ کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی یا اس واہمے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے بات بنالی تھی۔

اس وقت بھی زیرِ بحث موضوع صاعقہ کی نحوست ہی تھا۔

سمیرا اور ریحان اسے منحوس ثابت کرنے میں پیش پیش تھے۔ اکثریت ان کی ہم نوا تھی۔ لیکن اسد صاعقہ کے طرف دار تھے۔ شاید اپنی والدہ انجم آرا کی تربیت کا اثر تھا یا کچھ خوفِ خدا تھا دل میں یا ہو سکتا ہے یہ وجہ ہو کہ انکے بچپن کا زیادہ حصہ الحمراء سے باہر گزرا تھا۔ وہ اکثر اپنے ساتھیوں کی تنگ نظری پر انہیں برا بھلا کہا کرتے تھے۔ صاعقہ سے انہیں ہمدردی تھی اور دن بدن یہ ہمدردی گہری ہوتی جارہی تھی۔ شاہد، نعیم اور فرخ بھی اُن کے ہم نوا بنتے جارہے تھے۔ لیکن سمیرا اور ریحان تو ان کی سرزنش سے اور بپھر جاتے تھے۔

"یہ سب توہم پرستی ہے۔۔" اس نے تنگ آکر کہا۔

"توہم پرستی کیسی؟ واقعات شاہد ہیں۔۔" ریحان نے جلدی سے کہا۔

"جس دن پیدا ہوئی، اسی دن دادا جان فوت ہوگئے" گلرخ نے واقعہ دہرایا۔

"یہ محض اتفاق تھا۔ وہ بیمار تو اک عرصے سے تھے۔" اسد نے جواب دیا۔

"کوئی ایک بات تھوڑا ہی ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد پھوپھا جان کا ہوائی حادثے میں انتقال ہوگیا۔"

"یہ بھی صاعقہ ہی کا قصور ہوا۔۔؟" اسد نے طنزیہ کہا۔

"روئی کے گوداموں میں آگ لگ جانے سے کئی لاکھ کا نقصان بھی تو ہوا تھا۔ اور پھر ظاہر ہے۔۔"

"یہ بھی صاعقہ کی وجہ سے؟"

"تو اور کیا۔۔ جب سے پیدا ہوئی ہے۔ نحوست ہی نحوست برسائی ہے۔۔"

"حد ہوگئی توہم پرستی کی۔۔" اسد بولے "حیران ہوں کہ آپ سب پڑھے لکھے ہوکر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ نانا ابا فوت ہوگئے، قصور صاعقہ کا۔۔ خالو جان کو ہوائی حادثہ پیش آیا، موردِ عتاب صاعقہ۔۔ روئی کے گوداموں میں آگ لگ گئی، الزام صاعقہ پر۔۔"

"جو کچھ بھی ہے۔۔ ہے تو حقیقت۔۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک سینکڑوں کیا ہزاروں سانحے گزر چکے ہیں۔۔"

ریحان تفصیلاً ان سانحوں کو دہرانے لگے۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے ریحان کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہوں"۔

"ان بیس اکیس سالوں میں سانحے ہی سانحے ہوتے رہے؟"

"کیا مطلب۔۔؟"

"الحمراء میں کسی خوشی۔۔ کسی خوش گوار واقعہ نے جنم نہیں لیا؟"

"کیوں نہیں۔۔"

"جب یہاں خوشیوں کے سوتے پھوٹے، اس وقت صاعقہ کی نحوست اثر انداز کیوں نہ ہوئی۔۔ شیخ پور والی اراضی کا فیصلہ بھی تو نانا جان کے مرنے کے صرف ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ صاعقہ ان دنوں اسی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ جاگیر کے سارے جھگڑے بھی تو سال بعد طے ہوگئے تھے۔ اور پھر باغوں سے کتنا منافع ہوا تھا۔ اور وہ بڑے ماموں جان کا کاروبار کب چمکا تھا۔ یہ بات بھی تو صاعقہ کے ہوتے ہوئی تھی۔ اور۔۔!"

اسد نے اک لمبی چوڑی فہرست واقعات کی بیان کر دی۔ ریحان دل میں معترف تو ہوئے لیکن زبان سے اعتراف کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے تھے۔ بچپن ہی سے احساس کی آنچ ذہنوں کو اس طرح دی گئی تھی کہ اس کا اثر دن بدن پختہ ہوتا چلا گیا تھا۔

اسد کے دلائل سے متفق ہونے کے باوجود اس بات کو ماننے کے لیے ریحان اور ان کے حواری تیار نہ تھے۔

"آپ جو کچھ بھی کہیئے، ہم تو اپنے تجربات کی بنا پر اس حقیقت کو ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ مجسم نحوست ہے۔۔" سمیرا پلنگ پر لیٹے لیٹے بولی۔

"جس دن صبح ہی صبح اس سے سامنا ہو جائے، سارا دن پریشانی میں گزر جاتا ہے۔" فرخ بولے۔

"واقعی۔۔ میں تو شومیِ تقدیر سے جس دن اسے صبح ہی صبح دیکھ لوں بس سارا دن

طبیعت بد مزہ رہتی ہے۔ دل میں دھڑکا ہی رہتا ہے کہ اب کوئی سانحہ پیش نہ آیا۔۔۔!" ریحان بولے۔

"یہ سب تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔ سوچنے کے ڈھنگ بدلو تو کچھ بھی نہ ہو گا۔" ریحان ہنس دیئے۔

"ہنسنے کی بات نہیں ریحان۔۔ ذرا اس کی جگہ اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔۔ کس قدر ناروا سلوک ہوتا ہے بیچاری لڑکی سے۔ کتنی اداس رہتی ہے۔۔ کیا اس کے سینے میں دل نہیں۔۔ دل میں جینے کا ولولہ نہیں، اتنے بھرے کنبے میں وہ تنہا ہے۔"

"اس کی تنہائیاں مٹا دو میرے دوست" ریحان نے ازراہ تمسخر اسد کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

سب نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔

"اس کی اداسیاں مٹا دو۔۔ خاموشیوں کا طلسم توڑ دو۔۔ کہو۔۔ کہو منظور ہے۔۔"

اسد چپ ہو گئے۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

گلرخ سے بچپن ہی سے متاثر تھے۔ اور اب تو گلرخ زندگی میں بہار بن کر چھا گئی تھی۔ اسد نے صاعقہ کے متعلق اس رنگ میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس سے ہمدردی ضرور تھی لیکن ہمدردی محبت کی اساس نہ تھی۔

"چپ کیوں ہو گئے استاد" ریحان نے پھر چھیڑا۔

"بڑی حمایت کر رہے تھے نا۔" فرخ نے چوٹ کی۔

"میں تو اک حقیقت کو آپ سب کے ذہنوں سے روشناس کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بات کا رخ آپ سب نے غلط طرف پھیر دیا۔۔۔" اسد خفیف سے ہو رہے تھے۔

"حقیقت ہم سب جانتے ہیں۔ اس کی پیدائش سے لے کر اب تک کتنی۔۔"

ریحان جوش میں آ کر بولے لیکن اسد نے بات کاٹ دی۔

"سب محض اتفاق ہے ریحان۔۔ اور کچھ نہیں۔۔ صاعقہ اگر پیدا نہ ہوتی تو نانا ابا کی موت نہ آتی۔ یا وہ فضائی حادثہ رک جاتا۔۔ یا۔۔!"

"صاعقہ کی پیدائش کے بعد پیدائش کا سلسلہ بند تو نہ ہو گیا تھا۔ صرف دو سال بعد سمیرا تولد ہوئی تھیں۔ ثمینہ اس سے تقریباً تین سال چھوٹی ہیں۔ عامر چار سال اور بابر سات سال چھوٹا ہے۔۔۔ حیران ہوں کہ پے در پے جو واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے

انہیں صاعقہ ہی کی ذات سے کیوں منسوب کیا گیا۔ باقی کسی کا اس ضمن میں کیوں نام نہیں لیا جاتا۔۔ حالانکہ امی نے بتایا ہے کہ جب انکے ابو کی پچھلے کمرے کی چھت گرنے سے نانی جان کے کولہے کو ضرب آئی تھی، ان دنوں سمیرا چند دنوں کی تھی۔ جب نانی جان کی بہن فوت ہوئی، عامر دو ماہ کے تھے۔۔۔"

اسد نے پھر اک لمبی تفصیل گنوا دی۔ سب چپ سے ہو گئے۔ کافی متاثر بھی نظر آ رہے تھے۔ محفل کا رنگ بدلتا دیکھ کر فرخ بولے "ہم تو سیدھی سادھی بات جانتے ہیں۔ قصور اس بیچاری کا نہیں۔ اس کا نام رکھنے والوں کا ہے صاعقہ۔" وہ ہنسے۔

"بجلی" سمیرا نے طنزیہ چوٹ کی۔

"بجلی۔۔ جہاں گری بھسم کر ڈالا" ریحان نے مذاق اڑایا۔

"واقعی۔۔ میں تو جب اسے دیکھتا ہوں رگ و پے میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی ہے۔" فرخ نے جسم کو سکیڑ کر اس انداز سے ڈھیلا چھوڑا کہ سب ہنسنے لگے۔

"دیکھو تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ بجلی کی لہر سی چلی آ رہی ہے۔" ریحان نے کہا "جھنجھناہٹ سی ہونے لگتی ہے دیکھتے ہی۔۔ صبح صبح دیکھ لیں تو سارا دن بدمزگی میں گزر جاتا ہے۔"

طنز و تمسخر کے تیر برسائے گئے۔ اسد نے بڑی کاوش سے جو حقیقت منوانے کے لیے میدان ہموار کیا تھا۔ سب نقش بر آب ثابت ہوا۔ واقعہ از ذہنوں کو منٹوں میں صاف کر دینا ممکن کہاں تھا۔

کمرے کے اندر قہقہے برس رہے تھے۔ طنز و تمسخر سے طبیعتوں کو نکھارا جا رہا تھا۔

اور

کھڑکی سے لگی کوئی اداس روح ان تیروں سے گھائل ہو رہی تھی۔

صاعقہ سب کچھ سن رہی تھی۔

کسی سے گلہ نہ تھا اسے۔

ہاں

ریحان کی زبانی اپنے متعلق ایسے کلمات سن کر اس کی مضطرب روح تڑپ اٹھی تھی۔

کتنی ہوتی۔

○



۲۴

سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ پھر بھی آنکھوں میں امنڈنے والے ساون بھادوں کے بادل برستے ہی جا رہے تھے۔ حسین سیاہ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

وہ دیر سے رو رہی تھی۔ کانوں میں پگھلتے ہوئے گرم گرم سیسے کی طرح فوزیہ کے الفاظ اب بھی ٹپک رہے تھے۔

"ماں تو ساری عمر گھڑے اٹھاتے مر گئی۔ بیٹی اتنی نازک ہے کہ چائے کی پیالی نہیں اٹھائی جاتی۔۔"

کتنا بڑا طعنہ دیا فوزیہ چچی نے۔۔ سب کی موجودگی میں۔۔ سب کے سامنے اس کی کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔ صاعقہ کا خون ایک دم اس طرح کھول اٹھا تھا کہ چند لمحے اگر اور یہی کیفیت رہتی تو اس کی دماغی نسیں یقیناً پھٹ جاتیں۔

اس طعنے پر سرزنش کرنے کی بجائے سب کے چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ بھی تو پھیل گئی تھی۔

اف وہ جلتی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ۔

صاعقہ اس زہر آلود طنز بھری مسکراہٹ سے اپنی روح میں شگاف محسوس کر رہی تھی۔ کاش ماں باپ کے ساتھ اسے بھی موت آ گئی ہوتی۔ اس روز کی موت کا سامنا کتنا دشوار تھا۔ اس جلتے جہنم میں رہتے ہوئے وہ تنگ آ چکی تھی۔

بے رحم باتیں!

اہانت آمیز سلوک!

آخر وہ بھی تو انسان تھی۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی۔ سینے میں دل بھی تھا جو احساسات کی آنچ رکھتا تھا۔

آج فوزیہ چچی نے کس طرح اس کا سینہ چھلنی کیا تھا۔ کوئی ہمدرد بھی تو نہ تھا جو اُن

زخموں پر پھایا رکھ دیتا۔ اگر کسی نے دل میں کسک محسوس بھی کی ہو تو دادی کی موجودگی میں اظہارِ ہمدردی کی جرأت نہ ہو سکی۔

آج سہ پہر ہی کا تو واقعہ تھا۔

دادی اماں کے حکم پر چائے بیرونِ چمن میں پی گئی تھی۔ موسم رومانوی حد تک حسین تھا۔ پچھلے پہر کی زرد دھوپ آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی وجہ سے کچھ بیمار سی مضمحل نظر آتی تھی۔ نحیف۔۔ کمزور۔۔ دھوپ بڑی دلکش تھی۔

درختوں کی چھاؤں تلے چائے کی میزیں سجی تھیں۔ کنیزیں چائے کی کشتیاں لا کر رکھ گئی تھیں۔ ایک طرف دادی حسن بانو کے قریب سعدیہ، فوزیہ اور حسن آرا بیٹھی تھیں۔ ذرا ہٹ کر کین کی رنگ برنگی کرسیوں پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سمیرا نے شوخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے جو موسم اور چمن کی مناسبت سے دلکش نظر آ رہے تھے۔ اس کا حسین چہرہ نکھرا نکھرا سا تھا۔ باقی لڑکیوں نے بھی رنگ برنگے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ شوخ شوخ بھڑکیلے لہنگوں کے دیدہ زیب پھیلاؤ اور رنگین آنچلوں کی سمٹی سکڑتی اڑانیں چمن کی فضا کو فردوسی تاثر بخش رہی تھیں۔ سفید لباس میں صاعقہ ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس کا ملکوتی حسن کچھ انفرادی کشش لیے ہوئے تھا چہرے پر پھیلی ہوئی دائمی اداسیاں بادلوں کی ہلکی سی تہہ کی طرح تھیں جو پورے چاند پر چھا کر اس کی دلکشی میں اور اضافے کا باعث بن جاتی ہیں۔ سلگتا ہوا حسن بھی قیامت اٹھا سکتا تھا۔ لیکن کسی کو اس کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ سمیرا کے گرد سب منڈلا رہے تھے۔ اسے بھلا کون پوچھتا۔

بیباک ہنسیاں دادی حسن بانو سے مرعوب تھیں۔ لڑکیوں کے خواہ مخواہ ہنسنے پر انہیں غصہ آ جاتا تھا۔

چائے بنانے کی ذمہ داری صاعقہ پر آئی۔ دادی نے حکم دیا تھا۔ اور اس حکم سے سر تابی کی اسے مجال کہاں تھی۔

اس نے چائے بنائی۔ ثمینہ نے بڑھ کر اسکا ہاتھ بٹایا۔ وہی تو تھی جو دل میں صاعقہ کے لیے اکثر ہمدردی کا جذبہ پا کر بے چین ہوا کرتی تھی۔ بڑوں کو چائے دینے کے بعد صاعقہ نے نوجوان پارٹی کی طرف رجوع کیا۔

نعیم۔۔ فریدہ۔۔ گلرخ اور فرخ کو پیالیاں دینے کے بعد وہ پیالی لیے سمیرا کی طرف بڑھی۔

شوخ لہنگے کو سبزے پر پھیلائے سمیرا اک ساختہ شانِ دلربائی سے کرسی پر نیم دراز سی تھی۔

صاعقہ نے پیالی بڑھائی۔

سمیرا نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے اک شانِ استغناء سے ہاتھ بڑھایا۔ صاعقہ سے بری طرح پیش آنے اور اہانت آمیز سلوک کرنے میں سمیرا نے ہمیشہ پیش قدمی کی تھی۔ شاید ماں کی تربیت کا اثر تھا یا دادی کے لاڈ پیار کا یا اپنی ذات میں ریحان کی دلچسپی کا۔ بہر حال وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی تھی۔ بہت کچھ۔۔۔! صاعقہ اس کی نظروں میں کیا وقعت پا سکتی تھی۔ مغرور سی لڑکی صاعقہ سے سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔

صاعقہ نے پیالی اور آگے بڑھائی۔

سمیرا نے نازک ہاتھ اور نزاکت سے بڑھایا۔

اور

عین

اسی وقت

ریحان مسکراتے ہوئے درختوں کے عقب سے یوں نکلے جیسے گھمبیر بادلوں کے ہٹ جانے سے چودھویں کا چاند نکل آیا ہو۔

سمیرا اور صاعقہ کی بیک وقت نگاہ ان پر پڑی۔

صاعقہ کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔۔۔ ریحان نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان کے لبوں کا تبسم کچھ اور گہرا ہو گیا۔

اور

جانے

سمیرا اس تبسم سے لہرائی

یا

صاعقہ نگاہوں کی بے درد بیگانگی سے کانپی

پیالی پکڑتے اور پکڑانے کے درمیان درمیان الٹ گئی۔

گرم گرم چائے صاعقہ کا ہاتھ جلاتی سمیرا کے ہاتھ پر گری اور پیالی لہنگے کے پھیلاؤ پر پھسلتی گھاس پر جا گری۔

"آہ!۔۔" سمیرا تڑپ کر چیخی۔

"اف۔۔" اک ہلکی سی چیخ صاعقہ کے ہونٹوں پر تھرائی۔

ریحان لپکے۔۔ شاہرخ دوڑی۔۔ نعیم بڑھے۔۔

"کیا ہوا۔ کیسے گری چائے؟۔۔" کئی زبانیں استفسار کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد سارا ہجوم سمیرا اور صاعقہ کے گرد تھا۔

ریحان سمیرا کا نرم و گداز ہاتھ اپنے رومال سے پونچھ رہے تھے۔ سمیرا ضرورت سے زیادہ ہائے وائے کر رہی تھی۔

صاعقہ کا ہاتھ جل گیا تھا لیکن وہ دم بخود تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ اپنی تکلیف کو چھپانے کی کوشش میں تھی۔

"کیسے گرائی تھی چائے" فوزیہ بیٹی کا ہاتھ دیکھ کر بپھری۔

"اتنی بد احتیاطی۔۔" سعدیہ بولی۔

"وہ خود کہیں ہوتی ہیں۔۔ دماغ کہیں۔۔ ان سے چائے بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" ریحان سمیرا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے غصے سے بولے۔

"اس لڑکی سے کبھی ڈھنگ کا کام تھوڑا ہی ہوگا"۔

"جو کام بھی کرے گی عجب لاپرواہی سے۔"

"نزاکت تو دیکھو اتنی سی پیالی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔"

"جان بوجھ کر گرائی ہوگی۔"

دادی، چچیاں اور پھوپھی زہر کے تیر برسا رہی تھیں۔ صاعقہ سب کے درمیان مجرم کی طرح کھڑی تھی جیسے موقع واردات پر ہی پکڑ لیا گیا ہو۔

"دیکھو ہاتھ پر آبلے تو نہیں پڑ گئے" سعدیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دوائی لگادو۔۔"

"جاؤ ریحان دیکھ کیا رہے ہو۔ دوائی لاکر لگادو۔ کہیں آبلے نہ پڑ جائیں۔"

ریحان دوائی لینے کے لیے چلے گئے۔

طنز کے تیر پھر برسنے لگے۔

"اس کا اپنا ہاتھ بھی تو جل گیا ہے" ثمینہ نہ رہ سکی۔

"دکھاؤ تو۔۔" شاہدہ نے کہا۔

لیکن صاعقہ اسی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے کو دبائے گم سم سی کھڑی رہی۔ البتہ اتنے ہجوم میں۔۔ بے رحم ہجوم میں ثمینہ اور شاہدہ کی ہمدردی سے اس کا دل بری طرح بھر آیا۔

آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح اس کے صبیح و ملیح رخساروں پر پھیلنے لگے۔

"رونا بڑی جلدی آجاتا ہے۔ ایک تو قصور کیا، اس پر یہ آنسو۔۔" سعدیہ نے ناک بھوں چڑھائی۔

ریحان دوائی لے آئے۔

روئی سے سمیرا کے ہاتھ پر لگادی۔

"یہاں بازو پر بھی لگادو۔" فوزیہ نے کہا۔۔ اور پھر بڑبڑائی۔

"سارا داغ پڑ جائے گا۔۔ کم بخت نے گرائی جانے کیسے۔۔ اتنی نازک اندام ہے۔۔ ماں تو ساری عمر گھڑے اٹھاتے مر گئی۔ بیٹی اتنی نازک ہے کہ چائے کی پیالی اٹھائی نہیں جاتی۔"

صاعقہ کا خون اس طنز سے کھول اٹھا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ اک نظر اس نے اپنے گرد و پیش ڈالی۔۔ فوزیہ کے طنز پر تقریباً سبھی چہرے مسکرا اٹھے تھے۔

"اُف" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

یہ تحقیر

یہ تذلیل۔۔

کانوں پر ہاتھ رکھے وہ ایک دم پلٹی۔۔

اور

تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

جب سے اب تک وہ رو رہی تھی۔

آپا نے اپنے پیار کی شفقتوں سے کئی بار اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

اتنا بڑا طعنہ اور وہ بھی ریحان کی موجودگی میں وہ کیوں کر برداشت کر لیتی۔

تھاسادل کتنے مصائب برداشت کر لیتا۔
وہ رو رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ ساری زندگی آنسو بن کر ختم ہو جانا چاہتی تھی شاید۔۔

ہاتھ کی جلن سے کہیں زیادہ اس کے سینے میں جلن تھی۔ اس کی روح میں جلن تھی۔
آہ بے چاری۔۔۔ مظلوم سی لڑکی۔۔۔

O

(۲۵)

شوخ وشنگ پھول اور چکیلی شرمیلی کلیاں حسن بانو کی پھلواری میں مہک رہی تھیں۔ بہار جوبن پہ تھی۔ حسن بانو کو اس پھوٹتے جوبن کا پوری طرح احساس تھا۔ اسی لیے چاہتی تھیں کہ رنگ و بو کی مناسبت سے پھولوں اور کلیوں کو ابدی بندھن میں باندھ دیں۔ انجم آرا بھی اسی سلسلے میں ان دنوں آئی ہوئی تھیں۔

حسن بانو کی نشست گاہ میں رازدار محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔۔ تقدیر کی گرہیں لگانے کے متعلق سوچ بچار جو ہوتا تھا۔

اس دن بھی اک ایسی ہی محفل منعقد تھی۔ حسن بانو کسی مطلق العنان فرمانروا کی طرح اک تمکنت سے مسند پر بیٹھی تھیں۔ دائیں طرف حسن آراء اور سعدیہ تھیں' سامنے فوزیہ بیٹھی تھی۔ اور پشت کے تکیے پر کہنی ٹکائے انجم آرا ماں کے قریب تر تھیں۔

رشتوں، ناطوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کئی پچھلے قصے جگائے جا رہے تھے۔ شادیوں کی دھوم دھام کا تذکرہ تھا۔

تقدیروں کے فیصلے ہو تو چکے تھے۔ اب صرف حسن بانو کی مہر ثبت ہونا باقی تھی۔ بچوں کے رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گرہیں لگائی جا رہی تھیں۔

"گلرخ تو میری بیٹی ہے" وہ اسد کے لیے انجم آرا نے مانگ لی۔

"نعیم اور شاہدہ کی جوڑی ماشاءاللہ خوب رہے گی۔ میں نے تو پیدا ہوتے ہی نسبت کر دی تھی شکر ہے اللہ کا، میرا خیال کامیاب نکلا۔" حسن بانو بڑی تمکنت سے بولیں۔

"امی" حسن آرا نے شوخ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔
"ہوں"
"آپ نے اپنے لاڈلے کے متعلق تو کچھ فرمایا ہی نہیں۔"



"ریحان کے متعلق"

"جی"

"وہ تو طے شدہ بات ہے۔"

"کس سے؟"

"اب بنتی کس لیے ہو۔۔ سمیرا اور ریحان کا جوڑا ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہوگا۔"

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ"

"ریحان تو ماشاءاللہ چھبیس سال کے ہو بھی چکے۔ اس سال اس کار خیر سے فارغ ہو ہی جانا چاہیئے۔"

"انشاءاللہ اس عید پر ان کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا۔"

"ایک پنتھ دو کاج۔"

"وہ کیوں"

"عید کے جشن پر"

"توبہ کرو۔ اپنے بچے کی منگنی کا وہ شان دار جشن مناؤں گی کہ سب یاد کریں گے۔۔ عید پر میرا مطلب تھا اس چاند میں۔۔"

"تو یہ بات ہے۔"

"ہونا ہی چاہیئے۔"

"خاندان کے پہلے پوتے ہیں۔"

"اور دادی کے نور نظر بھی۔"

ریحان کی نسبت کے متعلق کافی باتیں ہوتی رہیں۔ فوزیہ تو خوشی سے جیسے ہوا پر سوار ہی تھی۔ سعدیہ بھی کچھ کم خوش نہ تھی۔ ارادہ تو دونوں بہنوں کا شروع ہی سے تھا لیکن جب تک ساس کی مہر تصدیق ثبت نہ ہوتی، انہیں پورا یقین اور خوشی نہ تھی۔ انجم آرا بھی اس خوشی میں برابر کی شریک تھیں۔ اپنے ہی بچے بچیاں تھے۔ خوشی کیوں کر نہ ہوتی۔ لیکن اس گہما گہمی میں انہیں برابر صاعقہ کا خیال آرہا تھا۔ جشن کے پروگرام میں کافی دیر بحث ہونے کے بعد جب قدرے خاموشی ہوئی تو انہوں نے بات کا رخ پھیرا۔

"صاعقہ کے متعلق کیا سوچا ہے امی آپ نے؟"

حسن بانو نے جواب تو نہ دیا لیکن وہ متفکر ضرور نظر آنے لگیں۔ فوزیہ اور سعدیہ کے ماتھے پر شکنیں آگئیں گویا ان مسرت آگیں لمحوں میں اس کا نام سننا بھی گوارا نہ ہو۔

حسن بانو سمجھ نہ پاتی تھیں کہ اس بیل کو کس کے سر منڈھیں۔ اکثر اس کے متعلق سوچتی رہتیں لیکن سوچ جھنجھلاہٹ میں بدل جاتی اور انہیں لاشعوری طور پر محسوس ہونے لگتا جیسے ناجی جاتے جاتے اپنے انتقام کی میخ صاعقہ کی صورت میں ان کے سینے میں پیوست کر گئی ہے۔

بیس

متواتر بیس سالوں سے برابر چبھے جا رہی ہے۔

اور

جسے

نکال پھینکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

"بیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ سوچنا چاہیئے۔۔" انجم آرا ماں کو خاموش پا کر بولیں۔

"رشتہ تو آرہا ہے۔ سوچنا کس بات کا ہے اب" فوزیہ نے ناک چڑھا کر کہا۔

"کونسا رشتہ؟" انجم آرا جانتے ہوئے بھی پوچھ رہی تھیں۔

"وہی نواب ہادی کا۔۔" سعدیہ نے بھی بڑے بیگانہ انداز میں کہا۔

"توبہ کرو۔۔ کچھ تو خوفِ خدا دل میں ہونا چاہیئے۔" انجم آرا ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اس میں خوفِ خدا کی کیا بات ہے۔ وہ خواہش مند، پیسے والا آدمی ہے۔۔" حسن آرا نے کہا۔

"عمروں کا فرق۔۔ دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہے۔ کردار کون نہیں جانتا اس کا شراب کے بغیر ایک دن بھی نہیں جی سکتا۔۔" انجم آرا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تو پھر کیا کیا جائے" حسن بانو پہلی مرتبہ بولیں۔۔ "کہیں تو ٹھکانے لگانا ہے اسے۔"

"اس طرح تو کوئی بوجھ بھی نہیں اتار پھینکتا امی۔۔" انجم آرا کو ماں پر غصہ بھی آیا، دکھ بھی۔۔ "آخر اپنا ہی خون ہے۔ بن ماں باپ کے بچی ہے۔"

"خود تو جانے کہاں دفع دفان ہوگئی۔ یہ عمر بھر کا روگ میرے گلے ڈال گئی۔" حسن بانو غصہ سے بڑبڑائیں۔

"صرف ناجی ہی کی نہیں۔ صاعقہ طاہر کی بھی بچی ہے۔" انجم آرا نے آہستگی سے کہا۔

"بڑی ہمدردی ہے اس سے؟" سعدیہ نے طنز کیا۔

"بھائی کا جگر گوشہ ہے۔ ہمدردی کیوں نہ ہو۔" انجم نے جواب دیا۔

"تو پھر تم ہی سوچو اس کے متعلق۔۔ نواب ہادی سے کرنے کو تم تیار نہیں اور کون اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہوگا۔ اس کی منحوس ذات سے تو لوگ دور بھاگتے ہیں۔ کون استاد ل گردہ لائے جو اسے بیاہ لے جائے۔"

"یہ سب آپ لوگوں کی بے بنیاد توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ رسوا کر دیا ہے بچی کو۔۔" انجم غمزدہ نظر آرہی تھیں۔

"اتنی ہی ہمدردی ہے تو اپنے نعیم سے کرلیں یہ رشتہ" فوزیہ نے طنز کیا فوزیہ کی چوٹ پر انجم چپ ہوگئیں۔

اور اس چپ پر سب نے اک ملا جلا قہقہہ لگایا۔

"جب گھر کی طرف بات آئی تو چپ ہوگئیں۔ ہرج ہی کیا ہے۔ بھتیجی ہے۔ اپنا خون ہے۔ مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔" سعدیہ زیرِ لب مسکرا رہی تھیں۔

"کاش یہ بات میرے بس میں ہوتی۔"

"تمہارے بس میں کیونکر نہیں۔"

"آپ لوگوں کی عنایت سے۔"

"وہ کیوں کر۔۔؟"

"آپ نے جو اس کے اردگرد توہم پرستی سے نحوست کے جال بُن دیے ہیں۔"

"لیکن تم تو اس خیال سے متفق نہیں۔"

"بے شک"

"پھر کیا ہرج ہے؟"

"صرف میری بات ہوتی تو آپ لوگوں کے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میری مجبوری آپ سبھی جانتے ہیں۔ سسرال والے تو اس کے نام سے خوف کھاتے ہیں۔ اور لوگ۔ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اس بیچاری کا نام سنتے ہی۔۔۔ یہ سب آپ لوگوں کی مہربانی

ہے۔ اتنا ناروا سلوک اس سے شروع ہی سے کیا گیا کہ اس کی ذات اب نحوست کا جلتا ہوا نشان سمجھا جانے لگی۔ آپ سب نے بھی تو اس سلسلے میں اسے رسوا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اتنا سوچا ہوتا کہ کل کو جوان ہو جائے گی، کہیں اسے بھی بیاہنا ہوگا۔۔"

انجم آراء نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔۔ لیکن اس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔ اچھی خاصی نوک جھونک ہونے لگی۔ اکیلی انجم چاروں کا کہاں تک مقابلہ کرتیں۔

بات ہر پھر کر نواب ہادی پر ٹھہرتی۔ کئی دن یہ جھگڑا چلتا رہا حسن بانو کو سینے کی میخ نکال پھینکنے کا موقعہ مل رہا تھا۔ لیکن انجم سدِ راہ تھیں یہ ظلم تھا اک مظلوم اور بے زبان لڑکی پر۔ وہ یہ ظلم اپنی زندگی میں نہ ہونے دیں گی۔

فخر بھائی بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ان کی بیوی فوزیہ جتنا صاعقہ سے جلتی تھی، انہیں اتنی ہی ان سے محبت تھی۔ لیکن اس محبت کا اظہار بیوی کی سخت گیری کو دیکھتے ہوئے کر نہ پاتے تھے۔

انجم اور فخر نے ماں کو مجبور کیا اور مناسب رشتے کی تلاش جاری رکھنے کے وعدہ پر یہ بلا صاعقہ کے سر سے ٹل گئی۔

○

٣٦

برآمدے میں ریحان، اسد، نعیم اور نوید کے ہمراہ کھڑے تھے۔ کہیں باہر جانے کا پروگرام تھا۔ باقی ساتھیوں کا انتظار ہو رہا تھا۔

ریحان فاختئی رنگ کا سوٹ زیب تن کیے تھے۔ جوان کے حسین چہرے پر بے طرح اٹھ رہا تھا۔ شہزادوں کی سی روایتی شان ان کے انداز سے مترشح تھی۔ پُر وقار سے نظر آ رہے تھے۔

اسد کے ہاتھ میں اخبار تھا اور نعیم کے ساتھ وہ سیاسی گفتگو میں مشغول تھے۔ نعیم اور ریحان برآمدے کے آخری سرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی سستی کو کوس رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شاہد، سلیم اور لطیف بھی آ پہنچے۔ سب نوجوان خوش شکل اور خوش پوش تھے۔ آپس میں دور نزدیک کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ الحمراء میں پلے بڑھے تھے۔ رشتہ داری سے زیادہ دوستی کے بندھن تھے۔ جوان سب کو آپس میں جکڑے ہوئے تھے۔ بے تکلف دوستی بھی تو اک نعمت ہے۔

"فرخ نہیں آئے ابھی؟"

"بڑی دیر کر دی"

"اس کا تو انتظار ہی فضول ہے۔"

"آپ لوگ کے لیے گھنٹوں چاہئیں۔"

"لڑکیوں کو بھی مات کر دیا ہے ہار سنگھار کرنے میں۔"

"سخت غصہ آتا ہے۔"

"چلنا چاہیئے۔"

"تم جا کر دیکھو۔ کیا کر رہے ہیں۔"

لطیف جانے والے تھے کہ فرخ نے دور ہی سے ہاتھ ہلایا۔

"آگیا۔ میں۔ ۔ ۔ آگیا۔ ۔"

"شکر ہے" کئی آوازیں جواب میں تھیں۔

فرخ تقریباً بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کی حرکت کسی بے پناہ خوشی کی غماز تھی۔

"ہُرّا" فرخ پھلانگتے ہوئے دوستوں تک پہنچے۔

"کیا ہوا؟" فرخ کا شوخ تبسم دیکھ کر سب نے پوچھا۔

فرخ تیزی سے بڑھتے آ رہے تھے۔

"ارر۔ ۔ یونہی بغیر بریک کی گاڑی کی طرح چڑھتے چلے آ رہے ہو کچھ کہو بھی ا۔ ۔"

ریحان نے فرخ کا کندھا پکڑ کر اپنے برابر کھڑا کر لیا۔

"ایک خوش خبری"

"کہاں سے اڑا لائے؟"

"پہلے منہ میٹھا کراؤ۔ ۔"

"کون؟"

"آپ" ریحان کی طرف دیکھ کر فرخ مسکرائے۔

"تو گویا خوش خبری میرے لیے ہے؟"

"بالکل سولہ آنے۔ ۔"

"اب کہہ بھی چکو!"

"اوں ہونہہ"

"بڑی بری عادت ہے تمہاری۔ ۔"

"جو جی میں آئے کہہ لو لیکن منہ میٹھا کرائے بغیر کچھ نہ کہوں گا۔"

سب کا تجسس بڑھ گیا۔ فرخ کے گرد جمع ہو کر سب باری باری پوچھنے لگے لیکن انہیں چڑانے میں لطف آ رہا تھا۔

"بس اب بہت بور ہو چکے۔ کہنا ہے تو کہو۔ نہیں تو چلو۔" ریحان نے قدم اٹھایا۔

"ٹھہریئے۔ ۔ ٹھہریئے" اسد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ریحان کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

سمجھ دوں" فرخ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔
"ہاں" نعیم بولے۔
"مٹھائی؟"
"ادھار"
"تو سنیئے۔۔"
سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ریحان قدرے لاپروائی کا انداز اختیار کیے تھے۔
"عید کے تیسرے دن اک جشن منایا جا رہا ہے۔۔" فرخ چبا چبا کر چپ ہو گئے۔ سب فرخ کے پیچھے پڑ گئے۔
"یہ کون سی بڑی بات ہے؟"
"اور اس کا ہماری ذات سے کیا تعلق؟" ریحان بولا۔
"آپ ہی کے لیے تو جشن منایا جا رہا ہے۔"
"میرے لیے؟"
"ہاں جناب کی منگنی کا سرکاری طور پر اعلان ہو گا اس دن۔۔"
"سچ" کئی چہرے مسرت سے سرخ ہو گئے۔ ریحان بھی اک انداز دلربانہ سے زیر لب مسکرا دیئے۔
"تمہیں کس نے کہا؟" فرید نے پوچھا۔
"بندہ پرور، ان کانوں سے خود سن کے آیا ہوں۔ نانی حضور نے آخری فیصلہ دے دیا ہے۔"
"اچھا تو یہ راز دار محفلیں اسی لیے ان کی نشست گاہ میں ہر روز ہوا کرتی تھیں۔" شاہد بولے۔
"کچھ ہمارے متعلق نہیں فرمایا۔" اسد نے منہ بنایا۔
"اور ہمارے۔۔۔" نعیم آگے کو جھک کر لپکے۔
سب اشتیاق سے فرخ کو کرید رہے تھے۔ ریحان مستانہ نظروں سے سب کو دیکھتے ہوئے کھڑکی میں ٹیک لگائے دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔
"تم نے یہ باتیں سنیں کیسے؟"
"ساتھ والے کمرے میں تھا نسبت۔۔ نسبت دو چار بار کانوں سے ٹکرایا۔ اپنے

کان کھڑے ہو گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ خیال تھا کچھ اپنے متعلق سن پاؤں گا۔ بڑی مخبری کی لیکن پلے یہی پڑا کہ ریحان کی نسبت کا اعلان عید کے تیسرے دن جشن میں کر دیا جائے گا۔۔ اپنا تو بھولے سے بھی کسی نے نام نہ لیا۔۔ چلو انہی کی خوشی کے سہارے جی لیں گے۔۔" فرخ منہ بسور بسور کر کہہ رہے تھے۔ سب ان کی اداکاری کی داد ہنس ہنس کر دے رہے تھے۔
"کیا باتیں بنا رہے ہو۔" ریحان نے ہاتھ بڑھا کر ان کی گردن پکڑ لی۔
"اف۔۔" فرخ نے منہ بنایا۔ "ایک تو آپ کے لیے خوش خبری لایا۔ لیکن یہ سزا۔۔"
"خوش خبری تو اٹھا لائے یہ بھی سن آئے کہ وہ کون خوش نصیب ہے جسے مابدولت کے پلے باندھا جا رہا ہے؟"
"ہاں ہاں یہ تو تم نے بتایا نہیں۔۔" تقریباً سب نے تجسس ظاہر کیا حالانکہ ریحان خود اور باقی سبھی جانتے تھے کہ وہ خوش نصیب سمیرا کے سوا اور کوئی نہیں۔
اچانک فرخ کو شرارت سوجھی۔
"یہ بھی بتا دوں۔۔؟"
"یہی تو بتانے کی بات تھی۔"
"تو سنو۔۔ دل تھام کر سنو۔"
"دل تھام کر کیوں۔"
"بات ہی ایسی ہے۔"
سب کے چہروں پر تجسس کی لہریں گہری ہو گئیں۔ ریحان کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔
"بتا دوں یہ نسبت کس سے قرار پائی ہے؟"
"ہاں"
"صاعقہ سے۔"
"صاعقہ۔۔" آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ سب فرخ کو گھور رہے تھے۔
ریحان تو گنگ سے ہو گئے۔ گھڑی بھر پہلے کا شوخ مجسم سنجیدگی کی گہرائیوں میں

ڈوب گیا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" جانے کس نے کہنے کی ہمت کی۔
"کیوں نہیں ہو سکتا؟"
"لیکن۔۔"
"لیکن ویکن کیا۔ مابدولت نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور پھر ہرج بھی کیا ہے۔"
"چپ رہو جی" ریحان کو غصہ آگیا۔
"مجھے کیوں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ یہ نانی حضور کا آخری فیصلہ ہے۔"
"فیصلہ میری مرضی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اس کا نام اپنے نام کے ساتھ سننا تک گوارا نہیں کر سکتا۔"
"ریحان تو صاعقہ کے ازلی دشمن ہیں۔"
"دشمنی کی کیا بات ہے۔ سارے کنبے میں اس کا دوست کون ہے۔ یہ بلا میرے لیے ہی رہ گئی تھی۔ اس کی ماں کا حسب نسب۔۔"
"اوہو۔۔ ہو۔۔" فرخ نے چھیڑا۔
"میں ابھی دادی حضور کے پاس۔۔" وہ جانے کے لیے غصے میں بڑھے۔
"نہ۔۔ نہ۔۔ نہ بابا۔۔ کیوں مجھے جہنم رسید کرنے کا ارادہ ہے۔۔" فرخ نے بڑھ کر راستہ روکا اور دھکیل کر انہیں پھر کھڑکی کے ساتھ کھڑا کر دیا۔
"میں مذاق کر رہا تھا۔ آپ رونے لگے۔"
"بے وقوف۔۔"
"صاعقہ نہیں بھائی کوئی اور ہے بس۔۔ اب تو خوش ہو جائیے" فرخ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بولے۔
"اب تو باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔" فرید نے خوش ہو کر کہا۔
"نام تو پوچھو پہلے۔"
ریحان ہنس کر بولے۔ "صاعقہ کے علاوہ ہر نام گوارا ہے۔ کوئی خاص قید نہیں۔"
"خواہ وہ نہ۔۔ہو۔۔ہو؟" فرخ نے مذاق سے خانساماں کی بھینگی لڑکی کا نام لیا اور۔۔

"ریحان!"
"میں بھی حیران تھا یہ ہو کیسے سکتا ہے۔" نعیم قدرے توقف کے بعد بولے۔
"بالکل۔۔ دادی اماں اپنے چہیتے پوتے کے متعلق اتنی شدید غلطی کیسے کر سکتی ہیں۔ ہماری تمہاری بات تھوڑا ہی تھی۔"
"اگر صاعقہ سے نسبت قرار پا بھی جاتی تو کیا مضائقہ تھا۔" فرخ نے شوخ نظروں سے ریحان کی طرف دیکھا۔ جو کھڑکی سے کمر ٹکائے بڑے شگفتہ نظر آ رہے تھے۔
"کچھ بھی نہیں۔۔" فرید بھی شوخی سے بولا۔
"شکل و صورت کا تو مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔" فرخ بولے۔
"یہ بات غلط تو نہیں" اسد نے حمایت کی۔
"تھوڑی سی منحوس ہے بس۔۔" فرخ نے چھیڑا۔
"بھئی نحوست تو خیر برداشت کر بھی لی جاتی۔۔" ریحان چہکے۔ "لیکن۔۔"!
"لیکن کیا؟" سب متوجہ تھے۔
"لیکن ایک بات بڑی خطرناک تھی" وہ اسی مسرور انداز میں لہک کر بولے۔
"وہ کونسی"
"اگر ماں کی طرح وہ بھی بھاگ جاتی تو طاہر چچا کی طرح جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔" ریحان کے مذاق اڑانے پر اک قہقہہ پڑا۔
"ہمیں اپنی زندگی درکار ہے بھئی۔ اسی لیے اس کا نام سن کر خوف آگیا تھا۔۔ نہ بابا۔۔" سب ہنس دیئے۔
اور عین اسی وقت اسد نے انہیں کمر میں ٹہوکا دے کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
"کیوں؟"
اسد نے انگوٹھے سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اک لمحہ پہلے انہیں صاعقہ کا سایہ اندر نظر آیا تھا۔
ریحان نے مڑ کر برق کی سی تیزی سے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔
اور
وہ جیسے
سکتے میں آ گئے۔

کھڑکی کے پٹ کے قریب صاعقہ کھڑی تھی۔

اس کی حسین شبنمی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ جنہیں وہ بہ ہزار دقت پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ریحان کی نظریں ان دھندلائی آنکھوں سے ملیں۔

ان آنکھوں میں اک بیچارگی تڑپ رہی تھی۔

اک استفسار مچل رہا تھا۔

اک شکایت سلگ رہی تھی۔

اک لمحہ

صرف اک لمحہ کے لیے نظریں ملی تھیں۔

پھر صاعقہ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے چلی گئی تھی۔

لیکن

اک لمحہ

یہ سلگتا ہوا اک لمحہ زیست کے سینے پر ایسا داغ چھوڑ گیا جسے مٹانا ریحان کے بس میں نہ رہا۔

(۲۷)

"کیا ہوا"

"کون تھا"

"یوں کیوں کھڑے ہو۔۔۔۔"

ریحان کو یوں ہراساں کھڑا دیکھ کر سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ شاہد نے تو کمرے میں جھانک کر بھی دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"ایک دم سانپ سونگھ گیا۔" نعیم نے ریحان کا کندھا ہلایا۔

"کیا بات ہے؟" فریدہ نے پوچھا۔

ریحان کچھ نہ بولے۔ کچھ کھوئے سے کھڑے تھے۔

"صاعقہ تھی نا اندر" اسد نے کہا۔

"ہاں" ریحان جیسے خواب میں بڑبڑائے۔

"اس نے تمہاری بکواس سن لی ہوگی۔"

"ہوں"

"کتنی بری بات ہے۔"

"ہاں"

"میں کب سے اشارے کر رہا تھا۔ لیکن تم سنتے ہی کب تھے۔ اونچی ہانکے جا رہے تھے۔"

"توبہ کیا بکواس کر رہے تھے ہم سب۔۔۔۔ اگر اس نے سن لیا ہے تو بہت بری بات ہے۔"

"یقیناً سن لیا ہے۔"

"اُف واقعی بڑی بری بات ہے۔"

سب متاسف سے نظر آرہے تھے۔ باری باری اپنے تاسف کا اظہار کرنے لگے۔
"آپ سب اسے انسان تھوڑا ہی سمجھتے ہیں۔ پتھر سمجھ رکھا ہے پتھر۔" اسد کو غصہ آگیا۔
"لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ اندر ہماری باتیں سن رہی ہے۔۔" فرید ہچکچاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
"ایسی باتوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔" اسد نے کہا۔
سب باری باری ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے لیکن ریحان چپ چاپ کھڑے تھے کسی پتھرائے ہوئے انسان کی طرح۔ ذہن میں وہ ڈبڈبائی آنکھیں۔۔۔ دھندلائی آنکھیں تحرک رہی تھیں۔
آنکھیں!

جن میں زمانے بھر کی بیچارگی تھی۔
جن میں دنیا بھر کا استفسار تھا۔
جن میں جہاں بھر کی شکایت تھی۔
جیسے کہہ رہی ہوں
میری ماں بھاگ گئی تھی تو میرا کیا قصور۔
جیسے پوچھ رہی ہوں
یہ پرانے قصے میری ذات سے کیوں منسوب کرتے ہو۔
جیسے یہ شکایت کر رہی ہوں۔
مجھے جلن کے سوا اور بھی کبھی کچھ دیا ہے تم نے۔
ریحان ان شبنمی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں گم تھے۔
اور

سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔
"چلو کوئی قیامت ٹوٹ پڑی۔" فرخ نے بیٹھک آکر کہا۔ "اتنا فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" نسیم نے ریحان کا کندھا ہلایا۔
ریحان نے واقعی لاکھوں مرتبہ اسے تختۂ تضحیک بنایا تھا۔ اسے کوسا تھا۔ برا بھلا کہا تھا۔ لیکن آج۔۔۔ آج تو۔۔۔ جانے کیا ہوگیا تھا۔۔۔ کوئی نئی بات وقوع میں

آئی تھی۔
شاید
نئی بات ہی تھی۔
ریحان کا مذاق ہمیشہ صاعقہ کی ذات سے وابستہ نحوست تک ہی ہوتا تھا۔ ان کا تنفر بھی اسی سے تھا۔ لیکن آج۔۔۔ آج انھوں نے اخلاقی اقدار کو لتاڑ کر اس پر ایسا حملہ کیا تھا۔ جس سے وہ اپنی نظروں میں آپ ہی مجرم بن گئے تھے۔
ان جھلملاتی آنکھوں نے انھیں اس جُرم کا شدت سے احساس دلا دیا تھا۔
آہ وہ بہنے کو بیتاب آنسو جنھیں وہ آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔
ریحان کا ضمیر انھیں مجرم کہہ رہا تھا۔ زمانہ انھیں معاف کر دیتا۔ قانون معاف کر دیتا۔ اخلاقی حد بندیاں معاف کر دیتیں۔ جب بھی وہ اپنے آپ کو معاف نہ کر سکتے تھے۔
"چلو چلیں"
"کیا بدمزگی پیدا کر دی تم نے فرخ۔۔۔"
"میں نے کیوں؟"
"تو اور۔۔۔ نہ خوش خبری لاتے نہ بات یہاں تک پہنچتی۔۔۔"
"میرا کیا قصور میاں۔ یہ تو بجلی کی لہر کی کرامت ہے۔ دیکھو لو۔ ساتھ والے کمرے سے گزری اور ہماری ساری خوشی جلا کر خاکستر کر گئی۔۔۔" فرخ نے ریحان کو ہنسانے کی کوشش کی۔
سب مسکرا دیئے۔ لیکن ریحان کے لبوں پر جامد چپ تھی۔ وہ جیسے یہاں تھے ہی نہیں۔
دُور
کہیں دُور
دو آنکھوں کی شبنمی دھندلاہٹوں میں ڈوب رہے تھے۔
ان آنکھوں میں امنڈنے والے دھوئیں میں کھو گئے تھے۔
زندگی میں پہلی بار کسی کے دکھے دل کا احساس ہوا تھا۔
آج دھندلاہٹوں کے سینے چیر کر بجلیاں لپکی تھیں اور کہنہ چٹانوں کو پاش پاش کر گئی تھیں۔

آج دھوئیں کے بادلوں کے ٹکراؤ سے پہاڑ سرک گئے تھے۔

آج پانی سے آگ لگ گئی تھی۔

چند گھنٹے دوستوں کے اصرار پر بدمزگی سے گزارنے کے بعد ریحان جب دوپہر کے کھانے کے لیے طعام گاہ میں پہنچے تو ان کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

ڈرتے ڈرتے انھوں نے کھانے کی میز پر نظر ڈالی۔

صاعقہ موجود نہ تھی۔

انھوں نے دوسری طرف دیکھا۔ اس میز پر بھی وہ موجود نہ تھی۔

ان کا دل پکار پکار کر کہنے لگا کہ وہ ان بے رحم لمحات کی تلخی پر اب تک سسک رہی ہے۔

ریحان سے کھانا بالکل نہیں کھایا گیا۔ سمیرا ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس گھپ چپ سے وہ الجھ رہی تھی۔

اس نے کئی کھانے ریحان کے سامنے پیش کئے لیکن وہ برائے نام چند نوالے لے کر میز سے اٹھنے لگے۔

"کیا بات ہے۔ آج آپ نے کھانا نہیں کھایا؟" سمیرا نے دلفریب انداز میں پوچھا۔

لیکن ریحان کو آج یہ آواز کچھ اجنبی سی لگی۔ بغیر کچھ کہے میز سے اٹھ گئے۔ اسد برابر ریحان کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے کھوئے ہوئے انداز سے انھیں خوشی ہو رہی تھی۔ اک معصوم زندگی کا تمسخر اڑانے والا آج خود تاسف و ندامت سے دوچار تھا۔ پتھر نرم ہوا تھا۔

ریحان اپنے کمرے میں آگئے۔ دل میں کسک تھی۔ کسی پہلو قرار نہ آرہا تھا۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ کی گونج کانوں کو مجروح کر رہی تھی۔

"وہ بھی اپنی ماں کی طرح بھاگ گئی تو۔۔۔؟"

اُف کتنے سبک تھے وہ۔۔۔۔۔۔ ایسا ذلیل مذاق۔۔۔ اتنا گرا ہوا مذاق تھا ان کا۔۔۔ انھیں اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اپنی نظروں میں آپ گرے جا رہے تھے۔ اخلاقی ضابطہ بھی تو کوئی چیز تھی۔ حیران تھے کہ اب تک انھوں نے اس ذہن کے اخلاقی ضابطوں کا اطلاق اپنے اوپر کیوں نہ کیا تھا۔

گوشت پوست کی ذی روح شے کو پتھر کا ٹکڑا کیوں سمجھتے رہے تھے۔ اس کے

محسوسات پر جمود کا یقین کیوں تھا انھیں۔

پچھتاوہ آرہا تھا۔ بری طرح روح کو مسل رہا تھا۔ کسی طرح تسکین نہ پا رہے تھے۔ جھنجھلا کر ان خیالات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔

مسہری پر لیٹ کر کتاب اٹھالی۔ ذہن کا رخ موڑنے کا اک حیلہ ہی تھا نا

لیکن

ہر صفحے پر

سطور کی بجائے دو حسین، سوگوار اور دھندلائی آنکھوں کا عکس نظر آیا۔

آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھیں

جو

کچھ پوچھ رہی تھیں۔

کچھ کہہ رہی تھیں۔

کچھ طلب کر رہی تھیں۔

ریحان نے کتاب میز پر پٹخ دی اور تکیے کی نرماہٹ میں سر چھپا کر ان افکارِ پریشان کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

تین چار گھنٹے یونہی گزر گئے۔ نہ سو سکے۔ نہ ہی ذہن کو انگاروں کی حدت سے بچا سکے۔

شام گھوم پھر کر گزارنے کے خیال سے اٹھے اور جلدی جلدی تیار ہونے لگے۔ وہ بیرونی دنیا کے شور وغل میں اپنے آپ کو کھو کر تسکین پانا چاہتے تھے۔ تنہا جانا چاہتے تھے۔ اس لیے غسلخانے کے دروازے سے باہر نکلے۔

راستہ طاہر مرحوم کے کمروں کے آگے سے ہو کر جاتا تھا۔ ان کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ریحان کو اس کیمرے کا خیال آگیا۔ جو کئی دنوں سے وہ ٹھیک کروانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن جب بھی باہر جاتے، لے جانا بھول جاتے۔

ریحان برآمدے میں آئے اور طاہر کے کمرے میں آگئے۔

لیکن

مسہری پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گئے۔

وہاں کوئی بیٹھا تھا۔

جس نے آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا۔

اور

ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے وزنی بم پھینک کر ان کی حیات کا شیرازہ درہم برہم کر دیا ہو۔

مسہری پر صاعقہ بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں طاہر وناجی کی بڑی سی تصویر تھی۔ جس پر سر رکھے وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پلنگ پر بھی کئی تصویریں بکھری تھیں۔

آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

شدتِ گریہ سے آنکھیں اس حد تک متورّم تھیں کہ انھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔

صبح

ان آنکھوں میں

ریحان نے سیلاب امنڈتے دیکھا۔

اور

اب

اس سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے۔

یہ سیلاب انھی کا آوردہ تو تھا۔

گھبراہٹ، پریشانی، پشیمانی اور ندامت کے جذبات نے انھیں گنگ کر دیا۔ دونوں ہاتھ پریشانی سے ملتے ہوئے انھوں نے صرف ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ اٹھی۔ پلنگ پر بکھری ہوئی کئی تصویروں کو سمیٹا۔ گود والی تصویر پر انھیں رکھا اور تصویریں الماری میں یونہی ٹھونس کر وہ مڑی۔

ریحان نے دیکھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں اداسیاں یوں ڈھل رہی تھیں جیسے رات کی آمد پر تاریکیاں شفق میں ڈھلنے لگتی ہیں۔

"صاعقہ" اک مبہم سی سرگوشی ابھری، لیکن صاعقہ رکے بغیر ریحان کے قریب سے ہوا کے اک جھونکے کی طرح گزر گئی۔

جھونکا جو آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔

اور۔۔۔۔۔ جسے قابو میں کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

○

۲۸

ریحان نے اپنا نیلا گاؤن پہنا اور خواب گاہ سے باہر نکل گئے۔ کل کے سنگین واقعے کا اثر اب تک ان کے حواس پر تھا۔ پچھتاوہ رہ رہ کر مچل رہا تھا۔ اور ریحان کی غم نا آشنا زندگی کو اک انوکھی سی کسک دیئے جا رہا تھا۔

رات بھر انھیں اچھی طرح نیند نہ آئی تھی۔ ذہن اس قدر متاثر ہوا تھا کہ وہی دو شبنمی آنکھیں سوتے جاگتے میں تحرک رہی تھیں۔ رات بھر کی بیزار نیند اور ذہن پر ان آنکھوں کی شدید گرفت سے وہ جھنجھلائے ہوئے تھے۔

"کوئی بڑی بات نہیں۔۔۔۔ کسی وقت موقع ملا تو معذرت کر دیں گے۔ ایسی کونسی بات ہے۔ جس کے لیے اپنے آپ کو اس حد تک پریشان کیا جائے۔ مانا کہ اخلاقی پستی ہے۔ اخلاقی جرم ہے۔ تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ چلو معافی مانگ لیں گے۔ آئندہ اسے کبھی نہ بنائیں گے۔۔۔ اس سے اچھا سلوک روا رکھیں گے۔ اس کی نحوست کا بھی کبھی مذاق نہ اڑائیں گے۔"

سوچتے ہوئے ریحان دریا کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔ موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ اعصاب پر خوش گوار اثر ڈال رہی تھی۔ سبزہ۔۔۔ دریا کا کنارہ۔۔۔ اور ابھرتی صبح۔ ریحان کافی دور تک نکل گئے۔ دماغی استدلال، ذہنی گھبراہٹ اور روحانی اضطراب ختم نہ کر سکے۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ سطح آب پر جھلملانے لگی۔ ریحان پہلے سے کہیں زیادہ بےقرار ہو کر واپس پلٹے۔

دریا کے کنارے کنارے

جہاں اونچے نیچے درختوں تلے بڑے بڑے پتھر پانی میں کچھ ڈوبے کچھ ابھرے قدرتی مسندوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

جہاں خودرو پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔

جہاں نرم و نازک بیلیں تناور درختوں کے تنوں سے بڑے والہانہ انداز میں لپٹی ہوئی تھیں۔ موسم کی رنگینی، ماحول کی نغمگی اور بھیگی بھیگی فضا کا ترنم متقاضی تھا کہ وہ کسی پتھریلی مسند پر بیٹھ کر پانی میں پاؤں ڈال کر اپنے سارے افکار سے نجات پالیں۔ لیکن طبیعت کچھ مچلی ہوئی تھی۔ قرار نہ تھا۔ بڑھے چلے جا رہے تھے ناشتے کا وقت بھی تو ہو رہا تھا۔۔۔۔ وہ کچھ تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔

لیکن

ان کے بڑھتے ہوئے قدم خود بخود رک گئے۔ اک لطیف سی مدھم گنگناہٹ فضا کی نغمگی و ترنم میں ایک درد بھرا اضافہ کر رہی تھی۔

کوئی ہلکے سروں میں دل کا درد فضا کی لہروں پر بکھیر رہا تھا۔ کشش ساحرانہ تھی۔ ریحان کے قدم خود بخود آواز کی سمت اٹھنے لگے۔

درختوں کے شاداب جھنڈ میں۔۔۔۔ جہاں خودرو پھولوں کی مہک تھی، انھیں گلابی گلابی کپڑوں کی جھلک سی دکھائی دی۔

آواز رک گئی۔

اور

ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کائنات نے دم روک لیا ہو۔ ریحان دم بخود کھڑے رہے۔

چند ثانیوں بعد پھر آواز ہواؤں کے دوش پر لہرائی۔۔۔ اور لہراتی رہی۔ ایک ہی شعر بار بار گنگنایا جا رہا تھا۔

کبھی مدھم سروں میں کبھی دل کش لے میں۔

آواز کے سوز و گداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نغمہ نہیں سیال درد بہہ رہا ہو۔

ریحان محتاط قدم اٹھائے جھکے درختوں کی ٹہنیاں ہٹا کر راہ بناتے کسی مقناطیسی کشش سے اس جانب کھنچے جا رہے تھے۔

قریب پہنچ کر درختوں کی گھنیری اوٹ سے ریحان نے دیکھا۔ لمحہ بھر کو تو جیسے ان کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

صاعقہ اک اندازِ بیخودی سے چوڑے پتھر کے کنارے بیٹھی تھی۔ پاؤں پانی میں لٹکا رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں قدم بوسی کو مچلتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ مستانہ ہوا کی چھیڑ

ے بال کچھ پریشان سے ہو کر بکھر گئے تھے۔ گلابی ریشمی لباس کی سرسراہٹیں جاں گداز تھیں۔

صاعقہ ماحول سے بے خبر اور گرد و پیش سے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ چہرے پر اداسیوں کے گھلتے رنگ بڑے واضح تھے۔ بڑی بڑی حسین آنکھوں میں اک آزار تھا۔ کتنی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اک درد بھرا شعر وجدانی کیفیت سے کبھی مسلسل اور کبھی رک رک کر دہرا رہی تھی۔ بیچارگی اور تنہائی کا ترجمان شعر جس انداز میں گنگنایا جا رہا تھا، پتھر بھی پانی ہو جاتا۔

ریحان تو انسان تھے۔

جو گوشت پوست کا دل رکھتے تھے۔

دل

جو احساس ندامت سے دھڑکنا بھی بھولے جا رہا تھا۔

پتوں کی چلمن سے وہ صاعقہ کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔

پچھتاووں کا ردِ عمل افسردگی کے روپ میں ہو رہا تھا۔ ریحان بے قرار پہلے ہی تھے۔ اب انتہائی افسردہ نظر آنے لگے۔

صاعقہ کی آیا اسے بلانے کہیں سے آ گئی۔ ریحان کا مدہوش تاثر ٹوٹ گیا۔ جلدی سے گھنے درختوں کی آڑ میں اس طرح کھڑے ہو گئے جہاں سے وہ کسی کو نظر نہ آتے۔ لیکن پتوں کی آڑ ایسی تھی جہاں سے وہ صاعقہ کو بآسانی تک سکتے تھے۔ وہ صرف دو فٹ کے فاصلے پر ہی تو بیٹھی تھی۔

آیا کی آواز پر صاعقہ بھی اس دنیا میں لوٹ آئی۔ اک گہری سانس لے کر اس نے آیا کی طرف دیکھا۔

"چلو بیٹی۔ کب سے یہاں بیٹھی ہو۔۔۔۔ آج تو میرے جاگنے سے پہلے ہی تم اٹھ آئیں۔۔۔ چائے وہیں پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔۔۔۔"

صاعقہ نے اک جھولتی ہوئی شاخ کو تھام لیا۔۔ اور اس کے پتے نوچ نوچ کر پانی میں پھینکنے لگی۔

"اٹھو بھی"

"ہوں"

"دیر ہو رہی ہے بیٹی۔۔۔ ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

صاعقہ نے سر گھما کر آیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اک استفسار تھا۔ اور ہونٹوں پر طنزیہ تبسم۔۔۔۔

"ناشتے پر سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے؟"

"وقت ہو گیا ہے۔ سب کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے ہوں گے۔"

آیا جیسے اس کے طنزیہ تبسم کو سہار نہ سکی۔

"صرف میں نہیں پہنچی۔"

"ہاں تو۔۔۔"

"اس لیے سب میرا انتظار کر رہے ہیں؟"

"اٹھو بھی صاعقہ بیٹی"

"آیا۔۔۔!"

"ہوں"

"تم جھوٹ کیوں بولتی ہو۔"

"میں۔۔۔۔؟"

"ہاں"

"میں نے کونسا جھوٹ بولا۔۔۔؟"

"ابھی ابھی کہہ رہی تھیں نا۔۔۔ کہ سب ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔"

"اس میں جھوٹ کی کیا بات؟"

"تو یہ سچ ہے؟۔۔۔۔"

"ہاں"

اور اس ہاں پر صاعقہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

ریحان کو یہ ہنسی یوں لگی جیسے دق کے مریض کے کھوکھلے سینے سے آخری بار کھانسی اٹھی ہو۔

کتنی کھوکھلی اور طنز بھری ہنسی تھی۔ ریحان نے لاشعوری طور پر اپنے نچلے ہونٹ کے دائیں گوشے دانتوں تلے دبا لیے۔

"صاعقہ" آیا کے لہجے میں ممتا بھری ڈانٹ تھی۔ "کتنی بار سمجھایا ہے الٹ پلٹ

باتیں نہ کیا کرو۔۔۔“

”کیسے نہ کروں آپا“ صاعقہ سینے میں اٹھتی ہوئی ٹیس کی طرح بل کھا کر پیچھے کو ہٹ گئی۔ وہ مجسم آنسو نظر آ رہی تھی۔

آپا کی آنکھوں کے گوشے نم آلود ہو گئے۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پا کر آگے بڑھی اور صاعقہ کا ہاتھ تھام کر اٹھانا چاہا۔

”تم کہتی ہو سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔ آپا۔۔۔ یہ جھوٹے بہلاوے دے دے کر کب تک بہلاتی رہو گی مجھے۔۔۔“

آپا کے نچے کھچے چہرے پر جذبات کا تلاطم تھا۔

صاعقہ پھر ہنس دی۔ وہ بے رنگ بے کیف ہنسی۔۔۔ جیسے مدقوق سینے کی ہڈیاں کھڑکھڑا گئی ہوں۔

”میرا کسی کو انتظار نہیں ہوتا آپا۔۔۔ میری موجودگی ان لوگوں کے ذہنوں پر بار ہوتی ہے آپا۔۔۔ مجھے صبح صبح دیکھ کر ان کی رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ جاتی ہے۔ جھنجھلاہٹ سی آ جاتی ہے۔ صبح صبح دیکھ لیں تو سارا دن بدمزگی میں گزر جاتا ہے۔“

”صاعقہ“

”میں بجلی ہوں آپا بجلی۔۔۔ جہاں گری بھسم کر ڈالا“ صاعقہ اسی انداز میں کہہ گئی۔

اُف۔۔۔ ریحان نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ صاعقہ انہی کے الفاظ دہرا رہی تھی۔

اتنا اثر لیا تھا اس نے۔۔۔ ریحان نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا۔

”میری بچی کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟“ آپا اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

صاعقہ بہتے پانی پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

”کل سارا دن رو رو کر ہلکان ہوتی رہی ہو۔۔۔ کچھ تو کہو۔۔۔ ہوا کیا ہے۔۔۔؟“

”کوئی نئی بات نہیں آپا۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”پھر بھی؟“

”[illegible] صرف ضرب لگانے کے انداز [illegible] آپا۔“

”پھر کہا کسی نے کچھ؟“

”اگر میں ہاں بھی کہہ دوں تو تم کیا کر لو گی آپا۔۔۔“

آپا کی آنکھوں میں اپنی بے بسی پر آنسو چھلک آئے۔ ذہنوں کے دھارے بدل دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

”آپا“ قدرے توقف کے بعد صاعقہ بولی۔

”ہوں“

”اگر۔۔۔“ وہ چپ ہو گئی۔ آپا منتظر رہی۔

”اگر میں یہاں چھلانگ لگا کر ان لہروں کی آغوش۔۔۔“

”صاعقہ۔۔۔“ آپا چیخ اٹھی اور ریحان سر تا پا کانپ گئے۔

”تم یہاں نہ آیا کرو۔۔۔“ آپا نے بے تحاشہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”کیوں؟“ صاعقہ نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بڑی منحوس جگہ ہے میری بچی۔۔۔“ آپا خوف زدہ سی تھی۔

”منحوس۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ تمہاری بدبخت ماں بھی یہیں بیٹھا کرتی تھی اور ظلم و تشدد سے تنگ آ کر یہیں سے۔۔۔“ وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔۔۔ پھر گھبرا کر بولی۔

”اٹھو۔۔۔ چلو یہاں سے۔۔۔ یہاں نہ آیا کرو۔۔۔ یہ بڑی منحوس جگہ ہے۔۔۔“ ریحان نے قدرے جھک کر آپا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا رخ صاعقہ کی جانب تھا۔ آپا کی گھبراہٹ انہیں کچھ چونکا گئی تھی۔

صاعقہ از خود رفتہ سی بیٹھی تھی۔

”میری ماں بھاگ گئی تھی آپا۔۔۔“ صاعقہ نے کھوئے ہوئے انداز میں بڑے اداس لہجے میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں صاعقہ۔۔۔“ آپا نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔۔۔

”تم ہمیشہ یہی کہتی رہو گی۔۔۔ جھوٹی تسلیاں نہ دیا کرو۔۔۔ تمہاری ہمدردی بہت دکھ دیتی ہے آپا۔۔۔“

آپا نے کوئی جواب نہ دیا۔

”آپا!“

"ہوں"

"تم کیوں کہہ سکتی ہو کہ میری ماں بھاگ نہیں گئی تھی۔۔۔۔؟" آپا اک لا کوسٹ پٹا گئی۔ لیکن اب صاعقہ کے ایسے ایسے سوالوں کی عادی ہو چکی تھی۔

"ہاں بتاؤ نا۔۔۔!"

"مجھے یقین ہے۔"

"یونہی؟"

"اک عمر گزر گئی ہے یہاں رہتے ہوئے۔۔۔۔"

"پھر۔۔۔۔۔"

"بہت کچھ سمجھا۔۔۔۔ بہت کچھ پایا۔۔۔۔"

"یہ یقین کہ میری ماں بھاگی نہیں تھی۔۔۔۔۔"

"میرا ایمان ہے۔۔۔۔۔"

"ہونہہ۔۔۔۔۔" صاعقہ ہنس دی۔

"سب کہتے ہیں۔۔۔۔"

"غلط کہتے ہیں۔۔۔۔"

"تم اکیلی سچ کہتی ہو۔۔۔۔؟"

"ہاں" آپا نے اس تیقن سے کہا کہ ریحان نے پتوں کی اوٹ سے اک بار پھر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"اس سنگین چہار دیواری میں بسنے والوں کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہیں جو اپنے خون کے ساتھ ناروا سلوک کر سکتے ہیں۔ انھیں اس غریب اور دیہاتی لڑکی کے جارحانہ اور بےباکانہ رویہ روا رکھنے میں کیا پابندی ہوگی۔ جور اور تشدد سے تنگ آ کر ہو سکے ہے وہ انہی لہروں کی آغوش میں کھو گئی ہو۔"

صاعقہ نے ابھرتی ڈوبتی لہروں کی طرف دیکھا اور اس عقیدت سے دیکھا جیسے ان ڈوبتی لہروں میں ان کی ماں کی تربت ہو۔۔۔ لیکن اک لمحے کے بعد اس نے سپاٹ نظروں سے آپا کی طرف دیکھا۔

"یہ سب تمہاری قیاس آرائیاں ہیں آپا۔"

"نہیں مجھے یقین ہے بی بی"

"یقین" صاعقہ پھر وہی بے رنگ ہنسی ہنس دی۔ آپا اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"تمہیں تو یہ بھی یقین ہے کہ سب ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

۲۹

ناشتہ کرنے کو اس کا قطعاً جی نہ چاہ رہا تھا۔ کل سے طبیعت سخت پریشان تھی۔ زندگی سے بیزار سی نظر آرہی تھی۔ صبح ہی صبح آپا سے جو باتیں ہوئیں ان سے طبیعت اور مکدر ہو گئی تھی۔

آپا اسے زبردستی ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف لے آئی۔ سب ناشتہ کر چکے تھے۔ ہال خالی تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی صاعقہ کی نظر میز کے کونے پر پڑی۔ ناشتہ کا سامان رکھا تھا اور ریحان میز کے کنارے والی کرسی پر بیٹھے پیالی میں چائے انڈیل رہے تھے۔

"صاحب زادہ صاحب۔۔۔۔ آج آپ تنہا ناشتہ کر رہے ہیں۔۔۔؟" آپا نے پوچھا۔

"بس دیر ہو گئی تھی۔۔۔۔" انھوں نے پل بھر کو صاعقہ کی طرف دیکھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پُروقار نظر آرہی تھی۔

"صاحب زادی نے بھی ناشتہ نہیں کیا ابھی۔۔۔۔"

"یہیں آجائیں۔۔۔ کافی چیزیں پڑی ہیں۔۔۔۔" ریحان جانے کیوں صاعقہ کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے۔

صاعقہ نے رک کر ریحان کی طرف دیکھا۔۔ حیرانگی سے دیکھا۔

"ہاں بیٹی۔ یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں پیالی لے آتی ہوں۔۔۔۔" آپا الماری سے پیالی لانے آگے بڑھ گئی۔

"بیٹھ جاؤ صاعقہ۔۔۔۔" ریحان آہستگی سے بولے۔

صاعقہ نے کرسی کی پشت تھامے تھامے پھر ریحان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں صبح کے ان نازک لمحوں کی جھلک تھی جن میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے میں

حلول کر جاتا ہے۔ اک خواب ناک سا اجالا۔ ایک تابناک سا اندھیرا۔

ریحان کے لہجے کی ملائمت نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن وہ اس تتے پن سے سکون نہ محسوس کر سکی۔ ریحان۔۔۔ یہ وہی ریحان ہی تو تھے جو اسے تختۂ مشق بنانے میں پیش پیش تھے۔۔۔ جو اس کا نام اپنے نام کے ساتھ لینا تک گوارا نہ کر سکتے تھے۔ اور جو ابھی کل ہی دوستوں میں اس کے وقار کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔

"بیٹھو نا!" ریحان نے نادم نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے میں سموئے ہوئے لاتعداد غموں نے انہیں بے چین کر دیا۔

صاعقہ نے پھر ریحان کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں طنز کی دھوپ تھی۔ چبھتی ہوئی دھوپ۔

"کافی چیزیں ہیں۔ آپا پیالی لا رہی ہے۔۔۔ ناشتہ یہیں کر لو" ریحان کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

"کیوں پریشانی مول لیتے ہیں۔۔۔" وہ زیرِ لب ہنسی۔

"صاعقہ!" چمچ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں جا گرا۔

صاعقہ ہنس دی۔ وہی پھیکی بے رنگ ہنسی۔۔ جو آج صبح ہی صبح ریحان نے سنی تھی۔ وہ بے چین ہو گئے۔

"صبح ہی صبح منہ دیکھ لیں تو سارا دن پریشانی میں گزر جاتا ہے۔ ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر لوں گی تو ہفتہ بھر پریشانی سے طبیعت معمول پر نہ آئے گی صاحب زادہ ریحان۔۔۔" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔

"صاعقہ!" ریحان بے ساختہ چیخ اٹھے۔۔۔۔ ان کے لہجے میں تلملائی ہوئی بے چارگی تھی۔

لیکن صاعقہ رکی نہ مڑ کر ہی دیکھا۔ کسی سبک سی لہر کی طرح وہ آگے بڑھی۔ ہال کے آخری کونے میں ایک میز کے قریب جا بیٹھی۔ ریحان کی طرف اس کی پشت تھی۔

ریحان نے کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا۔

آپا پیالی لے کر آگئی۔

ریحان کی طرف دیکھا

اور

پھر صاعقہ کی طرف۔

وہ چپ چاپ پیالی لیے صاعقہ کی طرف آگئی۔

"وہیں ناشتہ کر لیتیں۔۔۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میرے لیے ناشتہ لاؤ" صاعقہ کے لہجے میں حکم تھا۔

آیا کچھ اور کہنا نامناسب سمجھتے ہوئے قریبی دروازے سے باہر نکل گئی۔ وسیع ہال پر ایک سکوت طاری تھا۔ ریحان کی چائے پیالی میں پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں۔

"صاحب زادہ ریحان" یہ انوکھا تخاطب کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں ایک ہی ہال میں بیٹھے تھے۔ لیکن کتنی دوریاں حائل تھیں۔ یہ ذہنی دوریاں، کیا انھیں مٹایا جا سکے گا۔

صاعقہ نے ناشتہ کیا یا نہیں۔ ہاں وہ کچھ دیر ناشتے کی میز پر بیٹھی ضرور رہی۔ اس کے ہال سے جانے کے بعد ریحان بغیر ناشتہ کیے میز سے اُٹھ گئے۔ طبیعت پژمردہ پہلے ہی تھی۔ اب تو بجھ ہی گئی۔

سارا دن اپنے کمرے میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے رہے۔ اسد، نعیم، فرخ، فرید، شاہد نے دھاوا بول دیا۔ یوں بے سُدھ پڑے رہنے پر احتجاج کیا لیکن دوستوں کی بے بکی انجمن بن گئی۔ طبیعت کی خرابی کا واسطہ دے کر سب سے پیچھا چھڑایا۔

فرخ نے بزدل کہہ کر طنز بھی کیا۔ اس خرابی طبع کو کل والے واقعے پر محمول کر کے مذاق اڑایا۔

لیکن ریحان خوب صورتی سے بات کو اور موڑ دے گئے۔ طبیعت خراب ظاہر کی۔ سب بات سچ مان گئے۔ ہاں اسد عمیق نظروں سے اس بناوٹ کے پردے میں چھپی ہوئی حقیقت کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

دوستوں کا ہنسی مذاق راس نہ آیا۔ سمیرا کی ہمدردانہ احوال پرسی بھی اچھی نہ لگی۔ سارا ماحول اجنبی سا لگ رہا تھا انھیں۔ صرف اپنے جرم کا احساس تھا اور وہ شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔

سارا دن جذبات کی شوریدہ سر موجوں سے ٹکراتے رہنے کے بعد ریحان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صاعقہ سے معافی مانگیں گے۔ پوری عقیدت سے وہ اس ذہنی دوری کو ختم کر دیں گے۔ وہ اجنبیت اور بیگانگی کے احساس کو مٹا کر صاعقہ کو وہی مرتبہ دیں گے

جس کی وہ اہل ہے۔

جرم کی سنگینی کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے جذبۂ عفو طلبی کی گہرائی کا بخوبی احساس تھا۔

اسی شام وہ پچھلے برآمدے کے گول ستون سے ٹیک لگائے ڈوبتے سورج کی سرخیوں میں جانے کیا دیکھ رہے تھے کہ اچانک بغلی کمرے کا دروازہ کھلا۔

ریحان نے مڑ کر دیکھا۔

صاعقہ دروازے سے باہر آ رہی تھی۔

خاموش

سنجیدہ

اور

باوقار

ہلکے بادامی رنگ کے لباس میں شام کے دھندلکے میں وہ اس مسحور کن خواب کی طرح نظر آ رہی تھی جو جاگتے میں آنکھوں میں ڈھل رہا ہو۔

اسے شاید بیرونی چمن کی طرف جانا تھا۔

اک ثانیہ ریحان کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر بڑھی اور ان کے قریب سے گزر کر برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

"صاعقہ!" ریحان کا جذبۂ عفو طلبی مچلا۔

صاعقہ نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

لیکن اس کی نگاہوں میں سنجیدگی کا اک ایسا تناؤ تھا کہ ریحان کوشش کے باوجود حرف مدعا ہونٹوں پر نہ لا سکے۔

صاعقہ نے محسوس کیا وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ کچھ نہ سمجھی۔۔۔ استفہامیہ نظروں سے چند ثانیے انھیں دیکھتی رہی۔

ریحان کے خون کا ایک ایک قطرہ حرف مدعا بننے کے لیے تڑپ اٹھا۔ لیکن جانے کونسی طاقت تھی جو قوت گویائی سلب کیے جا رہی تھی۔ کئی بار نگاہیں اٹھیں لیکن اپنے ہی بار سے جھک گئیں۔

ریحان کا یہ جذب۔۔۔ ہچکچاہٹ اور کش مکش صاعقہ کی نظروں سے نہاں نہ رہا۔

لیکن

اس نے کچھ پوچھا نہیں۔

ریحان چُپ تھے۔

وہ مڑی

اور

چمن میں اتر گئی۔

ریحان وہیں کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ اپنے اوپر حیرانگی بھی آرہی تھی اور غصہ بھی۔

کتنا اچھا موقع تھا عفو طلبی کا، ضمیر سے بوجھ ہٹانے کا، ذہنی دُوریاں دُور کرنے کا۔

لیکن اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

کیا وہ بُزدل تھے

یا جُرم کا بار ہی اتنا تھا کہ اُٹھانا مشکل تھا۔ بارے زبان بند ہو گئی تھی۔ کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ پائے تھے۔

..........○..........

۳۰

اس نشیلی صبح وہ حسبِ معمول دیر تک دریا میں نیم ڈوبے پتھر پر بیٹھی رہی۔ آوارہ ہوائیں اس کے بالوں کو چھیڑتی رہیں۔ مست جھونکے اس کے لباس کی سرسراہٹوں کو سرگوشیاں بناتے رہے۔ لیکن وہ بے خبر سی بیٹھی رہی۔ وہ جتنی خاموش اور پر سکون دکھائی دے رہی تھی، اس کے سینے میں اتنا ہی ہیجان و تلاطم تھا۔

پانی میں گرداب اٹھ رہے تھے۔

اور

اس کے ذہن میں بھی کچھ ایسے ہی گرداب بن رہے تھے۔ بگڑ رہے تھے۔ اور پھر بن رہے تھے۔ لہریں پھیل پھیل کر اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں۔ جن سے دل ہچکولے کھا رہا تھا۔

کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ ریحان اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دو چار مرتبہ آمنا سامنا ہونے پر انھوں نے اسے مخاطب بھی کیا۔ لیکن جانے کیوں کہہ دینے سے گریزاں رہے تھے۔

وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟

یقیناً وہ کسی خوش فہمی کو اپنے ذہن میں سر اٹھانے کی مہلت دینے کو تیار نہ تھی۔

پھر۔۔۔ پھر وہ کیا کہنا چاہتے تھے!

پھر پھر کر دماغ اسی واقعے کی طرف گھوم جاتا۔ جب اس نے ریحان کی زبانی آزردہ باتیں سنی تھیں اور کھڑکی میں پلٹنے کے بعد اس کا ریحان سے سامنا ہو گیا تھا۔

یہ باتیں انوکھی تھیں نہ نرالی۔ اس کی تو زندگی طنز کے ایسے تیروں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ ریحان نے اس کے سامنے نہ سہی، پس پشت اس سے بڑھ کر اسے ذلیل کیا تھا۔ وہ گلستاوہ تو ایک طرف، کبھی کسی نے نادم نظر بھی اس پر نہ ڈالی تھی لیکن اب۔۔۔؟

وہ متاسف نظر آتے تھے۔

کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کہہ نہ پائے تھے۔

جاسف اور ریحان دو متضاد چیزیں نظر آتی تھیں۔

وہ دیر سے سوچ رہی تھی۔۔یہی باتیں۔

اور پھر

اس کے ذہن میں اک لہر سی اٹھی۔ جس کی کربناک ٹیسوں سے وہ بے چین ہوئی۔ اس نے سوچا۔۔۔ شاید۔۔۔ ریحان کی جدت پسند طبع نے یہ بھی تفنن طبع کا کوئی یا ذریعہ ڈھونڈا ہے۔ اسے تختۂ تضحیک بنانے کی کوئی نئی سکیم دماغ میں سمائی ہے۔

یہ سوچ یہ خیال معصوم دل و دماغ میں شعلوں کی لپک پیدا کر گیا۔ اس نے جھکا ہوا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

اور

پھر

اسے چند سال ادھر کا وہ واقعہ یاد آ گیا۔ جب ریحان نے کچھ ایسا ہی روپ بدلا تھا۔ اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ ہمدردی، چاہت اور خلوص میں پیش پیش رہتے تھے۔ اسے منحوس کہنے والوں سے الجھ پڑتے تھے۔

اور صاعقہ کی محبت و پیار کے جذبات کے لیے ترستی روح اس بدلے ہوئے رویے سے پوری طرح بہک آئی تھی۔

لیکن

چند ہی دنوں بعد بناوٹ کا پول کھل گیا تھا۔ اپنے ہم جلیسوں کے سامنے ریحان نے وہ مذاق اڑایا تھا کہ بیمار روح تڑپ اٹھی تھی۔

دو گرم گرم آنسو صاعقہ کی آنکھوں سے ہتھیلیوں پر ٹپکے۔ دل کا کتنا درد سمویا تھا ان آنسوؤں میں۔۔۔

انگلیوں کی نازک نازک پوروں سے اس نے آنکھوں کے بھیگے گوشے صاف کیے۔ آنسو اس کی کمزوری کے غماز تھے۔ وہ شاید یہ کمزوری اپنے آپ پر بھی ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ خود فریبی سہی۔ لیکن اسی میں مصلحت تھی۔

سورج ابھر آیا تھا۔ بھیگی بھیگی ہواؤں کے خنک آنچل سوکھے جا رہے تھے۔ فضا

طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ نشیلی صبح کچھ ہوش میں آتی جا رہی تھی۔

وہ دل گرفتہ سی اٹھی۔ ڈھیلے ڈھالے گلابی گاؤن میں وہ کوئی اپسرا نظر آ رہی تھی۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی۔۔۔ سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھی وہ سر جھکائے الحمراء کی بلند و بالا عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

"صاعقہ" پشت کی جانب سے کسی نے پکارا۔۔۔ اس نے رک کر پیچھے دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ریحان آ رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رک گئے۔

اس نے دیکھا۔ آج ان پر پھر وہی کیفیت طاری تھی۔ تذبذب۔۔ کشمکش، کچھ کہنے کو بیتاب نظر آ رہے تھے۔ لیکن کہہ نہ پاتے تھے۔

صاعقہ نے بیگانہ سی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ان نظروں میں حیرت قطعاً نہ تھی۔

ریحان نے اس کی طرف دیکھا۔ لب پھڑپھڑائے۔ لیکن کچھ بولے نہیں۔ صاعقہ نے بھرپور نظر ان پر ڈالی۔ ہلکے نیلے گاؤن میں وہ کتنے حسین نظر آ رہے تھے۔

"کاش ان کا دل بھی اتنا ہی حسین ہوتا" ضبط کے باوجود صاعقہ کے دل کے کسی نامعلوم گوشے سے صدا اٹھ رہی تھی۔

اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

"صاعقہ!" اک سرگوشی پھر ابھری۔ ریحان اس کے کندھے کے قریب آ چکے تھے۔ وہ اک طرف کو ہو گئی۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔۔؟" بڑی ہمت کر کے اس نے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔" ریحان کے لبوں سے نکلا۔

"کہیئے۔" وہ رک گئی۔

ریحان اس کے سامنے کھڑے تھے۔ دو ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اس کے سامنے احساس جرم اتنا شدت اختیار کر جاتا کہ زبان سے ایک لفظ نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"میں منتظر ہوں صاحب زادہ ریحان" جذبات سے عاری آواز تھی۔

"صاعقہ" ریحان اس طرز تخاطب سے تلملا سے گئے۔

صاعقہ بظاہر مطمئن سی کھڑی تھی۔

"یہ انوکھا طرزِ تخاطب کب سے سیکھا ہے؟" ریحان کے خوبصورت چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر اک زہریلا تبسم بکھر گیا۔ بڑے نپے تلے انداز میں بولی "جب سے اپنے اور آپ کے رتبے کے تفاوت کا احساس ہوا ہے۔"

"صاعقہ!" ریحان اس چوٹ پر تڑپ گئے۔

لیکن وہ تیزی سے وہاں سے چل دی۔

ریحان کا زخمی ذہن اس چوٹ پہ تڑپ رہا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ صاعقہ درختوں کے گھمبیر سایوں تلے ہوتی الحمراء کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ان سے چند گز کے فاصلے پر تھی۔

لیکن

ریحان کو

یہ فاصلہ

صدیوں پر پھیلا ہوا محسوس ہوا۔

انھیں یوں لگا جیسے وہ اور صاعقہ ازل و ابد کے دو سرے ہوں۔ یہ سرے کیوں کر ملیں گے!

کیا انھیں ملانے کو کوئی قیامت مچل اٹھے گی؟

قیامت۔۔۔ قیامت

قیامت تو ریحان کے سینے میں بپا تھی۔

کیوں نہ یہ قیامت آج ہی مچل جائے۔

تیزی سے قدم اٹھاتے ریحان صاعقہ کی طرف بڑھے۔ اور پھر اس کے برابر آ گئے۔

"صاعقہ!" انھوں نے تیزی سے پکارا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔۔۔؟" وہ ٹھٹک کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تم ناراض ہو صاعقہ؟" ریحان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

صاعقہ کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا لیکن اس نے اپنے انگیختہ جذبات پر جلد ہی قابو پا لیا۔ ریحان کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ پھر بھلا کسی خوش فہمی کو کیونکر سر اٹھانے دیتی۔

"ناراض ہو؟" ریحان مجرم کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

"ناراض" سنجیدگی کی ٹھنڈی لہر کی طرح وہ گویا ہوئی۔

"مجھے انتہائی افسوس ہے۔ اس دن میری بے ہودہ گوئی سے تمہارے۔"

"اوہ۔۔۔ اس کے لیے آپ پریشان ہیں۔" طنزیہ لہجہ تھا۔

ریحان کا سر اور جھک گیا۔ بیتابی سے ہاتھ مسلے جا رہے تھے۔

"میں نادم ہوں"

"یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔ جس کے لیے آپ پریشان ہوں۔"

"صاعقہ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"

"شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ راہ میں پڑی لاوارث چیزیں ٹھوکروں کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ جس کے وجود کی تخلیق ہی تختۂ مشق بننے کے لیے ہوئی ہے۔"

"صاعقہ" ریحان نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آنکھیں بند کر لیں۔ صاعقہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کئی ثانیے اسی حالت میں کھڑے رہے۔ وہ اس وقت اس مجرم کی طرح نظر آ رہے تھے جس نے پولیس کی گرفت سے پہلے ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا ہو۔

وہ حقیقتاً متاسف تھے یا اداکاری کر رہے تھے۔ صاعقہ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی۔ یہ چند ثانیے کتنے کٹھن تھے۔ یہ صاعقہ کا دل ہی جانتا تھا۔ لیکن گزرے ہوئے ماہ و سال کے سینے پر پھیلے ہوئے لاتعداد داغ صاعقہ کا ذہن اپنی طرف منتقل کر رہے تھے۔ اور ان داغوں کی موجودگی سے وہ اس وقت اسے ریحان کی اداکاری ہی سمجھ سکی۔ یہ کوئی نئی سکیم تھی۔ اسے بنانے کی' وہ اپنے ہم جلیسوں کے لیے شاید قہقہوں کا سامان فراہم کر رہے تھے۔

ریحان سر جھکائے کھڑے تھے۔

صاعقہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر' دل گرفتہ ہو کر وہ مڑی۔ اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا گلا بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آبگینے بھی تو جھلملا رہے تھے۔

"میں انتہائی نادم ہوں۔۔۔ صاعقہ مجھے معاف کر دو۔" قدم بڑھا کر ریحان اس کے برابر آ گئے۔

صاعقہ رکی۔

پلٹ کر ریحان کی طرف دیکھا۔

اور ڈوبتے لہجے میں بولی۔ "آپ کی تنوع پسند طبیعت نے تفنن کی شاید نئی راہ نکالی ہے۔ لیکن۔۔۔ کبھی تو خیال کیا کیجیے کہ جسے آپ تختۂ مشق بناتے ہیں وہ بھی انسان ہے۔ پتھر نہیں۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی تھی۔ ریحان گنگ سے کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے۔

وہ درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور ریحان کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی مہجور و مجبور کے ہونٹوں سے اک سسکی پھسل کر فضا میں تحلیل ہو گئی ہو۔

———o———

(۳۱)

"لیکن اتنا تو خیال کیا کیجیے کہ جسے آپ تختۂ مشق بناتے ہیں وہ بھی انسان ہے پتھر نہیں۔۔۔۔۔"

آنسوؤں میں ڈوبتی آواز ریحان کے کانوں سے مسلسل ٹکرا رہی تھی۔ بستر پر بے چین کروٹیں بدلتے ہوئے وہ اس آواز کے سوز میں اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

رات دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ ریحان کئی بار سر جھٹک کر افکار پریشان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر چکے تھے۔ سو جانے کی کوشش میں بار بار آنکھیں بند کر چکے تھے۔ لیکن نہ نیند آتی تھی نہ قرار۔ دل سیماب کی طرح بے قرار تھا۔ رُوح لاتعداد وزنی پتھروں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ سگریٹ پی پی کر ان کا حلق جلنے لگا تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر جسم دُکھ رہا تھا۔

خواب گاہ کا خواب ناک ماحول بھی نیند لانے میں مددگار ثابت نہ ہو رہا تھا۔ سبز لیمپ کی دھیمی روشنی کئی بار بجھی اور جلائی گئی۔

نہ اندھیرے سکون بخش تھے نہ اُجالے۔

ایک ہی جملہ قیامت بپا کیے تھا۔ دلسوز تاثر سے دل سینے میں بیٹھا جا رہا تھا۔

"صاعقہ۔۔۔ صاعقہ" ان کا رواں رواں ہمہ آواز بنا جا رہا تھا۔

گھبرا کر ریحان بستر سے اٹھے۔

جلدی سے عقبی دریچے کے پٹ کھول دیئے۔

انہیں کیا ہو گیا تھا؟

کیا ہو رہا تھا؟

پچھتاوہ اتنا جاں گسل کیوں بنا جا رہا تھا!

احساس جرم شدید کیوں ہو گیا تھا کہ چین و سکون ان کے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ریحان کے تپتے ہوئے دل و دماغ کو کچھ سکون بخشا۔ دودھیا چاندنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ گلابی جاڑوں کی چاندنی رات دلکشی کے اعتبار سے انوکھی ہی تو تھی۔ انھیں کچھ سکون ملا۔۔۔۔۔ اور اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے کو وہ اپنے ذہن میں توانائی سی پانے لگے۔

سگریٹ سلگا کر وہ کھڑکی میں کھڑے فضا میں گھورنے لگے۔

وہ کھو گئے۔

اپنے آپ میں کھو گئے۔

اور

جب الحمراء کے گھڑیال کی آواز نے انھیں چونکایا تو ان کے دل کا کوئی گوشہ چپکے چپکے سلگ رہا تھا۔

لیکن یہ جلن اذیت نہ دے رہی تھی۔

اک انوکھا سرور۔۔۔۔۔۔ اک کسک بھرا سکون۔۔۔ اک مسحور کن سی تڑپ دے رہی تھی یہ جلن

اور

یہ اسرار، یہ سکون، یہ تڑپ ان کے حواس پر نشہ بن کر چھا رہی تھی۔

ہونٹوں پر اک محجوب تبسم تھا۔ آنکھوں میں نکھرے ہوئے جلووں کا پرتو۔۔۔۔

سگریٹ باہر پھینک کر وہ پلٹے۔

سوچ رہے تھے کہ اب تک وہ کہاں تھے۔ صاعقہ کے قریب رہتے ہوئے بھی وہ اس کی رنگینی سے نگاہوں کو سیراب کیوں نہ کر سکے۔

صاعقہ۔۔۔

جسے اک بے رنگ مصرعہ سمجھ کر نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ عمر خیام کا مخمور کلام تھی۔

وہ کھڑکی سے ہٹے۔۔ نیا سگریٹ سلگایا اور مسہری پر لیٹ گئے۔ کافی دیر تک وہ

یونہی پڑے رہے۔۔۔۔ صرف صاعقہ کا خیال ان کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے مدتوں کا سویا ہوا پیار اس اک لمحہ میں جاگ اٹھا تھا جب انھوں نے صاعقہ کی دھندلائی آنکھوں میں پہلی بار جھانکا تھا۔

اس

اک لمحہ میں

ازل و ابد کی ساری مسافتیں طے ہو گئی تھیں۔

صاعقہ سے معافی مانگنے کا جذبہ پچھتاوہ نہیں تھا

بلکہ

پیار کی مچلی ہوئی جبلتیں تھیں۔

سگریٹ پھینک کر انھوں نے اک طویل انگڑائی لی۔ یوں بستر پر لیٹے جیسے سارے روحانی بوجھ جھٹک کر ہلکے پھلکے ہو گئے ہوں۔ صاعقہ اور ریحان، ریحان اور صاعقہ ایک ہی چیز کے دو نام محسوس ہو رہے تھے۔ جیسے وہ ان کی جنم جنم کی ساتھی ہو۔ ان کے دل کا درد ہو۔۔۔۔۔۔ اور ان کی حیات کی گرمی ہو۔

رات گزر گئی۔

اور

اس کدلی رات کی آغوش سے اک نورانی صبح جنم لے کر بیدار ہوئی۔

ریحان کی زندگی میں روشنی ہی روشنی ابھر آئی تھی۔ کدلی رات کے سلگتے اندھیروں کا کہیں نام نہ تھا۔ وہ سر تا پا بدلی ہوئی ذہنیتوں سے دوچار تھے۔

آنکھیں ادھوری نیند کے نشے سے کچھ مخمور سی تھیں۔ بند بند میں اک لطیف سا اکڑاؤ تھا۔ رات بھر کی بے قراری سے اک کیف آمیز سی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں اک انوکھا سا۔۔۔۔۔ نرالا سا۔۔۔۔۔ سکون بخش درد تھا۔

صاعقہ کی محرومیوں، مایوسیوں اور تنہائیوں کو اپنے پیار کی وسعتوں میں سمو لینے کا تہیہ کر کے وہ کتنے مسرور نظر آ رہے تھے۔

زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر کے ریحان انتہائی مطمئن نظر آ رہے تھے۔

اور

اس دن کئی دنوں کی پژمردگی کے بعد ان کی طبیعت اپنے معمول پہ آئی۔ ساتھی ان سے

نالاں تھے۔ ان کی مرجھائی ہوئی طبیعت سب کے لیے الجھاؤ کا باعث بن چکی تھی۔

لیکن

آج

ان کے مزاج کی شگفتگی عود کر آئی۔ اس دن وہ اپنے ہم جلیسوں سے مل کر بیٹھے۔ ان کے قہقہوں سے بجھی ہوئی محفل نے نئی زندگی پائی۔

اسد ریحان کے اس پلٹے پر ضرور حیران تھے۔ اوروں سے کچھ زیادہ ہی ان کے قریب تھے۔ مزاج کے اس اتار چڑھاؤ سے انھوں نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ لیکن جو فیصلہ ریحان کر چکے تھے، وہ تو ان کے فہم کی دسترس سے بعید تھا۔

اسی شام ریحان اور اسد باتیں کرتے کرتے پائیں باغ میں اتر گئے۔ ڈوبتے سورج کی سرخیوں کا انعکاس بڑا دلفریب تھا۔ ریحان اس حسین منظر میں خود بھی ڈوبے جا رہے تھے۔ فضا کا حسن ذہن میں سے بسے حُسن سے کتنی مطابقت کر رہا تھا۔

"کاش سے یہیں تھم جائے۔" وہ وارفتگی کے عالم میں بولے۔

"اوہو" اسد مسکرائے۔

"کیوں"

"شکر ہے تم لوٹ تو آئے۔ اتنے دنوں جانے کہاں غائب تھے۔"

ریحان اس بات پر دھیرے سے مسکرا دیئے۔ اُن کی نگاہیں مخمور تھیں۔

"مزاج شریف کو ہوا کیا تھا؟" اسد نے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"سب باتیں نہیں پوچھا کرتے" وہ نیم وا نظروں سے اسد کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

"وجہ؟"

"بس"

"اگر میں پوچھنے کی ضد کروں تو؟"

"یہی کہوں گا۔ تیا اُگا رہی تھی۔"

"اور اب؟"

"ستارہ نظر آگیا۔۔۔۔"

"نظر ہی آیا ہے صرف؟"

"منظر آجائے تو پالینا دشوار نہیں۔"

"موجیں بڑی طوفانی ہوتی ہیں۔"

"طوفانی ارادے ان سے ٹکرا جاتے ہیں۔"

"حوصلے بڑے بلند ہیں۔"

ریحان نے جواب میں ایسی مستحکم سی نظر اسد پر ڈالی کہ انھیں یوں محسوس ہوا جیسے اس نظر کی رفعت کے مقابلے میں آسمانوں کی بلندیاں بھی حقیر سی بستیاں نظر آئیں۔

اسد کا اشارہ ساری گفتگو میں صاعقہ ہی کی طرف تھا۔ ریحان کے جواب سے وہ کچھ ششدر سے نظر آنے لگے۔ جیسے ان کی باتوں پر یقین نہ ہو۔

"کیوں؟" ریحان نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں" جواباً مسکرا دیئے۔

کچھ دیر دونوں ٹہلتے ہوئے اِدھر اُدھر باتیں کرتے رہے۔ اسد کے دل میں ریحان کی باتوں سے کچھ خلش سی ہو رہی تھی۔ اچانک انھوں نے موضوع بدلا اور بولے۔

"آجکل صاعقہ بڑی پریشان رہتی ہیں۔"

"ہوں" ریحان نے اک گہری سانس لے کر کہا۔

"شاید اس دن والی باتیں سن کر اتنا اثر لیا ہے۔"

"یقیناً۔"

"تم نے بھی تو حد کر دی تھی۔ کیا بد کلامی کی تھی۔ توبہ۔۔۔۔۔۔"

"یہی خلش تو جگر کے آرپار ہے اسد"

"معافی مانگ لی ہوتی۔ زخموں کا مداوا نہ سہی۔ اسے کچھ تو سکون ملتا۔"

"اتنے دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔" ریحان شیفتگی سے مسکرائے۔

"سوچ ہی رہے تھے۔ عملاً کچھ نہ کر سکے۔" اسد نے تلخی سے کہا۔

ریحان نے چاہا اپنی زندگی کے اہم ترین پلٹے سے انھیں آگاہ کر دیں لیکن کچھ سوچ کر وہ چپ ہو رہے۔ شاید رازِ دل عیاں کرنے کا ابھی موقع نہیں تھا۔

"میں نے کہا اخلاقی تقاضا یہی تھا معافی مانگ لیتے۔"

"میں نے بھی تو یہی کہا ہے کہ اتنے دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔۔۔"

"سوچ لیا؟" اسد کو تاؤ سا آگیا۔۔۔"

"کیا؟"

"ابھی تمہیں کہہ رہا تھا نا کنارہ نظر آگیا۔۔۔۔"

اسد نے کچھ اور پوچھنا چاہا۔ لیکن ریحان نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کنارہ نظر آجائے تو پالینا دشوار نہیں ہوتا اسد۔ موجیں کتنی طوفانی ہوں۔ ارادے ان سے ٹکرا جاتے ہیں۔"

اسد کچھ سمجھے تو نہیں۔ ریحان انھیں تذبذب میں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔



۳۲

"کہاں مر گئی کم بخت۔ چابیوں کے لیے بھیجا تھا نہ خود آئی نہ چابیاں بھیجیں۔ لڑکی کے تیور دن بدن اور سے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ جانے کیا دن دکھائے گی۔"

"یہ کس پر عتاب نازل ہو رہا ہے دادی حضور؟" ریحان نے دادی کی نشست گاہ میں آتے ہی پوچھا۔ دادی غصہ میں بھری چیزیں الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ بڑبڑاتی ہوئی ریحان کی بات کا جواب دیے بغیر برابر والے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

"یہ کس کی شامت آئی۔" ریحان نے مسکراتے ہوئے انجم پھوپھی سے پوچھا۔

"ایک ہی تو ہے جس کی تقدیر میں عتاب ہی عتاب ہے۔" انجم کا دل دکھ دیا تھا۔ ریحان کا رنگ اک لمحہ میں کئی رنگ بدل گیا۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی اور چہرے پر اک گمبھیر سی سنجیدگی چھا گئی۔ وہ جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے چپ چاپ سے۔

دانتے ہاتھ میں بھنچی ہوئی فوزیہ بڑے طنزیہ انداز میں بولی "بڑا برا لگا؟"

"برا لگے؟" انجم برس پڑیں۔ "صبح شام اسی کم بخت کو کوسا جاتا ہے۔ قصور ہو نہ ہو مورد الزام وہی ہے۔"

"قصور کے بغیر بھی کوئی کچھ کہتا ہے۔" الماری میں سعدیہ کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے بولیں۔

"دو گھنٹے سے چابیوں کے لیے کہا تھا خالہ جان نے۔۔۔ ابھی تک لاپتہ ہے وہ" فوزیہ بولی۔۔۔ "دادی کے حکم کا پاس تو ہونا چاہیئے تھا۔"

"کیا ہوا۔۔۔ بھول گئی ہو گی۔ ایسی کونسی قیامت ٹوٹ پڑی جو اسے ستو اگر کوسنے مل رہے ہیں۔" انجم غصہ میں تھیں۔ "اس کی کسی بات کو در گزر کرنا تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ بات بڑھائی جاتی ہے۔ دبائی نہیں جاتی۔"

"لے بے آپا آپ تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئیں۔ جیسے ہم اسے کوس رہے ہیں۔" فوزیہ

نے خفگی سے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا پڑی ہے۔۔۔ تم خواہ مخواہ الجھ پڑیں۔"۔۔۔ سعدیہ نے بہن کو ملامت کی۔

"دادی کے حکم کا پاس تو ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے تو اتنی سی بات کہی ہے۔" فوزیہ شاید لڑائی کے موڈ میں تھی۔

"انجم تم بھی خواہ مخواہ برا نہ مانو۔۔۔ سب دیکھ رہے ہیں لڑکی دن بدن لاپرواہ ہوتی جا رہی ہے۔ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔۔۔" سعدیہ نے گلہ کیا۔

"نہ گھر سے دلچسپی نہ گھر والوں سے۔۔۔" فوزیہ نے لقمہ دیا "ماں کی طرح بیزار ہی رہتی ہے ہر وقت۔۔۔"

"بیزار نہ رہے گی تو اور کیا ہو گا۔ گھر والوں کا سلوک اس سے کونسا اچھا ہے۔ بیہودہ سلوک سوائے بیزاری کے اور کونسا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔۔۔" انجم نے زہر اگلا۔

"سب اسے پتھر سمجھتے ہیں پھوپھی جان۔۔۔ پتھر۔۔۔!" ریحان کے ہونٹ پہلی بار ہلے۔

فوزیہ اور سعدیہ نے پلٹ کر حیرت سے ریحان کی طرف دیکھا۔ اسے سنجیدہ دیکھ کر فوزیہ ہنس دی۔ "سبحان اللہ تمہیں بھی زبان مل گئی اس کی قصیدہ گوئی کے لیے۔۔۔"

"حق کی بات کہہ رہا ہوں" ریحان اسی سنجیدگی سے بولے۔

"انجم تو حمایت کرتی ہی تھیں، اب یہ بھی بولنے لگے۔" سعدیہ نے تیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"کچھ خوف خدا بھی ہونا چاہیئے سعدیہ" انجم سمجھانے کے انداز میں گویا تھیں۔ "بن ماں باپ کی بچی ہے۔ کسی وقت تو بس کی۔۔۔!"

"کیا بات ہے؟" دادی حسن بانو کے کمرے میں آتے ہوئے بولیں۔ ریحان کمرے سے چپ چاپ نکل گئے۔

"آپ پوتی کو کوس رہی تھیں۔ انجم کو برا لگا۔۔۔" سعدیہ نے بات بڑھائی۔

"کیا تیر مار دیا میں نے؟" ماں بپھر گئیں۔۔۔ "تمہیں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے انجم۔ کام کی رہی ہے نہ کاج کی۔"

"امی حضور" انجم نے زبان کھولی۔۔۔ "سارا دن کنیزوں کی طرح آپ اس سے کام لینا چاہتی ہیں؟"

"اے ہے لڑکی۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔۔۔ کونسا کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے وہ کام میں۔۔۔ وہ تو کسی کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ کام کیا کرے گی۔"

"میں نے تو اسے اکثر کام کرتے ہی دیکھا ہے۔ اور بھی تو اس کے برابر کی لڑکیاں ہیں گھر میں۔۔۔"

"ہماری لڑکیوں کا تو اس سے مقابلہ نہ کرو بہن"۔ سعدیہ نے ٹوک دیا۔

بات خاصی الجھ گئی اور اچھی دیر تک بحث ہوتی رہی۔

ریحان کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ ماں، چچی اور دادی کے سلوک کو دیکھ کر طبیعت مکدر سی ہو گئی۔ صاعقہ کے ساتھ سب کا سلوک ناروا تھا۔ شاید آج انہیں اس بات کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔

ریحان باغ میں اُتر گئے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ فضا میں خنکی تھی۔ جس میں سبزے کی باس رچی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں نے کیاریوں میں جیسے آگ لگا رکھی تھی۔

تناور درختوں جھکی جھکی گھنیری شاخیں ہوا کی چھیڑ سے جھوم رہی تھیں۔ ریحان اپنی سوچوں میں گم الجھے الجھے نظر آ رہے تھے۔

وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے درختوں کے مہکتے سایوں تلے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

یکایک

وہ رک گئے۔

ستار کے تاروں کی کوئی چھیڑ رہا تھا۔ اک مبہم سی لے تھی۔ جو فضا میں ترنم بکھیر رہی تھی۔

چند ثانیے رک کر ریحان نے ادھر ادھر دیکھا۔ آواز کی سمت کا اندازہ لگایا۔ آواز دائیں طرف درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ ریحان مڑے اور اسی سمت چلنے لگے۔ آواز جیسے مقناطیسی کشش تھی جو انہیں کھینچے لیے جا رہی تھی۔

ایک برگد کے بوڑھے درخت کے گرد گھومتے پر ان کی نگاہیں سامنے سبزے پر جا رکیں۔ صاعقہ بے خودی کے عالم میں درخت کے تنے سے کمر لگائے نیم دراز تھی۔ اس

کی گود میں ستار تھا۔ اس کی انگلیاں لاشعوری طور پر تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔

وہ ستار بجا نہیں رہی تھی۔ یونہی تاروں سے کھیل رہی تھی۔ نظروں کا جمود بتا رہا تھا کہ وہ لاینحل سوچوں کے تانے بانے میں الجھی ہوئی ہے۔ بے چین خیالوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس کے ڈوبنے کا انداز کتنا دلفریب تھا۔

ریحان کا بے ساختہ جی چاہا کہ وقت کے پاؤں کی زنجیر بن کر اس کی رفتار کو یہیں روک لیں۔

لمحات تھم جائیں۔ صاعقہ اسی انداز میں ڈوبی رہے۔

اور!

وہ

درخت کی جھولتی شاخوں کا سہارا لیے اس کے ڈوبنے کے دلفریب انداز میں کھوئے رہیں۔

لیکن

وقت رُک نہ سکا۔

لمحات تھم نہ سکے۔

جانے کوئی آہٹ ہوئی یا دل کی دھڑکن آوازِ پا بن گئی تھی۔ صاعقہ کی نظروں کا جمود ٹوٹ گیا۔

اس نے گردن موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔

"ریحان۔۔۔" اک حیران سی۔۔۔ مبہم سی آواز اس کے لبوں سے نکلی۔ اس کی آنکھوں میں وہ کیفیت لہرائی جو سپنے حقیقت بن جانے پر آنکھوں میں کھل جاتی ہے۔

لیکن

دوسرے لمحے

اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔

کچھ یہی حال ریحان کا تھا۔ گھبرا سے گئے جیسے کوئی پارسا چوری کرتے پکڑا جائے۔

لیکن جلد ہی گھبراہٹ پر قابو پالیا۔ دماغ میں اس خفت و گھبراہٹ کو چھپانے کی بات آگئی۔

دو قدم اٹھا کر اس کے قریب آئے اور بولے۔ "تمہیں دادی حضور بلا رہی ہیں۔"

"مجھے؟" کشادہ آنکھیں حیرت سے کچھ اور کھل گئیں۔

"ہاں"

"کیوں؟"

"شاید ان کی چابیاں۔۔۔"

"ا۔۔۔۔۔و۔۔۔۔ہ۔۔۔!" صاعقہ ایک دم سہم گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں ڈر کے تاریک سائے لہرا گئے۔ مضراب اتارتے ہوئے وہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ "وہ غصہ ہو رہی ہوں گی" وہ بڑبڑائی۔

"بہت!"

صاعقہ نے ستار ایک طرف رکھ دیا۔ "میں قطعاً بھول گئی تھی۔۔۔۔" وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر جانے لگی۔

"بھولنے کی سزا بھی تو پاؤ گی۔" ریحان نے شوخی سے کہا۔

"سزا تو مقدر بن چکی ہے۔" آہستگی سے کہہ کر صاعقہ تیز قدموں سے چل دی۔

ریحان اسے دیکھتے رہ گئے۔

صاعقہ کے لہجے کی افسردگی نے ریحان کو بھی افسردہ کر دیا۔ پہلے ہی طبیعت مکدر تھی۔ اس پر یہ مایوس تکلم۔۔۔ وہ بے طرح افسردہ نظر آنے لگے۔

صاعقہ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتے رہے۔ اک گہری سانس لے کر وہ مڑے۔

درخت کے تنے کے قریب ستار رکھا تھا۔

انہوں نے ستار کی طرف دیکھا اور جانے کس جذبے کے تحت وہ آگے بڑھے۔۔۔ صاعقہ کی جگہ بیٹھتے ہوئے انہوں نے ستار اٹھا لیا، مضراب لی اور ستار کے تاروں پر ان کی انگلیاں رقص کرنے لگیں۔

اور

کافی دیر بعد صاعقہ واپس لوٹی تو باغ کا سناٹا ستار کے تین سروں سے ٹوٹ رہا تھا۔

وہ بے قدموں سے آگے بڑھی۔
جھجکتی سی نگاہ ڈالی۔
ریحان بے خود تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ اور انگلیاں تیزی سے تاروں کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ نغمے ابل رہے تھے۔ تار جھنجھنا رہے تھے۔ اور ساری فضا میں درد بکھرا ہوا تھا۔
صاعقہ آج ریحان کا یہ نیا روپ دیکھ کر ششدر و مبہوت رہ گئی۔
وہ دیکھتی رہی۔
ریحان کی وجدانی کیفیت عروج پر تھی۔
تار چیخ رہے تھے۔ اور ان چیخوں میں صاعقہ کو اپنی زخمی روح کی پکار سنائی دے رہی تھی۔
اس پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہونے لگی۔
اتنا عظیم فن کار۔۔۔۔۔۔ جس نے اس کے دردِ دل کو چھو لیا تھا۔ صاعقہ کا جی چاہا اس کے قدموں سے لپٹ جائے۔ ان انگلیوں کو تھام لے جو اس کی روح کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔
تار چیختے رہے۔ درد فضا میں بکھرتا رہا۔
ریحان پر بے خودی طاری رہی۔
"اُف ریحان" صاعقہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ آنسو بے اختیار آنکھوں سے گرنے لگے۔
"بس کرو۔۔۔۔ ریحان بس کرو"۔۔۔ وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کہہ نہ سکی۔
وہ بے اختیار ہو گئی۔
اور بے اختیارانہ ریحان کی طرف بڑھی۔ اس عظیم فنکار کے قدموں کو چھونے کے لیے۔ اس کی درد بکھیرتی انگلیوں کو تھام لینے کے لیے۔
لیکن
دفعتاً اسے ہوش آ گیا۔ وہ کیا کرنے والی تھی۔ انگاروں کی تپش دور ہی سے کیا کم تھی

اسے ان انگاروں سے دور رہنا چاہیئے۔ دور۔۔۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔ اور دور!
وہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔
تیزی سے بھاگتی رہی۔
دور۔ دُور۔۔۔۔ وہ ان انگاروں سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔

O

۳۳

اس موسم میں شام نگر کے باغوں میں پکنک تو اب اک رسم ہی بن گئی تھی۔ ہر سال یہ پکنک اک خاص اہتمام سے منائی جاتی۔ سارا کنبہ اکٹھا ہوتا اور تین چار دن ان مہکتی فضاؤں میں جی بھر کر لطفِ زندگانی اٹھایا جاتا۔

حسبِ سابق اس سال بھی پکنک کا پروگرام تھا۔ تیاریاں زوروں پر تھیں، خدام اور کنیزوں کا ایک قافلہ سا روانہ ہو چکا تھا تاکہ اہلِ خانہ کے پہنچنے سے پہلے ضرورت و آرام کی ہر چیز تیار رکھی جائے۔

چھوٹے بڑے پکنک کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ سمیرا نے تو پھولوں کی مناسبت سے لباس تیار کروائے تھے۔ خاندان کی سب جوان لڑکیاں اُمنگوں اور چاہتوں سے اپنے لباسوں کی ترتیب میں مصروف تھیں۔

خوشی کی اک لہر تھی۔ جو گھر کے ہر فرد کو چھوتے ہوئے گزر رہی تھی۔ ریحان بھی اک نئی ترنگ اک نئے ولولے سے تیاری کر رہے تھے۔ صاعقہ کی قربت ان دنوں میسر آنے کی بڑی توقع تھی۔ وہ اپنے دل کی دھڑکنیں اس رنگین فضا میں صاعقہ تک ضرور پہنچا دیں گے۔

لیکن خوشی کی لہر صاعقہ سے ٹکرا کر رنج و غم کی ندی بن جاتی تھی۔ وہ آجکل کتنی پریشان تھی۔ طوفانوں میں گھر کر رہ گئی تھی۔ ریحان کا بڑھتا ہوا التفات ساری ذہنی پریشانیوں کا موجب تھا۔ ان کی نظروں کی ملائمت۔۔۔ خاموش تعاقب اور اندازِ شیفتگی سے وہ بے خبر نہ تھی۔ لیکن اس کا ذہن ان کی صداقت سے انکاری تھا۔ وہ اس بدلے ہوئے رویے کو ریحان کی جدت پسند طبع کا اک کرشمہ سمجھ رہی تھی۔ بہروپیئے نے دوستوں اور ہم جلیسوں کی دل لگی اور قہقہوں کے لیے سامان فراہم کرنے کے لیے اک نیا روپ دھار ا تھا۔

انجم پھوپھی اور فخر چچا تو گھر والوں کے ذہنی دھارے نہ بدل سکے تھے۔ ہاں اسد نے اپنے ہم عمر ساتھیوں کی سوچ کے رخ کسی حد تک ضرور موڑ لیے تھے۔ اور اب ریحان کے بدلے ہوئے رویے سے تقریباً سب نوجوانوں کا رویہ صاعقہ سے کسی حد تک نرم ضرور ہو گیا تھا۔

اب اسے اپنی محفل میں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ سینما کا پروگرام ہوتا تو اسے مدعو کیا جاتا۔ گھر میں کوئی تقریب ہوتی تو اس کی شرکت دوسرے افراد کی طرح ضروری سمجھی جاتی۔ حسن بانو کو کوفت ہوتی۔ سعدیہ اور فوزیہ غراتی رہتیں۔ لیکن نئی پود نے اپنے رویے میں خاصی لچک پیدا کر لی تھی۔ صرف سمیرا واحد فرد تھی جس کے رویے میں تبدیلی نہ ہوئی۔ صاعقہ اب بھی اس کی نظروں میں ہیچ تھی۔ منحوس تھی۔ بدشگنیوں کا عنوان تھی۔ یہ سب اس کی والدہ فوزیہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

پکنک کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ثمینہ نے صاعقہ سے چلنے کی پُرزور سفارش کی تھی۔ گلرخ، شاہرخ اور فریدہ نے بھی یاددہانی کرائی تھی۔ لیکن صاعقہ پکنک پر نہ جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ ان سب کا التفات تو اس کی ذہنی پریشانیوں میں تے اضافے کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ وہ اس اخلاق و مروت کو ریحان کی سوچی سمجھی سازش سے تعبیر کر رہی تھی۔ مطمئن ہونے کی بجائے وہ خوف زدہ سی ہو جاتی تھی۔

پکنک پر روانگی کا دن آ پہنچا۔ صبح ہی صبح یہ قافلہ کوچ کرنے والا تھا۔

موٹروں کی قطار سی تھی۔ جو گیٹ تک جا پہنچی تھی۔ کچھ ضروری سامان ویگنوں میں لادا جا رہا تھا۔

صاعقہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اداس پریشان افسردہ زندگی نے کاش اسے بھی جینے کا حق دیا ہوتا۔ کتنی چہل پہل تھی الحمراء میں۔ اس کی ہم عمر لڑکیوں کے شوخ و شنگ لباس ان کے سینے میں دھڑکتی ہوئی خوشیوں، امنگوں اور ولولوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ مسکراتے چہروں پر ذہنی سکون و طمانیت کی کتنی واضح جھلک تھی۔

وہ ثمینہ، شاہرخ اور فریدہ وغیرہ کے اصرار کے باوجود پکنک پر نہیں جا رہی تھی۔

پچھلے ہی سال کا تو واقعہ تھا۔

کچھ کچھ اسی طرح تھی۔ صبح ہی صبح کاریں الحمراء کے پورچ سے لے کر گیٹ تک لمبی قطار بناتی چلی گئی تھیں۔ بجھے بجھے دل سے وہ بھی تیار ہوئی تھی۔

اور پورچ میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی کاروں میں سوار ہونے والوں کو دیکھ رہی تھی۔

آجاؤ صاعقہ" انجم نے پھوپھی نے بلایا تھا۔

"اس موٹر میں جگہ نہیں ہے۔" ریحان نے سٹیئرنگ تھامتے ہوئے کہا تھا اور اس کے اٹھتے قدم برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی رک گئے تھے۔

"کیوں تنگ کرتے ہو ریحان۔۔۔۔ پچھلی سیٹ پر تین لڑکیاں بیٹھ سکتی ہیں۔"

"صاعقہ نہیں"۔ ریحان نے ہنس کر آہستگی سے کہا تھا۔ لیکن اس نے اپنا نام سن لیا تھا۔

"کیوں؟"

"پھوپھی جان کیوں اجل ہمارے ساتھ سوار کرا رہی ہیں۔۔۔ آپ چاہتی ہیں راستے ہی میں ٹکر ہو جائے۔۔۔"

"ریحان۔۔۔۔چپ رہو" انجم پھوپھی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ آواز صاعقہ تک پہنچے۔

"غلط تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ ہماری زندگی عزیز نہیں تو بے شک آزما دیکھیئے۔"

"اسے بھی تو جانا ہے آخر۔۔۔۔"

"سامان والی ویگنوں میں بٹھا دیجئے۔۔۔۔ ٹکر ہو بھی گئی۔ تو مالی نقصان ہو گا۔ جانی نہیں۔۔۔" ریحان نے قہقہہ لگایا تھا۔

اور صاعقہ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں بھاگی تھی۔

ریحان کو بری طرح ملامت کرنے کے بعد انجم پھوپھی نے آکر کتنے پیار سے اسے چمکارا تھا۔ کتنی تسلیاں دی تھیں۔ کس محبت سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ اور جب بھی وہ چپ نہ ہوئی تو خود بھی رونے لگی تھیں۔ کتنا فراخ اور دردمند دل تھا ان کے سینے میں۔ صاعقہ والہانہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

لیکن اس پیار کے باوجود ریحان کی باتوں کی خلش دل سے نہ نکلی تھی۔ پچھلے سال کا واقعہ چٹان بن گیا تھا۔ اور فریدہ، شاہرخ اور ثمینہ کے محبت بھرے اصرار کے باوجود وہ چٹان نہ پھلانگ سکی تھی۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی رنگ و بو کے جھلملاتے سیلاب کو دیکھ رہی تھی۔

الحمراء کے بیرونی برآمدے میں ایک مسرور سا شور تھا۔ نئی پود آج دادی حسن بانو سے بھی مرعوب نہ تھی۔ ہنسی خوشی چہچہا رہے تھے سب۔۔۔۔

ریحان آئے۔ فاختئی سوٹ میں ان کا مردانہ حسن کتنا نکھرا ہوا تھا۔ کتنے مسرور نظر آ رہے تھے وہ۔۔

آتے ہی انھوں نے برآمدے اور پورچ میں جمع شدہ لوگوں پر اک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ نگاہیں گوہر مقصود نہ پاکر حیران سی ہو گئیں۔ لوگ کاروں میں بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ ریحان جلدی سے کاروں کی طرف آئے۔ ایک ایک گاڑی دیکھی۔۔۔ رنگ و بو کا سیلاب موٹروں میں سما گیا تھا لیکن صاعقہ انھیں کہیں نظر آئی۔ کیا وہ پکنک پر نہیں جا رہی؟

اس خیال سے ان کی ساری خوشیوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔

کاریں رینگنا شروع ہو گئیں۔ اسد، فرخ، فریدوں اور شاہد نے موٹر کا ہارن زور سے دے کر انھیں متوجہ کیا۔

لیکن ریحان ان کی طرف دیکھے بغیر اندر کی طرف لپکے۔ وہ صاعقہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

برآمدے میں آیا سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"صاعقہ کہاں ہیں؟" ریحان نے جلدی سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔"

"تیار ہو رہی ہیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ تو نہیں جا رہیں۔"

"کیوں؟"

"اللہ جانے۔ بہتیرا کہا ہے۔ لیک ہی نہ۔۔۔۔۔"

آیا جانے کیا کہتی رہی۔ ریحان تیز قدموں سے اس کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

"صاعقہ!" پردہ ہٹاتے ہوئے انھوں نے ملائمت سے پکارا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی جاتی ہوئی موٹروں کو نگاہِ حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی محویت اس آواز سے ٹوٹی۔

جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔

ریحان کو پردو تھائے کھڑے دیکھ کر وہ حیران سی ہوئی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں؟" ریحان اُس کی نظروں سے کچھ نادم سے ہو گئے۔

"کیوں؟" وہ اب تک حیران تھی۔

"جاؤ گی نہیں۔۔۔؟" وہ اسی انداز میں بولے۔

صاعقہ نے سر تا پا ریحان کو دیکھا۔

ریحان دو قدم بڑھا کر اندر آ گئے۔ پریشان پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے صاعقہ کی طرف دیکھا۔

دونوں کی نظریں ملیں۔

جذبات کے اظہار میں کتنی صادق ہوتی ہیں نظریں۔ سب کچھ صاف صاف کہہ دیتی ہیں۔ کچھ بھی نہیں چھپاتیں۔

لیکن بھٹکے ہوئے ذہن ان نظروں کی صداقت پر ایمان کہاں لاتے ہیں۔ صاعقہ نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔۔۔ اور باہر دیکھنے لگی۔

چند لمحے بوجھل سا سکوت رہا۔

پھر ریحان آہستگی سے مایوس سی آواز میں بولے۔۔ "تم نہیں جا رہیں؟"

نہیں۔۔۔" تلخ سا جواب تھا۔

ریحان نہ جانے کی وجہ پوچھنے کی جرأت تو نہ کر سکے۔ ہاں اسے آمادہ کرنے کے لیے بولے۔ "سب جا رہے ہیں۔ تم اکیلی یہاں کیا کرو گی!"

اور صاعقہ نے جواباً ایسی نظروں سے انھیں دیکھا کہ ریحان تڑپ کر رہ گئے۔ کتنا طنز تھا اس کی نظروں میں۔۔۔۔۔۔۔

"تیار ہو جاؤ نا!" لجاجت سے بولے۔ صاعقہ نے مڑ کر ریحان کی طرف دیکھا۔ اور پچھلے سال کا سلگتا ہوا واقعہ اس کے ذہن میں اس طرح دہک اٹھا جس طرح پھونک مارنے سے راکھ اڑنے پر چنگاری دہکنے لگتی ہے۔

ریحان ان نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ مڑتے ہوئے گھبرائی سی آواز میں بولے۔

"جلدی کرو۔۔۔۔۔۔ تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔ تمہیں۔۔۔ تمہیں جانا ہو گا۔"

"لیکن جاؤں گی کیسے؟" صاعقہ کے لبوں پر اک جلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

ریحان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ حیران سی نظروں سے طنز کا لپکا سا منظر آیا صاعقہ کی آنکھوں میں۔۔۔۔۔۔

استفہامی نظروں سے دیکھا۔ لیکن کچھ کہا نہیں گیا۔

"ویگنیں تو کب کی جا چکیں۔۔۔۔" صاعقہ نے بھرپور وار کیا۔

"صاعقہ!" ریحان تڑپ اٹھے۔۔۔۔۔ بیچارگی، ندامت اور احساس شکستگی ان کے سراپا پر چھا گیا۔ اپنے الفاظ انھیں بھولے نہیں تھے اور آج ہی صبح صبح اسد نے بھی تو پچھلے سال کا یہ واقعہ دہرا کر انہیں احساس ندامت سے دوچار کیا تھا۔

اک خراش مٹانا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں تو زخم ہی زخم تھے۔ ریحان کتنے مضطرب، کتنے پریشان اور کتنے نادم دکھائی دے رہے تھے۔ وہ صاعقہ کے ذہن سے ان ستے زخموں کو کیوں کر مٹا سکیں گے۔ یہ احساس جان لیوا ہی تو تھا۔

اک دھواں سا سینے سے اٹھا اور ان کا دم گھٹنے لگا۔ دل فگار سی آہ لبوں پر پھڑپھڑائی۔ مایوس آواز میں بولے "تم اب تک مجھے معاف نہیں کر سکیں؟"

یہ لمحہ

یہ کٹھن لمحہ صاعقہ کے لیے کتنا پر خطر تھا۔ یقین اور بے یقینی کا درمیانی خلاء۔۔۔!

لیکن اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"صاعقہ"! لجاجت، منت اور اپنائیت سے بھرپور آواز تھی۔ لیکن صاعقہ کسی خوش فہمی کو ذہن میں جگہ دینے کو تیار نہ تھی۔ رخ پھیرے بغیر جواب دیا۔۔۔ "جائیے ریحان۔۔۔ سب گاڑیاں جا چکیں۔۔۔۔"

کتنے بے جان سے لمحے گزر گئے۔

صاعقہ نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔۔۔۔۔۔۔ بے حس۔۔۔ اور لاتعلق سی کھڑی رہی۔

اور

اور جب کچھ دیر کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو ریحان کمرے سے جا چکے تھے۔"

کتنی ہی دیر اس پردے کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ جو ان کے جانے کے بعد لرز رہا تھا۔

جانے کیوں اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔

ریحان چلے گئے تھے۔ شاید اس کا دل متمنی تھا کہ اس کے کہنے کے باوجود وہ یہیں ٹھہرے رہتے۔

ان کا چلے جانا ہی تو ٹھیس تھی۔ جو بھرے پیمانوں کو لگی۔۔ لبالب پیمانے چھلک جانے ہی تو تھے۔

وہ خوب روئی۔۔۔۔۔

دوپہر کے کھانے کے لیے جب آپا اسے کہنے آئی، تو اس کی سرخ سرخ متورم آنکھوں کو دیکھ کر بیقرار ہو گئی۔ اس کی حرماں نصیبی پر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن کسی قسم کی جذباتی کمزوری کا اظہار کر کے وہ اسے اور غمزدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔۔ اور پھر یہ کوئی نئی بات بھی تو نہ تھی۔ سالوں کے سیاہ و سفید سینوں پر یہ دھبے پڑتے ہی چلے آئے تھے۔

صاعقہ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

"بھوک نہیں ہے آپا۔۔۔"

"تھوڑا سا کھا لو۔۔۔!"

"مطلقاً جی نہیں چاہ رہا۔۔۔"

"کبھی تو مان لیا کرو بات۔۔۔۔ چلو میری خاطر دو لقمے لے لو۔ تم نے کھانا نہ کھایا تو میں بھی نہ کھاؤں گی۔۔۔۔"

"یہ بڑی بُری عادت ہے تمہاری۔"

"تم اچھی طرح جانتی بھی ہو۔۔۔۔"

لیکن جی نہیں چاہ رہا۔۔۔۔"

"بہت اچھا۔۔۔۔۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن میں کھانا کھاؤں گی نہیں۔۔۔۔ بھوکی رہوں گی۔۔۔۔۔ میری خاطر تم دو نوالے بھی نہیں لے سکتیں؟"

اور اسے آپا کی خاطر اٹھنا پڑا۔ واقعی جس دن بھی اس نے کھانا نہیں کھایا، آپا بھوکی رہی۔ کتنی بے مثل چاہت تھی۔ اس بھری دنیا میں کوئی تو تھا جسے وہ اپنا چاہ

سکتی تھی۔

مونس آپا کی خوشنودی کے لیے صاعقہ اٹھی اور ڈائننگ روم کی طرف چل دی۔ طبیعت بیزار تھی۔ اس نے لباس بھی تبدیل نہ کیا۔ رونے سے چہرہ اترا اترا سا تھا۔ لیکن حسن کا یہ مضمحل انداز تڑپا دینے کی ساری صلاحیتیں رکھتا تھا۔

کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر میز کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ریحان پر پڑی۔ میز پر کھانا چنا ہوا تھا۔ لیکن ریحان نے شروع نہیں کیا تھا۔ سر قدرے جھکا رکھا تھا۔ بڑے پریشان سے نظر آ رہے تھے۔

صاعقہ انھیں دیکھ کر ششدر سی رہ گئی۔

کیا وہ اس کی وجہ سے پکنک پہ نہ گئے تھے؟

دل سے اک مسرت بھری لہر اٹھی

لیکن

یہ لہر

دماغی نسوں سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گئی۔ صاعقہ کو چکر سا آ گیا۔ وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ کہنیاں میز پر ٹکا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

ریحان پہلے جھجکے لیکن پھر بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔

کتنی ذہنی دوریاں تھیں۔

یہ کیوں کر مٹیں گی۔

یہ فاصلہ کیسے پاٹا جا سکے گا۔

گم صم ریحان یہی سوچتے رہے۔

صاعقہ اک بار پھر ڈگمگا رہی تھی۔ یقین اور بے یقینی کا خلا کتنا پر خطر تھا۔ وہ بھٹک رہی تھی۔ کنارے سے ٹکرا ٹکرا کر ڈوب رہی تھی۔

کھانا نہ ریحان نے چھیڑا تھا نہ صاعقہ نے۔۔۔ اک خاموشی مسلط تھی۔ لیکن یہ خاموشی روحوں کو برابر چھیڑ رہی تھی۔

اس چھیڑ سے گھبرا کر صاعقہ نے ہاتھوں سے سر اٹھایا۔

ریحان نے اس کی سرخ سرخ متورم آنکھوں کو دیکھا۔ حسن کا یہ مضمحل اور سوگوار

انداز ترپا ہی تو گیا۔
کتنے بے چین اور بے قرار نظر آئے وہ۔۔۔
انہوں نے کچھ کہنا چاہا
لیکن
صاعقہ اُٹھ کر چل دی۔
ریحان کھانا کھانے کی بجائے بے دردی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔

○

(۳۴)

"آپا"
"ہوں"
"ایک بات پوچھوں؟"
"پوچھو۔۔۔"
"آپا۔۔۔!"
"کہہ بھی چکو۔۔۔"
"آپا۔۔۔ سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے؟"
"قیامت کے دن نکلے گا۔"
"آپا۔۔۔!" بے اختیارانہ چیخ اٹھی ۔ اور آپا کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی لرز گئی۔
"کیا ہوا بیٹی؟" پیالی میز پر رکھتے ہوئے آپا نے گھبرا کر پوچھا۔
"کبھی تو دل خوش ہونے دیا کرو آپا۔۔۔ کبھی تو خوش ہونے دیا کرو۔" صاعقہ نے تکیئے پر سر پٹخ دیا۔
"بیٹی۔۔۔!"
"کبھی تو دل خوش ہونے دیا کرو۔۔۔" اس نے تکیئے میں منہ چھپالیا۔
"کیا ہوا میری بچی؟" ۔۔۔ آپا اس پر جھک گئی۔ شفقت سے ہاتھ اس کے بالوں پر پھیرتے ہوئے پوچھا۔
صاعقہ اسی طرح پڑی بڑبڑاتی رہی۔
"بتاؤ گی نہیں؟" آپا نے کندھوں سے پکڑ کر اسے پیار سے اٹھایا "کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں ۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔" صاعقہ اپنے ہیجانی جذبات پر قابو پا کر

آہستگی سے بولی۔

لیکن اس کچھ نہیں سے آپا کی تسکین نہ ہو سکی۔

"کیا بات ہے؟" صاعقہ کے قریب بیٹھ کر آپا نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے قدرے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ---" وہ بڑبڑائی ۔

"کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں ---ہاں --- خواب ہی دیکھا ہے۔"

"کیا دیکھا؟"

"کچھ نہیں ---" صاعقہ نے سر نفی میں ہلا کر کہا۔

"بتاؤ تو سہی---" آپا نے پیار سے چمکارا ۔ "تعبیر بتاؤں گی---کیسا خواب تھا۔"

"بڑا سہانا۔" صاعقہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"پھر اس قدر گھبرائی کیوں ہو؟"

صاعقہ نے اک گہری سانس لے کر آپا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے لیے صبح کی چائے لے کر آئی تھی۔ لیکن صاعقہ کی پریشانی نے اُسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

لیکن وہ بھی تو مجبور تھی۔

"کیا دیکھا تھا؟" آپا نے اس کے مرمریں شانوں پر ڈھلکتی ڈوریوں کو درست کیا۔ گلابی ریشمی گاؤن کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی ڈوری کی گرہ ڈال دی۔

صاعقہ چُپ چاپ بیٹھی سامنے دروازے کو دیکھتی رہی۔

"کیسا خواب تھا؟"

"کہہ دیا نا بڑا سہانا ۔"

"کب دیکھا ---؟"

"کب ---؟ ہر روز دیکھتی ہوں آپا۔ -- مسلسل دیکھ رہی ہوں۔ آج رات بھی دیکھا۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"یہی تو پوچھتی ہوں ---کیا دیکھتی ہو----؟"

"دیکھتی ہوں ---دیکھتی ہوں آپا--- سورج مغرب سے نکل رہا ہے۔ -- مغرب سے --- لیکن --- لیکن یہ ممکن تو نہیں ---- تم --- تم کہتی ہو --- سورج قیامت کے دن مغرب سے نکلے گا--- آپا --- آپا -- یہ کہہ کر تم نے میرے حسین خواب کا طلسم توڑ دیا ہے۔" اس نے آپا کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔

آپا نے محسوس کیا کہ اس کا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ آپا نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولی ۔ "گھبرانے کی بات نہیں بیٹی --- خواب کی تعبیر الٹ ہوتی ہے۔ جو کچھ دیکھتی ہو--- اس کے برعکس بات ہو گی--"

"آپا--" صاعقہ تڑپ کر اس سے الگ ہو گئی ۔ سر کو اضطرابی جنبش دیتی ہوئی وہ بستر پر گر گئی اور تکیوں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"یا اللہ" آپا بے طرح گھبرا گئی ۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں---" گھبرائی گھبرائی سی آپا کبھی پیار سے تھپک کر -- کبھی اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ، کبھی اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے رونے کا سبب پوچھنے لگی۔

لیکن

وہ سسکتی رہی --- کچھ نہ بتایا۔

"اللہ جانے کیا ہوتا جا رہا ہے اسے ۔" آپا بڑبڑائی --- "کل پکنک پہ چلی جاتیں تو اچھا تھا۔ طبیعت بہل جاتی۔ صبح شام کھوئی کھوئی رہتی ہو۔ صحت کتنی گرتی جا رہی ہے۔ اُٹھو --- اُٹھو میری بچی --- چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے لو پیالی ---"

"آپا --- تم جاؤ ---- جاؤ--- مجھے تنہا چھوڑ دو ---!" صاعقہ نے لجاجت سے کہا۔

"چائے تو پی لو ۔"

"تم جاؤ--- چلی جاؤ ------ مجھے نہ ستاؤ --- چلی جاؤ" صاعقہ چیخ اُٹھنے کو تھی۔

آپا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

صاعقہ کی یہ حرکت اُس کی ذہنی پریشانیوں کی غماز تھی۔

پریشان وہ کئی دنوں سے تھی ۔ لیکن کل کے واقعہ سے تو پریشانیاں جنون کی

حدود کو چھونے لگی تھیں۔

ریحان پکنک کے لیے کس اصرار سے اسے لینے آئے تھے۔

وہ نہیں گئی تھی۔

ریحان خود بھی رہ گئے۔

کیوں ؟؟؟

یہ کیوں اتنا پھیلتا گیا، اتنا پھیلتا گیا کہ اس کی ساری ہستی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں اور دماغی قوتیں اس کیوں کا جواب نہ دے سکیں۔ ریحان کسی مسلسل مذاق کی بنیاد بس استوار کر رہے تھے۔

یقیناً یقیناً

صاعقہ کی ذہنی کیفیتوں کا ایک ہی جواب تھا۔ دماغی قوتوں کا متحدہ فیصلہ۔ لیکن اس نفی کے باوجود اس کے دل کی دنیا میں کچھ رنگین سی پرچھائیں لہرانے لگی تھیں۔ اک خوش فہمی جسے وہ کسی طور سر اُٹھانے نہ دیتی تھی، پیدا ہو ہی گئی۔

جذباتی تضاد نے صاعقہ کو پاگل بنا رکھا تھا۔ رات اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اُس کا سیمیں بدن دُکھنے لگا۔ اس کا سینہ پھٹ جانے کو تھا۔ گھبرا کر وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

جانے رات کا کونسا پہر تھا۔ وہ اپنے سُلگتے جذبات کی تسکین کے لیے چمن کی طرف آنکلی تھی۔

چاند کا سفینہ نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں تیر رہا تھا۔ ہر چیز پر چاندنی کا عکس لرزاں تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی نے اندھیروں پر سیمائی خول چڑھا دیا ہو۔ اس سیمائی خول میں لپٹے ہوئے اندھیرے بڑے دلکش تھے۔

لیکن صاعقہ کے من کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ پارے کی طرح مضطرب تھی۔ گھبرا کر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ اپنے تپتے ہوئے ذہن سے بہت کچھ پوچھنے لگی۔

"کون؟"

اور صاعقہ نے اس آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔

بالکل سامنے

ریحان کھڑے تھے۔۔۔ وہ گھبرائی۔ اس کا دل بے طرح دھڑکا۔

"صاعقہ؟" ریحان نے ایک پاؤں سیڑھی پر رکھ دیا۔ ان کے لباس شبخوابی کی سنہری ڈوریاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔

صاعقہ کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کرلی۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی صدا نہ نکل سکی۔

"صاعقہ؟" ریحان قدرے جُھک گئے۔ وہ اس کے کتنے قریب تھے۔ گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، ہلکے گلابی رنگ کے ریشمی گاؤن کی سمٹی تہیں پھیل گئیں۔ اس کا سنہری پیکر گاؤن میں لپٹا ہوا کتنا حسین منظر آ رہا تھا۔ سیاہ بکھری زلفیں۔۔۔ نیند کے نشے سے مخمور آنکھیں، تھکا ہوا حسین چہرہ۔ ریحان کو وہ کسی گیت۔۔۔ دلنواز گیت کا تاثر معلوم ہو رہی تھی۔

"اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں؟" ریحان نے اس کے جانے کے ارادے کو بھانپ لیا۔

"کچھ نہیں۔"

"جانتی ہو کیا وقت ہے؟"

"نہیں"

"دو بج رہے ہیں۔"

صاعقہ نے حیرانگی کا مطلقاً اظہار نہیں کیا۔ اسے وقت کا بخوبی اندازہ تھا۔

"اب تک کیوں جاگ رہی ہو۔۔۔" بڑی ہمت سے ریحان نے پوچھ لیا۔ صاعقہ جواب دیے بغیر مڑی۔

"صاعقہ!" ریحان جلدی سے سیڑھیوں پر قدم رکھتے اس کے برابر آگئے۔ لیکن وہ رکی نہیں۔۔۔ برآمدے میں آگئی۔ ریحان نے پھر اُسے پکارا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔

کچھ سوچ کر ریحان بڑھے۔ صاعقہ کے سامنے آتے ہوئے انہوں نے اس کا رستہ روک لیا۔ "میری کسی بات کا جواب بھی دینا تمہیں گوارا نہیں؟" کتنا گلہ تھا۔ کتنی بے چارگی تھی۔

صاعقہ نے دراز پلکوں کو اُٹھا کر انہیں دیکھا۔۔۔ محرابی دروں سے چاندنی

برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ ریحان اندھیرے میں تھے۔ لیکن اُن کا خاکہ اپالو کے مجسمے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

گھبرا کر صاعقہ نے نظریں جھکالیں۔

"خطا کار سنگینیٔ جُرم کے باوجود مستحسن سلوک کا متمنّی رہتا ہے ۔ میں ۔۔۔ میں اپنی خطاؤں ۔۔۔"

"مجھے جانے دیں" وہ گھبراہٹ سے کراہ چاہتی تھی۔ ریحان کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ رہی تھی ۔

"کچھ دیر کے لیے رُک جاؤ" ریحان کا انداز جذباتی ہوگیا۔

"کیوں؟" نہ جانے کیوں صاعقہ کے لبوں سے نکلا۔

"کیوں؟" ریحان نے اسے دیکھا ۔۔۔ نیم وا خوابیدہ سی نظروں سے صاعقہ نے ستون کا سہارا لے لیا۔۔۔ ریحان کیا کہنا چاہتے تھے، وہ سمجھنے کے باوجود سمجھنا نہ چاہتی تھی۔

ریحان اس کے قریب آ گئے ۔ ان کی مخمور نگاہوں میں پیار کے مسحور کُن جذبے لہرا رہے تھے۔ صاعقہ نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"شاید ۔۔۔ شاید مجھے یہ بات نہ کہنا چاہیئے تھی۔ ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ لیکن میں خود نہیں جانتا ۔۔۔ صاعقہ ۔۔۔"

اُن کی پوری بات سنے بغیر صاعقہ بھاگی ۔

اور بھاگتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر مسہری پر گر گئی۔

اس کا دم یوں پھول رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت دوڑتے ہوئے طے کر آئی ہو۔

اور پھر باقی رات اُس نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ اور جب اس کا ذہن معمول پر آیا ۔ تو

وہ

ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔

"کیا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے۔"

اس کا جی چاہتا تھا کہ اس انہونی بات کو اٹل حقیقت سمجھ لے۔

لیکن ناممکن سمجھ لینا بھی تو اس کے بس میں نہیں تھا۔

صبح سویرے جب آیا اس کے لیے چائے کی ٹرے لے کر آئی ۔ تو وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی۔ کبھی یقین سے ہم کنار تھی۔ اور کبھی بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی ۔ اسی گومگو کی کیفیت میں اُس نے آیا سے پوچھا تھا کہ "کیا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے۔۔۔"

اور

آیا کے جواب نے اُس کے جذبات کی کرچیاں کرچیاں کر دی تھیں۔

صاعقہ کا یقین محکم ہوگیا۔

کہ

سورج کبھی مغرب سے نہیں نکل سکتا۔

ناممکن کبھی ممکن نہیں بن سکتا۔

اور ۔۔۔ اور !

ریحان وہ کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو آجکل بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑے ہی ذہنی اتار چڑھاؤ کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ ریحان کے اس طرح بننے کی کوشش کا وہ منہ توڑ جواب دے گی ۔۔۔ وہ کسی کمزوری سے مغلوب نہ ہوگی۔۔۔ وہ اپنے وقار کے تحفظ کے لیے سینے میں مچلتے طوفانوں کا پوری طرح مقابلہ کرے گی۔

○

٣٥

ریحان نے ان ذہنی دُوریوں اور خیالی تنفرقوں کو جو صاعقہ اور اُن کے درمیان خلا بن چکے تھے، دور کرنے کا عزم کر لیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ ریحان بیرونی باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اپنے اس عزم پر وہ پورے استحکام سے قائم تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔

دفعتاً ان کی نگاہ درختوں کے جھنڈ کے عقب میں مرمریں چبوترے پر پڑی۔ وہاں صاعقہ بیٹھی تھی۔ ہلکے پُھلکے سفید لباس میں وہ کوئی فردوسی مخلوق نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں زرد گلاب تھا۔ بے خیالی کے عالم میں اس کی پتیاں نوچ رہی تھی۔ چہرے پر بشاشت نہ تھی۔ اک تھکن تھی۔ جو پژمردگی سے مشابہ تھی ۔۔۔ سوگوار شبنمی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے رینگ رہے تھے۔

ریحان کے قدم خود بخود اس کی جانب اُٹھنے لگے۔ چند لمحوں بعد وہ درختوں کا جھنڈ پار کر کے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

صاعقہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ سوگوار آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے اک چمک اُبھری۔

لیکن دوسرے لمحہ یہ چمک بجھ گئی۔ آنکھوں میں تاریکی ہی تاریکی رہ گئی۔ بالکل ایسے جیسے بجلی کی چمک معدوم ہونے پر بادلوں سے کثیف مطلع پر تاریکی ہی تاریکی رہ جائے۔ چہرے پر بیزاری کا تاثر لاتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

"صاعقہ!" ریحان نے چبوترے کی سیڑھی پر دایاں پاؤں رکھتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔

"جی" بلا جھجک جواب تھا۔ وہ تو جیسے ہر آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر بیٹھی تھی۔

"یہاں تنہا تھی ہو۔ پکنک پہ چلی جاتیں تو اچھا ہی تھا۔"

"میری تنہائیوں کا آپ کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احساس ہونے لگا ہے۔"

طنزیہ لہجہ دل میں نشتر کی طرح اتر گیا۔ لیکن ریحان اس طنز کو خفیف سی مسکراہٹ میں ڈبوتے ہوئے بولے۔ "شکر ہے تم نے اتنا جان تو لیا۔"

"جان لینے کو تو بہت کچھ جان لیا ہے ۔۔۔" وہ بدستور تلخ لہجے میں طنز کر رہی تھی۔

"پھر بھی یقین نہیں ۔۔۔" ریحان آج شاید بُعد کی ساری مسافتیں طے کر لینے پہ تُلے تھے۔

"اندھیرے کو اُجالا کہنا خود فریبی ہوگی" وہ لاتعلقی سے بولی۔

"صاعقہ" ریحان نے سر جھکا کر کہا۔ "میرے جذبات کو یوں مجروح نہ کرو۔"

صاعقہ نے اُن کی جانب بڑی بے باکی سے دیکھا۔ نادم نادم سے ریحان دل کی گہرائیوں میں کس سُرعت سے اترے جا رہے تھے۔ لیکن وہ کسی جذباتی کمزوری کا شکار نہ ہونے کا تہیہ کر چکی تھی۔

"آپ کے جذبات قابلِ احترام ہیں ریحان ۔۔۔" اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ "مجروح کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ انہیں تو ٹھیس پہنچانا بھی گناہ ہے ۔۔۔"

"اتنا طنز نہ کرو ۔۔۔ جس کا میں متحمل نہ ہو سکوں ۔۔۔" وہ تڑپے۔

"اور اتنا بنائیے بھی نہیں ۔۔۔ جس کی میں متحمل نہ ہو سکوں" صاعقہ الجھ پڑی۔

"تم کتنا غلط سمجھ رہی ہو ۔۔۔ کتنا غلط سمجھ رہی ہو صاعقہ" ریحان کے لہجے میں بے چارگی تھی۔ "صدق و خلوص کو پرکھ تو لیا ہوتا۔"

"عمر بھر پرکھا ہے ۔۔۔" صاعقہ کی آواز رندھ گئی۔ اس کی سوگوار آنکھوں میں اداسیاں گھلنے لگیں۔ اس نے دھیرے سے ریحان کی طرف پشت موڑ لی۔

"صاعقہ ۔۔۔ میں بے حد نادم ہوں ۔۔۔ جانتا ہوں ۔۔۔ طویل برسوں پر پھیلا ہوا میرا سلوک بھلا دینا تمہارے لیے آسان نہیں ۔۔۔ تمہاری حیات کا گزرا ہوا ہر لمحہ میرے بے رحم رویے پر خونچکاں ہے۔ لیکن میں نادم ہوں۔ تم شاید اندازہ بھی نہ

کر سکو۔۔۔ اک اک لمحہ میری روح کے لیے گراں بار بوجھ بنا ہوا ہے۔"

صاعقہ کی پُشت پر نظریں جمائے وہ دل گرفتہ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔

صاعقہ گھبرا گئی۔

لیکن

سنبھلتے ہوئے اُٹھی۔ ریحان کو سر تا پا بغور دیکھا اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ اس کے چہرے پر اک آوردہ سی بیزاری تھی۔

"صاعقہ"۔۔۔ ریحان آگے بڑھ کر اس کے سامنے آگئے۔ جذبۂ عفو طلبی بخشش کا منتظر تھا۔

"مجھے معاف کر دو۔۔۔" ریحان نے اک دل فگار آہ کو روکتے ہوئے صاعقہ کی طرف دیکھا۔

"آپ کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟" صاعقہ نے تلخی سے پوچھا۔

ریحان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیم وا خواب ناک سی نظریں اپنا مفہوم واضح کر گئیں۔ ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سر جھکا کر آہستگی سے بولے۔۔۔ "تمہیں کیسے سمجھاؤں۔"

"ریحان۔۔۔" صاعقہ ان فسوں کار نظروں کے وار سے بہک سی گئی۔

"صاعقہ" مسحور کن خوابیدہ سی نظریں پھر اس کی جانب اُٹھ گئیں۔

صاعقہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ نظروں کے طلسم سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے حواس منتشر تھے۔ اور سخت گھبراہٹ طاری تھی۔

"میری تبدیلی تمہارے لیے پریشان کن ہے۔۔۔ میں خود نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ اپنے عشق کا اعتراف کر رہے تھے۔

"لیکن میں تمہیں یقین۔۔۔" قدرے رکنے کے بعد وہ بولے۔

"ریحان" صاعقہ نے ان کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا "مجھے ابھی اپنے آپ سے ہمدردی ہے۔ اتنا نہ بنایئے کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگوں۔۔۔"

"صاعقہ" ریحان بے قرار ہو گئے۔

"آپ کی تفریح میری زندگی کا مہلک زخم ہوگی۔" وہ رو دی۔

"میری زندگی کی اٹل حقیقت کو تفریح کا نام نہ دو۔۔۔" ریحان سچائی سے

بولے۔

"نہیں۔۔۔ نہیں" وہ چیخ اٹھی۔۔۔ "سورج مغرب سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ سب کچھ جانتی ہوں۔۔۔"

گناہگار کو بار بار گناہگار نہ کہو صاعقہ۔۔۔ گناہوں کا بوجھ پہلے ہی کچھ کم تو نہیں۔ تم احساس دِلا کر اسے گراں بار تو نہ بناؤ کہ اٹھانے کی ہمت بھی نہ رہے۔۔۔"

صاعقہ نے ریحان کی طرف دیکھا۔ عجز و انکساری کا مجسمہ نظر آ رہے تھے۔ کیا یہ حقیقت تھی۔

"نہیں۔ نہیں" وہ دیوانہ وار چیخ اُٹھی۔

"صاعقہ" ریحان نے قدرے سختی سے پکارا۔

لیکن وہ "نہیں نہیں" کہتی بھاگ گئی۔

ریحان اس کے مجنونانہ انداز و رویے سے کچھ ہوش میں آگئے۔ لپک کر اس کے سامنے آگئے۔

اس نے ایک طرف سے کترا کر نکل جانا چاہا۔ ریحان نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے بولے "تمہیں کیوں یقین نہیں آتا؟"

"چھوڑ دو۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔!"

"پاگل نہ بنو۔۔۔ ہوش میں آؤ"

ریحان نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔۔۔ صاعقہ کے آنسو تیزی سے بہہ نکلے۔

"تمہیں میری باتوں کا کیوں یقین نہیں آتا۔۔۔ صاعقہ۔۔۔ میری ندامتوں کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔۔۔ میں اپنا دل چیر کر کیسے تمہیں دکھاؤں۔۔۔ میرے سینے میں طوفان ہیں۔۔۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔۔۔ صاعقہ میری آنکھوں میں دیکھو۔۔۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔ بتاؤ۔۔۔ بولو۔۔۔ کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔" ریحان پر جنون سا طاری تھا۔ صاعقہ کو کندھوں سے تھامے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہے تھے۔۔۔ "میری آنکھوں میں دیکھو۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔۔۔"

صاعقہ نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا اور روتے روتے ہنس دی۔

"ہو۔۔۔ کہو نا۔۔۔ کچھ نظر نہیں آتا۔۔" ریحان اسی وارفتگی سے پوچھ رہے تھے۔

"آتا ہے" وہ روتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے بولی۔

"کیا ؟" ریحان تیزی سے بولے۔

"طنز ۔۔۔ تمسخر ۔۔۔ مذاق ۔۔" وہ روتے ہوئے ہنسے جا رہی تھی۔

"صاعقہ ۔۔۔" ریحان تڑپ کر چیخے۔

"ہٹ جاؤ مجھے چھوڑ دو۔" صاعقہ مجنونانہ انداز میں بولی ۔ ریحان نے ہاتھ نہ ہٹائے۔

"چھوڑ دو ۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔" بڑے وحشیانہ طریق سے ان کے ہاتھ جھٹک کر وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

ریحان سکتے میں آ گئے۔

اور

جب

کئی لمحوں بعد ان کا سکتہ ٹوٹا۔

تو صاعقہ وہاں نظر نہ آ رہی تھی۔

ریحان آج ازل و ابد کی مسافتیں طے کر لینے پر کچھ اور تل گئے' تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے تعاقب میں چل دیئے۔

جب ریحان صاعقہ کی خواب گاہ کا بھاری سبز پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو وہ مسہری پر پڑی تکیے میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ آیا اس پر جھکی ہوئی بڑی محبت سے رونے کا سبب پوچھ رہی تھی۔

ریحان آگے بڑھے۔

آیا نے انہیں دیکھا۔ زرد چہرہ ، خشک ہونٹ ، بکھرے بال اور پریشان نظریں بہت کچھ کہہ گئیں۔

"نہ جانے کیا ہو گیا ہے میری بچی کو" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"تم جاؤ آیا۔" ریحان نے سنگین سے لہجے میں کہا۔

آیا تعمیل حکم کے لیے کمرے سے نکل گئی۔

ریحان مسہری کے قریب آئے۔

"صاعقہ" انہوں نے مایوسیوں میں ڈوبتی آواز میں پکارا۔

لیکن وہ اسی انداز میں پڑے روئے گئی۔

ریحان قدرے جھکے۔ ایک ہاتھ مسہری کے تکیئے پر تھا۔ دوسرے سے صاعقہ کا کندھا ہلایا۔

صاعقہ نے سر اُٹھایا ۔ سرخ سرخ آنکھوں سے لپٹیں نکل رہی تھیں۔ آج اس کے سینے میں طوفان ٹکرا رہے تھے اور اس کی ساری ہستی اس ٹکراؤ میں پستی جا رہی تھی ۔

"صاعقہ" دُکھی آواز میں ریحان نے پکارا۔

"آپ ۔۔۔ آپ ۔۔۔ یہاں کیوں آ گئے ۔۔۔ کیوں آ گئے ۔۔۔؟" وہ بپھری ۔

"اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی کے لیے۔" ریحان افسردگی سے سر جھکا کر بولے۔

"صرف ایک بار ۔۔۔ ایک بار اقرار کر لو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

"مجھے کیوں ستاتے ہیں ریحان ۔۔۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ کا مذاق میری جان لے لے گا ۔ میں نے آپ کی ہر زیادتی خاموشی سے سہہ لی ہے۔ لیکن ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ زیادتی ۔۔۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی ۔ کس بیدردی سے روئے جا رہی تھی وہ ۔۔۔

ریحان گنگ سے اسے دیکھتے رہے۔ یہ بُعد کی منزلیں کیونکر پاٹ دیں۔ بیچارگی، افسردگی اور جذباتِ شکستگی نے ان کے چہرے کو قابلِ رحم بنا رکھا تھا۔ آنکھیں جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔

"تمہیں کیسے یقین دلاؤں" انہوں نے آخری کوشش کی ۔

"یقین دلا کر اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کی کوشش نہ کرو ریحان ۔ آپ ۔۔۔ آپ وہ نہیں ہیں جو بننے کی کوشش کر رہے ہیں ۔۔۔ میں سب جانتی ہوں۔۔۔ خلوص کا یوں مظاہرہ کر کے خلوص کی دھجیاں نہ اڑاؤ۔" اس نے زار و قطار روتے ہوئے رُک رُک کر یہ الفاظ کہے ۔ یہ الفاظ نہ تھے، آگ تھی جو اس نے ریحان پر انڈیل دی۔ وہ بے بسی کے عالم میں اسے تکتے رہ گئے۔ صاعقہ کے الفاظ نے ان کی جبلت کا جیسے سارا رس نچوس لیا وہ بے جان تودے کی طرح کھڑے تھے۔

صاعقہ روئے جارہی تھی۔
پھڑپھڑاتے ہونٹ کاٹتے ہوئے انہوں نے ویران نظروں سے اُسے دیکھا۔
"صاعقہ" انہوں نے ہمت کر کے پکارا۔
"چلے جایئے ریحان ۔۔۔۔ چلے جایئے ۔۔۔" وہ چیخی ۔
"میں مایوس لوٹ جاؤں ۔۔۔۔" ان کی آواز ڈوب رہی تھی۔
"ریحان ۔۔۔۔" وہ پھر چیخ اُٹھی "آپ مجھے جینے بھی دیں گے یا نہیں ۔ یہاں سے چلے جایئے ۔۔۔ میں آپ کی موجودگی ایک لمحہ کو برداشت نہیں کر سکتی ۔۔۔ جایئے۔۔۔ جایئے ۔۔۔" وہ چیختی رہی۔
ریحان کی افسردگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ مسلسل چوٹ سے احساس کے شیشے چکنا چور ہو گئے تھے۔
وہ پلٹے ۔
اور
کمرے سے تیزی سے باہر نکل گئے۔
"چلے جایئے ۔۔۔ چلے جایئے" صاعقہ کے مجنونانہ انداز میں چیخنے کی آواز انہیں برآمدے کے آخری موڑ تک سنائی دیتی رہی ۔

○

(۳۶)

ریحان صاعقہ کی خواب گاہ سے نکلے تو دل کی طرح ان کی ہر آرزو بھی لٹ چکی تھی۔ طبیعت بیزار تھی۔ گھبراہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی پہلو قرار نہ آرہا تھا۔ گھنٹہ بھر باغ میں پھرتے رہے۔ طبیعت میں رچی بسی افسردگیاں اور گہری ہو گئیں ۔ رُوح جذبات کے شکنجے پر چڑھی تھی۔ قرار آتا بھی کیوں کر۔۔!
صاعقہ ان سے اس قدر دُور ہو گی۔ یہ انہیں کبھی گمان بھی نہ ہُوا تھا۔ کاش وہ انہیں صرف معاف ہی کر دیتی ۔ اس کی محبت نہ سہی۔ اس خیال سے تسکین تو ہوتی کہ اس کے لہولہان ماضی کا وہ مُداوا تو کر پائے ہیں۔
ریحان کی طبیعت بیزار سے بیزار تر ہوتی گئی۔ وہ سکون چاہتے تھے۔ لیکن الحمراہ کے دَر و دیوار ان کی شکست پر خندہ زن تھے۔ الحمراہ کی اونچی اونچی چھتوں تلے ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ یہ گھر ۔۔۔۔ یہ گھر اک جلتے الاؤ سے کم نہیں تھا۔ ہر طرف سے آگ کی لپٹیں آرہی تھیں۔
انہوں نے سکونِ دل کی خاطر اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ۔ عالم آباد والی پُرسکون کوٹھی میں ان کی مچلی ہُوئی جبلتوں کی تسکین کا سامان ہو سکتا تھا۔ اس خیال کو انہوں نے فوراً عملی جامہ پہنایا۔۔۔ رختِ سفر باندھا۔
اور
رات کا کھانا کھائے بغیر وہ الحمراہ سے عاصم آباد روانہ ہو گئے۔
صاعقہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی اُسے رہ رہ کر یہی احساس ستائے جا رہا تھا کہ اس نے منزل پا کر منزل کھو دی ہے۔
دوسری شام پکنک منانے والا قافلہ لوٹ آیا۔ الحمراہ کا سکوت ٹوٹ گیا۔ پھر وہی شور و غل ۔ پھر وہی زندگی کی گہما گہمی۔

لیکن ہر زبان پر ریحان کی عدم شمولیت کا شکوہ تھا۔

"سارا لطف کرکرا ہو گیا۔"

"کچھ مزا ہی نہیں آیا۔"

"جانِ محفل جو نہ تھا۔"

"اللہ جانے کیا بات ہوئی۔"

"خیال تھا کہ دوسرے دن ہی آجائیں گے۔"

"کچھ سمجھ نہیں آیا ۔۔۔ اچھے بھلے تیار تو ہوئے تھے ۔۔۔"

"اچانک ایسا کونسا کام پڑ گیا۔ جو اتنے دن فرصت ہی نہ مل سکی۔"

آنے والوں کی باتیں اور قیاس آرائیاں ہو رہی تھی۔ حسن بانو نے آتے ہی ریحان کو طلب کیا۔

"وہ تو عاصم آباد تشریف لے گئے ہیں" نوکر نے مؤدبانہ کہا۔

"کب؟" حیرانگی سے پوچھا گیا۔

"کل شام"

"کیوں؟"

"معلوم نہیں سرکار"

"کچھ کہہ کر نہیں گئے"

"جی نہیں ۔۔۔"

"آنے کا بھی نہیں کہا ۔۔۔؟"

"نہیں ۔۔۔"

"عجیب بات ہے!"

"شاید کوئی کام ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک تو تھے نا؟"

"جی ۔۔۔ کچھ ۔۔۔ طبیعت پریشان سی نظر آتی تھی ۔۔۔ ویسے ٹھیک تھے ۔۔۔؟"

ریحان گھر والوں کے لیے ایک اچھا خاصہ موضوع بن گئے ۔ ماں فکر مند تھیں۔

دادی فکر مند تھیں۔ ہم جلیس فکر مند تھے۔ اور سب سے زیادہ تو سمیرا فکر مند تھی۔ جس نے اللہ جانے چار دن کیسے گزارے تھے۔ کتنے سہانے سپنے دیکھے تھے اس نے پلنگ کے ۔ کتنے کتنے حسین ملبوسات اک امنگ سے تیار کروائے تھے۔ گو ریحان نے اس سے کبھی محبت و چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اپنی ذات میں اُن کی دلچسپی کو وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اور پھر ۔۔۔ پھر اتنا بھی تو جانتی تھی کہ تقدیر کی گردان دونوں کو یک جا کرنے والی ہے۔

عاصم آباد اس نے دو تین بار فون کیا ۔ لیکن ریحان ملے نہیں ۔۔۔ وہ بڑی بے چین نظر آنے لگی تھی۔

سب زندگی کی مصروفیتوں میں کھو گئے ۔ اس دن ریحان کے ٹیلیفون سے سب کو تسلی بھی تو ہو گئی تھی۔ کچھ کام کا بہانہ اس خوبصورتی سے کیا تھا کہ سب کو تسکین ہو گئی تھی ۔ اور جب ان سے واپسی کا پوچھا گیا تو انہوں نے ملائمت سے جواب دیا ۔

"شاید تین چار ہفتے رکنا پڑے ۔۔۔ کام پہلے ختم ہو گیا ۔ تو جلدی آجاؤں گا۔"

اسد کو ریحان کے اس جواب سے کچھ تسکین نہ ہو سکی ۔۔۔ انہوں نے اسی رات خود انہیں فون کیا۔

"کیا بات ہے ریحان؟"

"کچھ بھی نہیں"

"یہ فرار کیسا؟"

"تمہاری سمجھ کا پھیر ہے ۔۔۔ کاش فرار ممکن ہوتا ۔۔۔ میں تو اس حد تک جکڑا گیا ہوں کہ چھٹنے کی اُمید ہی نہیں رہی۔"

"یہ اندازِ فلسفیانہ کب سے سیکھا ہے؟"

"سب باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں ۔۔"

"تم تو خاصہ معمہ بنتے جا رہے ہو کہو کب آ رہے ہو؟"

"فی الحال پروگرام نہیں۔"

"وہاں اکیلے کیا کرتے رہتے ہو؟"

"سکونِ دل کی تلاش ۔۔۔"

"معاملہ کچھ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ میں کل آؤں گا۔"

"نہ ہی آؤ تو اچھا ہے اسد۔"

"کیوں؟"

"میں تنہائی چاہتا ہوں ۔۔۔ اس تنہائی میں جہاں میرے اپنے خیالوں کا بھی گزر نہ ہو۔ تم آئے تو میرا یہ ظاہری سکون بھی ختم ہو جائے گا۔"

"آدم بیزاری کی وجہ؟"

"خدا حافظ۔"

ریحان نے رسیور رکھ دیا۔ اسد نے پھر سلسلہ جوڑنے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن ادھر سے جواب نہ ملا۔

دو تین دن اسد نے فون سے رابطہ جوڑنے میں گزار دیے۔ ریحان عید کے چاند ہو گئے۔ مجبوراً تیسری شام انہوں نے عاصم آباد جانے کی ٹھانی۔

رات وہ ریحان کے پاس تھے۔

"تم آ ہی گئے آخر" ریحان نے افسردہ سی مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا۔

"خود ہی بلایا ہے۔"

"میں نے؟"

"اور کس نے۔"

"کب؟"

"میاں فون پہ مل جاتے تو یہاں آنے کی کسے ضرورت پڑی تھی۔"

"سخت غلطی کی ہے۔" ریحان مسکرائے۔

"اب خمیازہ بھگتو۔"

"کتنے دن؟"

"جتنے دن یہاں رہو۔"

"تم جاؤ گے نہیں؟"

"نہیں"

"پھر مجھے راتوں رات کہیں اور منتقل ہونا پڑے گا۔۔۔"

"سایہ ہر جگہ تعاقب کرے گا ۔۔۔ جاؤ گے کہاں۔"

"اندھیروں میں ۔۔۔ جہاں سایہ تعاقب چھوڑ دیتا ہے۔"

ریحان نے اتنے سوگوار انداز میں کہا کہ اسد گھبرا کر انہیں دیکھنے لگے۔

اس رات دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ زمانے بھر کی باتیں کیں۔ لیکن اپنی ذات تک کوئی نہ آیا۔ اوپری ۔۔۔ ظاہری اور دنیاداری کی باتیں۔

اسد نے محسوس کر لیا کہ ریحان زخم خوردہ ہیں۔ ان کی ہر مسکراہٹ سے خون رس رہا ہے۔۔۔

لیکن اس کا سبب؟

بہت کریدنے پر بھی نہ پا سکے۔۔۔ اس سلسلے میں ریحان کے لبوں پر ایک ہی جامد چپ تھی۔

اسد کا خیال پھر پھر کر انہیں صاعقہ تک لے آیا۔

لیکن

صاعقہ

ریحان

تضاد کا نام نہ سہی۔ پھر بھی ۔۔۔ ریحان اور صاعقہ کے لیے اتنا ڈوب جائیں کہ اپنی ہستی کو بھول بیٹھیں۔ یہ ممکن کیونکر تھا۔

اس سے ہمدردی ماننے کی بات تھی۔

پچھتاوے کے ردِ عمل کے طور پر پریشانی بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن

یہاں تو معاملہ حدود سے بہت آگے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ظاہر تھی لیکن اس ظاہر پہ یقین کون کرتا۔ کیونکر کرتا۔۔۔ کیسے کرتا۔۔۔!

دو دن تک اسد وہیں رہے لیکن کچھ سمجھ نہ پائے۔ دو ایک بار انہوں نے محسوس بھی کیا کہ ریحان کچھ کہتے کہتے رک گئے ہیں۔ لیکن اصرار پر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔۔۔

ان کی پریشانی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ اسد کی موجودگی میں خوش نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ لیکن بناوٹ کے جا بجا پردے حقیقت کی سترپوشی سے قاصر نظر آتے تھے۔

تین چار دن بد مزگی سے گزارنے کے بعد اسد نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔

ریحان نے انہیں روکا نہیں ۔۔۔ صرف اتنا کہا ۔ "اگر تم نے کچھ محسوس کیا بھی ہو اسد تو وہاں جا کر کسی سے کچھ نہ کہنا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں پریشان ہوں ۔ لیکن یہ پریشانی گھر والوں ، دوستوں اور ہم جلیسوں کے استفسار سے بھی ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔۔۔ میں یہاں تنہا رہنا چاہتا ہوں ۔ یقین ہے کہ طبیعت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ میں خود ہی آ جاؤں گا۔ ۔۔۔ ذرا ۔۔ سکون چاہتا ہوں ۔۔۔ تم صرف اتنا کہہ دینا کہ میں ۔۔۔۔ کسی دوست کے لیے یہاں رُکا ہوا ہوں ۔۔۔"

ریحان کے لہجے میں اتنی دل گرفتگی تھی کہ اسد بے چین ہو گئے ۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گے بلکہ سب کو یقین دلائیں گے کہ وہ خوش و خرم ہیں۔

لیکن

اسد کی باتوں کے باوجود دادی حسن بانو نے روزانہ فون کروانا معمول بنا لیا ۔ سمیرا ہر روز رات کو فون کر کے ان کی تنہائیوں میں مخل ہوتی رہی ۔۔۔ جب بھی سمیرا کا فون آتا ۔۔۔ ریحان کی بیزاری نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ۔ ترش کلامی پہ بھی اتر آتے لیکن سمیرا نے فون کرنا بند نہ کیا۔



(۳۷)

"رات سے بڑا جھگڑا ہو رہا ہے۔" آپا قالین پر بیٹھی صاعقہ کے دوپٹے میں فیتہ ٹانک رہی تھی۔

"جھگڑا کیسا؟" کھڑکی میں کھڑی صاعقہ نے منہ پھیرے بغیر پوچھا۔

"ریحان سیاحت کے لیے یورپ جانا چاہتے ہیں ۔۔۔" سوئی میں تاگا ڈالتے ہوئے آپا بولی۔

"ہو ۔۔۔۔۔ں" بے آواز سی صدا ہونٹوں پر تھرائی ۔ صاعقہ نے پلٹ کر آپا کی طرف دیکھا۔ حیران سراسیمہ سی نظروں سے۔

آپا نے اک نظر اس پر ڈالی ۔ وہ صاعقہ کی پریشانیوں کا راز سمجھ چکی تھی۔ اس دن ریحان جس انداز میں صاعقہ کی خواب گاہ میں آئے اور جس طرح مایوس لوٹے تھے۔ آپا کی جہاندیدہ نظروں نے پرکھ لیا تھا کہ کوئی شدید سی غلط فہمی دونوں کے مابین حائل ہے۔ ریحان کے طرز عمل سے وہ آگاہ تھی۔ صاعقہ کے سب سے بڑے دشمن وہی تھے۔۔۔ لیکن اب ریحان یکسر بدلے ہوئے تھے۔ ریحان کے خلوص اور صدق کا اسے ان کی حالت دیکھ کر پختہ یقین ہو گیا تھا۔

"ریحان واپس آ گئے ہیں نا۔" آپا نے پھر بات چھیڑی ۔

"میں ۔۔۔ جانتی ہوں ۔۔۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائی۔

"بس انہی کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"ریحان یورپ جانا چاہتے ہیں۔"

صاعقہ چپ چاپ آپا کا منہ تکنے لگی۔

"لیکن بڑی بیگم صاحبہ برہم ہیں۔ گھر کا ہر فرد مخالفت کر رہا ہے ۔ ریحان کی ضد

ایک ہی ہے ۔۔۔ رات تو ریحان اتنے بھڑکے تھے کہ دادی کو بھی جواب دیئے رہے۔۔۔"

صاعقہ گم سُم کھڑی آپا کو دیکھتی رہی۔

"جانے کیا ہو گیا ہے صاحبزادے کو ۔۔" آپا فیتہ لگاتے ہوئے بولی ۔ "تین ہفتے حاصم آباد رہ آئے ہیں ۔ اب آتے ہی باہر جانے کی ضد پکڑ رکھی ہے ۔ کسی کی سنتے ہی نہیں ۔ دادی نے بہتیرا سمجھایا۔ پھر کبھی سیر کا پروگرام بنا لینے کو کہا۔ باپ نے روکا۔۔۔ لیکن وہ تو کسی کی سنتے ہی نہیں ۔۔۔ کتنے پریشان ہیں۔ اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ بشاشت تو چہرے پر نام کو نہیں رہی، لٹے لٹائے سے نظر آتے ہیں ۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے ۔ یہ وہی ریحان ہیں جو ۔۔۔"

"چپ رہو آپا۔۔" صاعقہ نے جلدی سے کہا اور گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

"کیوں بیٹی" آپا نے سوئی دوپٹے میں ٹانک دی۔ ٹوکری ایک طرف رکھتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی ۔

صاعقہ نے اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنے بازوؤں کے حلقے میں رکھ دیا تھا۔

"صاعقہ بیٹی!" آپا نے اسے پکارا۔

"کیا ہے آپا؟" اس نے سر اٹھایا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں"

"مضمحل کیوں ہو گئی ہو ؟"

"آپا ۔۔۔ آپا۔۔"

"کیوں بیٹی۔۔۔۔"

"میرا دل گھبرا رہا ہے آپا۔۔" صاعقہ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ لیکن یہ بہانہ آپا پر کارگر نہ ہوا۔ وہ صاعقہ کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھی۔

"صاعقہ" وہ اس کے قریب آگئی۔

"ہوں۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"کیا؟" صاعقہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ریحان کیوں جا رہے ہیں ۔۔۔؟"

"ریحان ۔۔۔" صاعقہ ایک دم گھبرا گئی ۔ جیسے وہ ان کے جانے کا سبب جانتی ہو اور یہ جان لینا اک ایسا جُرم ہو جس کی تشہیر سے اسے گزند پہنچنے کا احتمال ہو۔

"کیوں جانا چاہتے ہیں وہ ۔۔۔" آپا نے پھر سوال دُہرایا۔

"میں ۔۔۔ میں کیا جانوں آپا۔" اس نے جیسے جھوٹ بولا۔

"تم جانتی ہو۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔ میں نہیں جانتی ۔۔۔ مجھے کچھ علم نہیں ۔"

"میں بتا دوں۔۔۔!"

"نہیں ۔۔۔" اس نے آپا کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ اس کی تیز تیز سانسیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ آپا اس کی اضطراری حرکت اور اضطرابی کیفیت سے کیا کچھ نہ سمجھ گئی۔

"میری بچی" آپا نے اس کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپا" صاعقہ اس کے سینے کی شفیق گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔

"غلط فہمیاں بعض اوقات ابدی جُدائیوں کا روپ دھار لیتی ہیں میری بچی" آپا سوچوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتے ہوئے بولی۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، جنہیں آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپا" صاعقہ نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا ۔۔۔ "تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟"

"سچ کہتی ہوں ۔۔۔" وہ سوچ کے ساگر سے ابھری ۔ آنچل سے آنکھوں کے گوشے صاف کر کے اداس لہجے میں بولی۔۔۔ "غلط فہمی بُری بلا ہے میری بچی ۔۔۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو آپا؟"

"عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے ۔ اور تم ضرورت سے زیادہ عقلمند ہو۔"

"تمہارا مطلب؟"

"اچھی طرح جانتی ہو۔"

"آپا"

"میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ازلی بد نصیبوں سے ایسی توقع؟"

"تقدیر کے پلٹے ان وہموں کی نذر نہ کرو۔"

"حقیقت کو پرکھا کرو آپا۔ خوش فہمیاں جان لیوہ بھی بن جاتی ہیں۔"

"تم ناداں ہو۔"

"یہ بھی تمہاری غلطی ہے آپا۔۔۔"

"یہ نہ سمجھو کہ میں قطعاً بے خبر ہوں ۔۔۔ ریحان تم سے مایوس ہو کر فرار چاہتے ہیں۔ انہیں روک لو۔۔۔ صاعقہ ۔۔ ورنہ گیا وقت لوٹ کر نہیں آئے گا۔۔۔"

"میں ۔۔۔ میں کیا کروں آپا؟" صاعقہ بیچارگی سے رو دی۔

"میں سب کچھ سمجھتی ہوں ۔۔۔ ریحان کو اس دن تم نے مایوس کر دیا تھا۔ وہ عاصم آباد چلے گئے ۔ اب باہر جانے کے لیے بضد ہیں۔"

صاعقہ سر جھکائے خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا ۔۔۔ حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ تم انہیں جانے سے روک لو ۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپا ۔ ریحان کے خیالات سے تم بھی بے خبر تو نہیں ہو۔۔۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے بہتر سمجھا ہے ۔۔۔ اب بھی ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ شاید کوئی مسلسل مذاق کر رہے ہیں ۔۔۔ طویل تفریح" صاعقہ کو اپنے الفاظ آپ ہی جھوٹے لگ رہے تھے۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو صاعقہ ۔ تفریح اتنی طویل اور مذاق ایسا مسلسل نہیں ہو سکتا۔ یہ ان کی زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔"

"ریحان کے چہرے کے جامد سناٹے، آنکھوں کی ویران چپ، طبیعت کی وحشت ۔۔۔ پکار پکار کر تو کہہ رہی ہے ۔۔۔"

"آپا ۔۔۔" صاعقہ اس کے سینے سے لگ کر بے اختیار ہو کر رو دی۔

"غلط فہمیاں خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہیں بیٹی ۔۔۔ ریحان کو باہر جانے سے روک لو۔ وہ یونہی بھٹکتے پھریں گے۔ منزل سے دور ہو کر وہ زندگی سے بیزار ہو جائیں گے۔"

"آپا" وہ سسک رہی تھی ۔۔ آپا اسے تھپتھپاتی رہی۔

"لیکن میں ۔۔۔ میں کیسے یقین کر لوں ۔۔۔ کہ یہ سب سراب نہیں حقیقت ہے؟"

"ریحان کی نگاہوں کی گمبھیر اداسی یقین دلانے کو کافی ہے۔۔۔"

"مجھے یقین نہ دلاؤ۔۔۔ میں ازلی بد نصیب ہوں ۔۔۔ خوش فہمی ۔۔۔۔"

"حقیقت کو خوش فہمی نہ کہو۔"

"اپنے نصیبوں کو اتنا درخشاں کیسے مان لوں آپا۔۔۔ تاریکیاں ہی مقدر ہیں ۔۔۔ روشنی کی کرنیں کیسے پھوٹ سکتی ہیں۔۔۔"

"اکثر اوقات سیاہ بادل اچانک پھٹ جاتے ہیں صاعقہ ۔۔۔ روشنی ہی روشنی بکھر جاتی ہے۔ تقدیر کے پلٹے کسی کے بس میں نہیں ہوتے۔"

"سچ آپا؟"

"بالکل سچ میری بچی۔۔۔"

"آپا ۔۔۔ آپا ۔۔!" صاعقہ اس سے لپٹ گئی ۔ وہ اب بھی جذبے کے عالم میں تھی ۔ آپا نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ تسلیوں اور تشفیوں سے اس کی ہمت بندھانے لگی۔

○

۳۸

"حد کر دی تم نے بھی ۔۔۔ نانی حضور کے سامنے اتنی بیباکی سے جواب دیئے رہے۔"

"میں مجبور ہوں اسد"

"ان کے لحاظ ۔۔۔"

"حیران ہوں۔ سب اس قدر مشتعل کیوں ہیں۔ یورپ جا رہا ہوں، جہنم میں تو نہیں جا رہا ہوں۔ اتنی گھبراہٹ ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا، گھر کا ہر فرد زنجیر کیوں بننا چاہتا ہے ۔۔۔ باہر جانا جُرم ہے کیا؟"

"قطعاً نہیں۔"

"تو پھر اتنی لے دے کیوں ہو رہی ہے ۔۔۔ ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے جیسے میں کسی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ۔۔۔"

"تو اور کیا ہے؟"

"تمہیں جشن تک روکنا چاہتے ہیں سب۔"

"اونہہ"

"کچھ تو سوچو ۔۔۔ ریحان"۔

"بہت کچھ سوچ لیا"

"ریحان نے سگریٹ سلگایا۔ وہ جھلائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ آج دادی سے خاصی جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ راستے کا سنگِ گراں جو بن رہی تھیں۔ ریحان جیسی فطرت کے انسان کا اس سنگِ گراں سے ٹکرانا بعید از قیاس تو نہ تھا۔ اسد دیر سے انہیں سمجھا رہے تھے لیکن ہر نصیحت نقش بر آب تھی۔

دونوں کچھ دیر خاموشی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔ ریحان اپنی نشست گاہ کی عقبی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے۔ کمرے کی دودھیا روشنی میں ان کے چہرے پر پریشانی اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔

اسد صوفے پر بیٹھے تھے۔ میز پر تازہ میگزین رکھا تھا۔ لیکن وہ سوچ میں ڈوبے تھے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے بغور ریحان کو دیکھا۔

"اس ضد کی وجہ؟" اسد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ریحان کو مخاطب کیا۔۔۔

"شاید میں بتانے سے انکار کر دوں۔" ریحان نے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"میں ۔۔۔ جانتا ہوں" اسد گمبھیر آواز میں بولے۔

"تو پھر پوچھتے کیوں ہو" ریحان لاپروائی سے بولے۔

"کچھ ۔۔۔ انہونی سی بات نظر آتی ہے" لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"انہونی جب ہو جائے تو شدت کی انتہا ہوتی ہے" ریحان نے جیسے اعتراف کر لیا۔

"کیا واقعی؟"

"ہوں۔"

"کیا واقعی ایک انتہا دوسری انتہا کو جنم دے چکی؟"

"مجھے اقرار میں کوئی باک نہیں۔۔۔"

اسد نے نظریں ریحان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ریحان سگریٹ پھونکے جا رہے تھے۔ اسد کو اس اقرار سے کچھ ملی جلی مسرت ہو رہی تھی۔

"لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اسد بولے۔

"کیا؟"

"تمہاری اس آدم بیزاری ۔۔۔ افسردگی ۔۔۔ پریشانی کی وجہ کیا ہے، یہ پتا تو خوش گوار ہونا چاہیے تھا!"

ریحان نے کچھ جواب نہ دیا۔ نیا سگریٹ سلگاتے وقت ان کے چہرے پر رنج و غم کے تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ اک ٹھنڈی اور دل دوز سی آہ کھینچ کر رہ گئے۔

سگریٹ سلگا کر انہوں نے منہ پھیر لیا۔ صحن چمن میں چاندنی ساحرانہ جال پھیلا رہی تھی۔ وہ اس طلسماتی جال سے منظر میں الجھائے جانے کیا سوچنے لگے۔

اسد اٹھ کر ان کے قریب آ گئے ۔ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔

"ہوں" ریحان اسی انداز میں کھڑے رہے۔

"بتاؤ گے نہیں؟"

"کیا؟"

"اس سارے عقدے ۔۔۔۔"

"اسد کچھ نہ پوچھو۔۔۔"

"تمہارا دوست بھی ہوں اور بھائی بھی ۔۔۔"

"پھر ۔۔۔!"

"کیا معمہ ہے؟"

"پریشان نہ کرو اسد"

"خواہ مخواہ بات بڑھائے جا رہے ہو۔ کہہ بھی دو۔۔۔!"

"کیا کہہ دوں۔ کچھ کہنے کو ہے ہی نہیں۔"

"تکلف برتنے کی ضرورت نہیں۔۔۔"

"اسد"

"کچھ تو کہو دوست"

"کچھ بھی نہیں کہنے کو۔۔۔"

"میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ تمہاری اور صاعقہ۔۔۔"

"صاعقہ ۔۔۔ صاعقہ" وہ گہری سانس لے کر بولے "مجھے اعتراف ہے اسد کہ وہ میری روح میں سما چکی ہے۔"

ریحان نے گہری سانس لے کر سگریٹ باہر پھینک دیا۔ مڑ کر اسد کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی جو افسردگی میں گھل مل گئی تھی۔ وہ قدرے مسکرائے ۔ لیکن اس مسکراہٹ کو جیسے آگ سی لگی تھی۔

"یہی راز اگلوانا چاہتے تھے نا؟"

"نہیں ۔۔۔ یہ میں کئی دنوں سے جان گیا تھا۔"

"پھر ۔۔۔ پھر کیا چاہتے ہو؟"

"اس اعتراف کے باوجود پریشان کیوں ہو۔"

"اسد ۔۔۔"

"ہوں۔"

"میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے اور کیونکر ہو گیا ہے ۔۔۔ سوئے ہوئے جذبے کس شدت سے بیدار ہوئے ہیں۔ تمہیں کیونکر بتاؤں اسد۔ اب تو اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی ممکن نظر نہیں آتا۔۔۔" وہ چپ ہو گئے۔ نچلے ہونٹ کو کاٹتے ہوئے وہ اپنے زخمی جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے ۔

"ہوں ۔۔۔؟" اسد نے آہستگی سے کہا۔

"اسد ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں اپنے والہانہ عشق کے جواب میں کچھ ایسے ہی جذبات کا متمنی ہوں۔"

"یہ فطری بات ہے ۔"

"لیکن ۔۔۔" ریحان چپ ہو گئے ۔ ان کے چہرے سے آثارِ کرب مترشح تھے۔

اسد خاموش رہے ۔ ریحان کی گفتگو سمجھ کر وہ پریشان ہو گئے۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اسد ۔۔۔ شدید نفرت ۔۔۔ ایسی نفرت جس میں کسی لچک کی گنجائش نہیں ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ میری موجودگی تک برداشت نہیں کر سکتی۔ اتنی سنگین نفرت ہے مجھ سے۔"

اسد کچھ کہنے کو الفاظ تلاش کر رہے تھے۔ غیر متوقع سی بات تھی نا؟

"اور تو پوچھنے کو کچھ باقی نہیں رہ گیا۔" ریحان نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پریشان چہرے پر افسردگیوں کا لامتناہی سیلاب سا امنڈ رہا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی ۔۔۔ دونوں مضطرب تھے۔ بیدردی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔

"صاعقہ تم سے نفرت نہیں کر سکتی۔" آخر اسد بولے۔

"طفل تسلیوں سے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔"

"تمہیں ضرور غلط فہمی ۔۔۔"

"اسد ۔۔۔ معاملہ ان خوش فہمیوں کی حدود سے آگے نکل چکا ہے۔"

"تمہیں اس نے کچھ کہا؟"

"اس نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ وہ میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ۔۔۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے ۔ نفرت ۔۔۔"

اور

پھر

ریحان نے اسی طرح کھڑے کھڑے اپنی انوکھی محبت کی ادھوری اور ناتمام داستان اسد کے گوش گزار کر دی اسد سُنتے گئے۔ ریحان کی حالت دیکھ کر انہیں ان پر کتنا رحم آیا تھا۔

"میری یہی سزا ہے اسد" ریحان ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "میں نے عمر بھر جو کچھ اس کے ساتھ کیا ہے' وہ اسی جذبۂ تنفر کو جنم دے سکتا ہے۔ قدرت کا انتقام خاموش ہوتا ہے۔ لیکن کتنا زبردست ۔۔۔"

ریحان نے کھڑکی کی پٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسد کا دل ان کی حالت دیکھ کر مسلا جا رہا تھا۔

چند لمحوں بعد ریحان نے آنکھیں کھول کر اسد کی طرف دیکھا۔ قدرے آگے کو جھک کر مایوس آواز میں بولے۔ "کاش وہ مجھے ایک بار معاف کر دیتی ۔ مجھے اپنی ناکامی کا دکھ اتنا شدید نہ ہوتا۔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر یہ دکھ سینے سے لگا لیتا ۔ لیکن وہ تو مجھ سے اس حد تک متنفر ہے کہ میری پیہم کوششوں کے باوجود مجھے معاف تک نہیں کر سکی۔ کوئی اور توقع رکھنے کا تو سوال ہی نہیں اسد ۔۔۔"

"ہوں" اسد گم صُم کھڑے تھے۔

"تم ہی کہو اسد میں کیسے یہاں رہ سکتا ہوں۔ یہاں آگ کی لپٹیں ہیں جو میری زندگی کو بھسم کیے دے رہی ہیں۔ میں ان آگ کی لپٹوں سے دور بھاگ جانا چاہتا ہوں ۔۔۔ دور ۔۔۔۔۔ بہت دور ۔۔۔"

"سمجھتے ہو کہ دوری تمہیں سکون دے گی؟"

"میں نہیں جانتا ۔۔۔"

"زخم تو جہاں بھی جاؤ گے کسک دے گا۔"

"صرف کسک ہی ہو گی نا ۔۔۔ نشتروں کی چبھن تو نہ ہو گی۔ تنفر بھری نظروں کا تعاقب تو نہ ہو گا ۔۔۔ یہ لمحہ لمحہ کی موت میری برداشت سے باہر ہے اسد ۔۔۔ یہاں ناکامیاں میرا منہ چڑاتی ہیں ۔۔۔"

اسد چُپ تھا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ سگریٹ سلگتے اور ختم ہوتے رہے۔

ریحان نے ان کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائے ۔۔۔ "تم جیسے لوگوں سے بھی تو چھٹکارا مل جائے گا۔ پریشان کر کر کے زیست کو ناقابل برداشت بنا دیا ہے ۔۔۔"

اسد مسکرا نہ سکے۔

وہ

سنجیدگی سے کسی سوچ میں ڈوبے تھے۔

---o---

(۳۹)

ہر جذبہ انتہا سے ٹکرا کر احساس کا رنگ کھو دیتا ہے۔ انسانی ذہن اس لمحہ چٹیل میدان کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے۔

اس لمحہ سے صاعقہ بھی دوچار ہوئی ۔

وہ اسی دریچے کے قریب کھڑی تھی۔ جس میں ریحان اسد کے سامنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔ وہ دانستہ باتیں سننے نہیں رکی تھی۔ لاشعوری طور پر اس کے قدم رک گئے تھے۔ کچھ بے نام سے جذبوں کی کشاکش نے مغلوب کر لیا تھا۔

ریحان کا سنجیدہ سا اعتراف سن کر وہ انتہا کی ان حدود سے جا ٹکرائی جہاں خوشی یا غم احساس کا رنگ کھو دیتے ہیں۔ اور جہاں ثانیہ بھر کے لیے ذہن چٹیل میدان کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے۔

لیکن

جب وہ ہوش میں آئی تو اس کی حالت اس شرابی کی سی تھی۔ جو کیف و سرور سے بہک بہک جائے۔

اس رات وہ کتنی خوش تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا، چنچل ہواؤں کی طرح سرسرائی پھرے۔۔۔ مترنم نغموں کی طرح لہرائے۔

اور

اپنی بے پناہ مسرتوں کے سینے سے لپٹ کر سو جائے۔

جسے وہ اک طویل مذاق اور مسلسل تفریح سمجھ رہی تھی۔ وہ ریحان کی زندگی کی اٹل حقیقت تھی۔ یہ یقین آپا نے بھی دلا دیا تھا۔ خود اس کی روح اس بات پر ایمان لانے کو مچل رہی تھی۔

لیکن

صاعقہ

جس نے زندگی کے بیس سالوں میں تنفر۔۔۔ حقارت اور تضحیک کے سوا ریحان سے کچھ نہ پایا تھا۔ اس یقین کو جھٹلاتی رہی۔

آج

اچانک

ریحان کے اعترافِ عشق نے اس کے ذہن سے سارے بوجھ ہٹا دیے۔ وہ جھوم جھوم گئی۔ اس کی روح میں لطیف سی گدگدی برداشت کی حدود توڑ توڑ گئی۔

ریحان

جنہیں ان کے تنفر و حقارت کے باوجود اس نے چاہا تھا۔

جنہیں ناکامی کے روح فرسا احساس کے باوجود پوجا تھا۔

جنہیں اک ہولناک تعبیر کے تعین کے باوجود رنگین سپنوں میں بسایا تھا۔

وہ ریحان

وہ دیوتا

وہ محبوب

وہ جانِ آرزو اس کا اپنا تھا۔

بالکل اپنا اپنا

صاعقہ بلندیوں پر پرواز کر رہی تھی۔ اس کی روح رقصاں تھی ۔ اک وجدانی سی کیفیت اس کے سراپا پر چھائی ہوئی تھی۔

رات گئے حسبِ عادت آپا اس کی خواب گاہ میں آئی تو وہ جاگ رہی تھی۔

"سوئی نہیں ابھی تک؟"

"نہیں"

"نیند نہیں آ رہی ؟"

"نہیں"

"بتی گل کر دوں؟"

"نہیں ۔۔۔"

"سو جاؤ!"

"نہیں ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے صاعقہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

آپا نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ کمبل ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔ "میں نہیں سوؤں گی آپا۔۔"

"آدھی رات بیت چکی ہے۔"

"پوری بیت جانے دو آپا ۔۔۔۔" اس نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر آپا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔۔۔۔۔

"کیا بات ہے؟"

"آپا!"

"میری بچی"

"میں آج کتنی خوش ہوں آپا۔ تم نہیں جانتیں میں کتنی خوش ہوں۔ جاگ کر مجھے ان خوشیوں سے لطف اندوز تو ہونے دو ۔۔۔۔" وہ آپا کے بازو ہٹا کر الگ ہو گئی۔

آپا نے پہلی بار اسے اتنا خوش دیکھا تھا زندگی میں پہلی بار ۔۔۔ اس کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند لاہٹوں کی جگہ خوشیوں کے سوتے ابلتے دیکھے تھے۔ پہلی بار اس کے چہرے کی سپیدی میں مسرتوں کی چمک دیکھی تھی۔ کانپتی پلکوں کے لرزتے گرتے سایوں میں پہلی بار خوشیوں کے رقص دیکھے تھے۔

"مجھ سے پوچھو تو سہی آپا ۔۔۔!" اس نے پیار سے آپا کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کتنی مجنونانہ حرکتیں کر رہی تھی۔

صاعقہ کو خوش دیکھ کر آپا کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے ۔ کتنی مطمئن نظر آ رہی تھی وہ۔۔۔۔ جیسے عمر بھر کی ریاضت کا ثمر پا لیا ہو۔

"کیا بات ہے؟" آپا نے جذبات سے رندھی آواز میں پوچھا۔ اک والہانہ انداز سے آپا کو دیکھ کر صاعقہ مسکرائی۔

موج کی طرح بل کھا کر مڑی۔

اور

مغربی دریچے کے پٹ کھول دیے۔

نرم رو جھونکے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے گزر گئے۔

"کھڑکی بند کر دو ہوا ٹھنڈی ہے" آپا نے کہا۔

"آج مجھے مت روکو آپا۔ کسی بات سے مت روکو۔۔۔ مجھے وہی کرنے دو جو میں چاہتی ہوں۔۔۔"

"بڑی خوش ہو آج" آپا نے قریب آ کر اس کے گالوں کو چھوا۔

"میری خوشیوں کا اندازہ نہ کر سکو گی آپا۔۔۔" وہ جھوم گئی۔

"کیا پا لیا؟"

"جس کی تمنا بھی جرم سمجھتی تھی۔"

"سچ؟"

"سچ آپا۔۔۔۔ بالکل سچ" اس نے آپا کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ 'تم سچ کہتی تھیں ۔۔۔۔ آپا ۔۔۔ سچ کہتی تھیں تم ۔۔۔ ریحان میرے ہیں ۔۔۔۔ میرے ہیں آپا۔۔۔ ڈر لگتا ہے خوشی سے میں پاگل نہ ہو جاؤں کہیں ۔۔۔"

وہ آپا سے لپٹ گئی۔

آپا کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ صاعقہ کو ساتھ لپٹا کر اس نے اس کے اندھیری راتوں جیسے سیاہ بال چوم لیے۔

"تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں میری بچی ۔۔۔"

صبح ناشتے کی میز پر صاعقہ نے ریحان کو دیکھا۔ اک سنسناہٹ سی اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ لطیف سی کپکپی ہونے لگی۔ خواہ مخواہ چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ کتنا حجاب آ رہا تھا اسے ریحان سے ۔ گھبرا بھی تو رہی تھی۔ وہ ان کے سامنے سے۔

ریحان کتنے پژمردہ اور نڈھال سے نظر آ رہے تھے۔ سب کا ساتھ دینے کو آ بیٹھے تھے۔ صرف چائے کی دو پیالیاں پی تھیں۔ ناشتے کی کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔ صاعقہ ان کے سامنے والی قطار میں بیٹھی تھی۔ لیکن انہوں نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔

یہ دکھاوے کا تغافل دیکھ کر آج صاعقہ کتنی مسرت بھری تڑپ محسوس کر رہی تھی۔ میز سے اٹھتے وقت دونوں کی نظروں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ ریحان کی مایوس افسردہ نگاہیں کتنی حسرتیں لیے تھیں۔

صاعقہ کا دل اس مایوس خفگی پر مچل گیا۔

جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔

ریحان نے بھی یہ تبسم دیکھا اور پھر بڑی دل آزاری سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

---

(۴۰)

ریحان باہر جانے کے لیے ضدی بچے کی طرح مچلے تھے۔ دادی کا کہا مان رہے تھے نہ والدین کی سرزنش کی پرواہ تھی۔

پیار اور سختی کسی طرح سے بھی تو قابو میں نہ آ رہے تھے۔ حسن بانو کو ان دنوں طاہر یاد آ جاتے تھے۔ دونوں کے مزاج میں کتنی ہم آہنگی تھی۔ نٹ کھٹ ضدی سے ریحان طاہر ہی تو لگتے تھے۔

حسن بانو کو پختہ یقین تھا کہ ریحان ضد سے ٹلنے کے نہیں۔ اس لیے ان کے رویے میں کچھ لچک آ گئی۔ جانے کی اجازت اس صورت میں دی کہ وہ عید کے بعد منائے جانے والے جشن میں شرکت کر کے جائیں۔

ریحان بھلا ان حد بندیوں کے قائل کیوں کر ہوتے۔ اور یہ جشن جس سلسلے میں منایا جانے والا تھا' اس سے بھی آگہی تھی۔ پھر بھلا وہ اتنی مدت کیسے رک جاتے۔

فوزیہ بھی چاہتی تھی کہ ریحان جشن کے بعد ہی جائیں۔ جوان لڑکے کو منگنی کی بندش ڈال دینے سے ان کا باہر جانا مخدوش نہ تھا۔ لیکن ریحان جہاں دادی کی بات نہیں سن رہے تھے' ماں باپ کے سامنے بھی غم نہیں کھا رہے تھے۔ فوزیہ کا کہنا بھلا کتنا سودمند ہو سکتا تھا۔

لیکن اس کے زیرک دماغ نے اک راہ نکالی۔ سمیرا ریحان کو روک سکتی تھی۔ ریحان کا حرجیجی سلوک اور سمیرا کے جذبات سے وہ واقف بھی تو تھی۔

سمیرا ریحان کی ضد سے خود ہی متفکر تھی۔ ماں کی ایما پر اس نے ریحان کو روکنے کے بارے میں سوچا۔

اپنے آپ پر اسے اعتماد تھا۔

وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہی۔

ادھر

صاعقہ بھی سوچ رہی تھی۔

ریحان کو روک لینے کے متعلق ۔

لیکن

کیسے؟

اور

کیونکر؟

یہ مسئلہ کسی صورت حل ہونے میں آ ہی نہیں رہا تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی دھوپ کے لانبے لانبے سائے دریچے کی راہ سے اندر آ رہے تھے۔ ان میں حدت تو نہ تھی۔ ہاں روشنی کچھ اُجاگر ضرور ہو گئی تھی۔

صاعقہ طاہر کے کمرے میں تھی۔ کھڑکی کے قریب کُرسی پر بیٹھی تھی۔ گود میں اک پُرانا البم رکھا تھا۔ بڑے انہماک سے وہ ان تصاویر کو دیکھ رہی تھی ۔

ہر صفحے پر ایامِ رفتہ کے جامد نقوش تھے۔ طاہر و ناجی کے پیار کے عکس ۔ صاعقہ کے دل میں عقیدت کا بحرِ ذخار موجیں مار رہا تھا۔

"اوہ" قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی کسی کے لبوں سے نکلا۔ صاعقہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔

دروازے میں ریحان کھڑے تھے۔ سیاہی مائل سلیٹی سُوٹ میں ان کا چہرہ اُترا خاصا زرد نظر آ رہا تھا۔

"معاف کرنا مخل ہوا ہوں" ریحان کمرے کے اندر آتے ہوئے بولے ۔ ان کی بوجھل آواز اداسیوں میں ڈوبی تھی ۔

صاعقہ کا چہرہ خواہ مخواہ سُرخ ہو گیا۔ دراز پلکیں حسین آنکھوں پر بار بار جھکنے اٹھنے لگیں ۔ کتنی نادم مسکراہٹ تھی اس کے لبوں پر۔

"مجھے کچھ کاغذات لینے ہیں ۔ ۔ ۔" ریحان اس کی جانب دیکھے بغیر الماری کی طرف بڑھے۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ بڑی سی الماری رکھی تھی۔ جس میں کچھ پرانے کاغذات تھے۔ البم تھے اور طاہر کے ہاتھوں کی ہزاروں تصویریں تھیں۔

ریحان نے الماری کھولی اور مطلوبہ کاغذات ڈھونڈنے لگے۔ صاعقہ نے گود میں

رکھا البم بند کر دیا اور ان کی پشت پر نظریں جمائے ان کے وجیہہ پیکر کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

ریحان کبھی اوپر والے خانے میں کاغذ، البم اور تصاویر الٹ پلٹ کر رہے تھے، کبھی جھک کر درمیانے خانے میں تلاش کر رہے تھے۔ کبھی گھٹنے کے بل جھک کر نچلے خانے میں چیزیں ادھر اُدھر کرتے کاغذات ڈھونڈ رہے تھے۔

پانچ دس منٹ کی رائیگاں کوشش کے بعد وہ اٹھے۔ کُرسی پر بیٹھی صاعقہ کی طرف دیکھا۔ حُسن پر اک پُر نُور سی شگفتگی تھی۔ ریحان اک لمحہ کے لیے بھول گئے کہ وہ کیا لینے کمرے میں آئے تھے۔

صاعقہ نظروں کی تندی اور انہماک سے گھبرا سی گئی۔ جھکی جھکی نظریں دو ایک بار اٹھیں اور ریحان کی نگاہِ شوق سے ٹکرا کر جھک گئیں۔

ریحان جلد ہی اپنے آپ میں لوٹ آئے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ دُکھی نظر آنے لگے۔ "یہاں ۔ ۔ ۔ ایک فائل ہوا کرتی تھی۔ لمبی سی ۔ ۔ ۔ سبز جلد والی؟" انہوں نے بڑی لاتعلقی سے پوچھا۔

"وہ دوسری الماری میں ہے۔" صاعقہ البم میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"ریحان کونے والی الماری کی طرف پلٹے۔ ۔ ۔ ۔ قریب پہنچ کر دیکھا اس میں تالا پڑا تھا۔ تالے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ریحان نے صاعقہ کی طرف دیکھا۔

"چابی میرے پاس ہے" کہتے ہوئے وہ اُٹھی ۔ خراماں خراماں، مخشریہ پہلی الماری کی طرف گئی۔ اوپر والے خانے میں ایک ڈبہ پڑا تھا۔ اٹھایا ۔ چابیوں کا گچھا نکالا ۔ پیتل کی چابی پکڑتے ہوئے اس نے گچھا ریحان کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لیجئے۔"

"شکریہ"

ریحان نے چابیاں لے لیں۔ صاعقہ ان کے قریب ہی کھڑی رہی۔

ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس دونوں کے حواس پر اثر انداز تھا۔ ریحان بہکے بہکے سے نظر آ رہے تھے۔ اور صاعقہ پر بھی گھبراہٹ کی لطیف سی کپکپی تھی۔

"میری موجودگی تمہارے لیے ناقابلِ برداشت تو ہو گی؟" ریحان نے گہری اداس آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ "لیکن مجبوری ہے کچھ کاغذات ضروری لینا تھے۔ ورنہ میں

تمہارے لیے بار نہ بنتا۔"

ریحان کی چوٹ پر صاعقہ دھیرے سے مسکرا دی ۔ جیسے ہواؤں کی آوارہ پھیرا سے کلیاں جھوم گئی ہوں۔

اس خواب ناک سی بھیگی بھیگی حیابار مسکراہٹ کا مفہوم ریحان نہ سمجھ سکے۔ میز پر قدرے جھک کر فائل کھولی اور مطلوبہ کاغذات نکالنے لگے۔ صاعقہ اسی جگہ کھڑی رہی ۔

ریحان نے فارغ ہو کر فائل بند کر دی ۔ کاغذات اکٹھے کر کے میز پر رکھ دیئے ۔ اور فائل واپس الماری میں رکھنے کے لیے اس طرف آئے۔

الماری کے پٹ کے ساتھ ہی صاعقہ کھڑی تھی۔ لیکن ریحان نے اس پر نگاہ نہیں ڈالی۔

اس تغافل پر وہ پھر مسکرا دی۔

ریحان نے فائل اوپر والے خانے میں رکھنے کے لیے ایک طرف جگہ بنائی۔

"آپ واقعی یورپ جا رہے ہیں۔ ۔ ۔ ؟" اک نغمہ بار آواز ریحان کے کانوں سے ٹکرائی۔

اور

اس غیر متوقع استفسار پر جو بلاشبہ بڑی ہی اپنائیت سے کیا گیا تھا' ریحان حیران سے ہوئے ۔ فائل پر ہاتھ رکھے انہوں نے گردن کو قدرے خم دے کر صاعقہ کی طرف دیکھا۔

صاعقہ سر جھکائے پاؤں سے قالین کو مسلے جا رہی تھی۔ ہاتھ پشت کی طرف تھے۔ جس سے اس نے کھڑے ہونے کے لیے الماری کے پٹ کا سہارا لے لیا تھا۔

رسمی استفسار سمجھ کر ریحان کی اداسی اور گہری ہو گئی ۔ گردن موڑ کر اوپر والے خانے کے دائیں طرف کتاب اُٹھا کر فائل رکھ دی ۔ ۔ ۔ اور بڑی لاتعلقی سے بولے "میں بخشے کو پرواز کر جاؤں گا۔"

"کیوں جا رہے ہیں۔ ۔ ۔ ؟" اک چور تبسم ہونٹوں میں دبائے صاعقہ نے آہستگی سے کہا۔

ریحان نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ حیرانگی سے کہیں زیادہ وہ چونک گئے تھے۔

اس دفعہ ۔ ۔ ۔ صاعقہ کے لہجے کی اپنائیت اور لگاؤ اچنبھے کا باعث تھا۔

لیکن یہ لگاؤ اجنبی سا لگا۔ سوچ کے دھاروں کا رُخ بدل نہ سکا۔ قدرے ترشی سے بولے۔ "یہ پوچھنے کا تمہیں کیا حق ہے۔"

"شاید کوئی ہو ۔ ۔ ۔ ۔" وہی مسحور کُن آواز اُبھری۔ لگاؤ سے بھرپور۔ اپنائیت کا پہلو لیے ہوئے۔

ریحان کے ہاتھوں سے کتاب گرتے گرتے بچی۔ صاعقہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں دبا دبا سا تبسم بکھر جانے کی کوشش میں تھا۔ ریحان کو اپنی بصارت و سماعت پر قطعاً یقین نہ آ رہا تھا۔

چند ثانیے خاموشی رہی ۔ وہ اسے دیکھتے رہے۔

خاموشی سے گھبرا کر سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر صاعقہ نے سر اُٹھا کر ان کی طرف حیا بار نظروں سے دیکھا۔ مسکراہٹ قابو میں نہ رہ سکی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔ چور تبسم پھسل پھسل گیا۔

"صاعقہ" ریحان جیسے خواب میں بڑبڑائے۔

"جی" خواب میں سرگوشی اُبھری۔

"کیا کہا تھا؟" بہت کچھ سمجھنے کے باوجود یہ استفسار بے محل نہ تھا۔

"سن لیا ہوتا" اک شوخ ادا سے نگاہ غلط انداز ان پر ڈالتے ہوئے وہ قریبی کھڑکی کی طرف گھوم گئی۔

ریحان گُنگ سے کھڑے تھے۔

صاعقہ بظاہر لاتعلقی سے دریچے میں کھڑی باہر حد نگاہ تک پھیلے ہوئے سبزے کو دیکھتی رہی۔

چند ثانیے یونہی گزر گئے۔

امید نے اک نئی راہ دکھائی۔ ریحان ڈگمگاتے قدموں سے اس پر چل دیئے۔ بڑھ کر اس کے قریب آ گئے "سن تو لیا۔ ۔ ۔ لیکن سمجھا نہیں۔"

صاعقہ نے اک کافر نگاہ ان پر ڈالی۔ "سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات تھی۔"

ریحان از خود رفتہ سے کھڑے رہ گئے۔

صاعقہ نے ادائے دل نوازی سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر حیات افروز

تبسم لہرا گیا۔ گردن موڑ کر وہ پھر باہر دیکھنے لگی۔

ریحان بے سدھ بے خود سے نظر آ رہے تھے۔ ان کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو مدتوں بھٹکتے رہنے کے بعد اچانک اور بالکل اچانک منزل سے ہم کنار ہو گیا ہو۔

"صاعقہ نے حسین گردن کو ہلکا سا خم دے کر انہیں گوشۂ چشم سے بڑے مسحور انداز میں دیکھا۔ آج کوشش کے باوجود لبوں پر مسکراہٹ لہرانے سے باز نہ آ رہی تھی۔

اس کا ہر انداز جرأت کی کھلی دعوت تھا۔ ریحان کی سنجیدگی کچھ اور بڑھ گئی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے عالمِ خواب میں ہوں۔ واقعات خود بخود ڈھلتے جا رہے ہوں۔ اور ان کا ان پر اختیار ہو نہ قابو۔۔۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

خاموشی جو دونوں کے صبر کی انتہا سے ٹکرا رہی تھی۔

اور پھر! خاموشی ہی خاموشی میں جذبات مچل گئے۔

ریحان نے صاعقہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

ریحان نے اس کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔

وہ کسی مشینی گڑیا کی طرح ان کی طرف گھوم گئی۔

خاموشی کے طلسم سے دونوں مسحور نظر آ رہے تھے۔

وہ ریحان کے مقابل کھڑی تھی۔ ریحان کا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر تھا دائیں ہاتھ سے انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ انگلی کے سہارے سے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

صاعقہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"تمہیں۔۔۔ کیا۔۔۔ سمجھوں۔۔۔" خاموشی میں اک سرگوشی اُبھری۔

"اپنے دل کی آواز" صاعقہ نے لمحہ بھر کو آنکھیں کھول کر ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سچ" وفورِ جذبات سے آواز کانپ گئی۔

صاعقہ کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ وہ لہرا گئی۔ جیسے اپنا ہی بوجھ اٹھانے کی سکت نہ رہی ہو۔

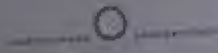
"صاعقہ" بے تابی سے ریحان نے اس کے لہراتے وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

وہ کسی مدافعت و مزاحمت کے بغیر ان کی چھاتی سے جا ٹکرائی۔

ریحان کے بازوؤں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ وہ اسے سینے میں چھپا لینا چاہتے تھے۔ جیسے دل کی آواز کو دل ہی میں سمو لینا چاہتے ہوں۔

"ریحان!" صاعقہ سسک اُٹھی۔ اس کے آنسوؤں سے ریحان کی قمیص نم ہو گئی۔ ریحان گنگ سے ہو گئے۔ صاعقہ کے ریشمی بالوں پر گال ٹکا کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ اس مسافر کی طرح نظر آ رہے تھے جو پہروں تپتی دوپہر میں ریتلے میدان میں ننگے پاؤں چلنے کے بعد اچانک کسی گھنیرے درخت کی چھاؤں پا کر بے سدھ ہو گیا ہو۔۔۔



(۴۱)

اسی شام کے ڈوبتے اندھیروں میں سمیرا ریحان کے انتظار میں برآمدے کے ستون کا سہارا لیے کھڑی تھی ۔ ماں کے ایما اور دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر آج وہ ریحان کو باہر جانے کی ضد سے باز رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

حسبِ توقع ریحان ادھر آئے۔ وہ بڑی ترنگ میں تھے۔۔۔ کسی دلنواز نغمے کی طرح لہرا رہے تھے۔ سمیرا کو دیکھ کر وہ خُود ہی رک گئے۔

دوچار رسمی سی باتوں کے بعد ریحان نے جانا چاہا۔ لیکن سمیرا نے انھیں باتوں میں الجھائے رکھا۔

"آپ کب تک جا رہے ہیں ۔ ریحان"؟ اس نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے پُوچھا۔

"کہاں"

"یورپ"

ریحان مسکرا دیئے۔

"کب جا رہے ہیں۔"

"تمہیں کس نے کہا۔"

"کیا؟"

"کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔"

"ٹالیے نہیں۔"

"ٹالنے کی کیا بات۔ میں جا ہی کب رہا ہوں" وہ ہنس دیے۔

"ارادہ بدل دیا۔۔۔؟" سمیرا سنجیدہ تھی۔ "بنائیے نہیں۔ سچ سچ کہیے۔"

"ہاں"

"سچ"

"بالکل"

"آپ کی ضد تو ہنگامہ بن چکی تھی۔ یہ اچانک تبدیلی کیسی۔۔۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے!"

"نہیں سمیرا مذاق نہیں۔۔۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"اچانک ارادہ بدل گیا۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"کیوں؟"

"ہر بات پوچھا نہیں کرتے" ریحان نے اس طرح کہا جیسے کسی چھوٹے سے بچے کو بہلانے کی کوشش کی ہو۔

"پھر بھی؟" سمیرا سنجیدہ تھی۔

"تم کیا چاہتی ہو۔۔۔ کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔" ریحان نے مذاق میں کہا۔

"ہائے اللہ! آپ تو ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔۔۔ میں تو پوچھ رہی ہوں آپ یوں اچانک ارادہ ملتوی کیوں کر بیٹھے۔۔۔"؟

"کہہ دیا نا ہر بات پوچھا نہیں کرتے۔۔۔" ریحان کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی ۔ سمیرا انہیں اتنے دنوں بعد مسرور دیکھ کر حیران بھی تھی۔

"بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔"

"تجھ سے دشمنی ہے کوئی۔"

"کیوں۔"

"خوش دیکھ جو نہیں سکتیں۔"

"ہائے اللہ" وہ لجا گئی۔

"ابھی کہتی ہو میں نے جانے کا ارادہ کیوں ترک کر دیا ۔ یعنی تمہارے خیال کے مطابق مجھے چلے جانا چاہیئے تھا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میرے جانے سے خوش ہو۔۔۔"

"تو۔۔۔ باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ میں آپ کے جانے سے خوش کیوں ہونے لگی۔۔۔ میں تو خود نہیں چاہتی تھی کہ آپ جائیں۔"

سمیرا کی آواز کچھ کانپ سی گئی۔

"دیکھو لو ہم نے تمہاری خواہش کا کتنا احترام کیا۔ ریحان نے بڑی ترنگ میں کہا۔۔ "جانے کا ارادہ ہی بدل دیا۔"

سمیرا مذاق کو حقیقت کا رنگ دے کر فرطِ مسرت سے سُرخ ہو گئی، شاہ رُخ کے آ جانے سے وہ چپ ہو گئی۔ ریحان چند ایک ادھر اُدھر کی باتیں کر کے چل دیے۔

آج وہ کتنے خوش تھے۔ یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ پھول کی طرح کھِل رہے تھے۔

لپکتے لپکتے وہ طویل برآمدہ طے کر کے دائیں طرف مڑے۔ اپنی دھن میں تھے۔ اسد سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"اوہ!" دونوں کے منہ سے نکلا۔ پھر دونوں مسکرا دیے۔

"میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔۔۔ کہاں تھے۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" اسد نے کہا۔

"ایسی کیا ضرورت تھی۔۔۔؟" ریحان شوخی سے مسکرائے۔

"تمہارے کاغذات لے آیا ہوں۔"

"اوہ!"

"پورا دن نذر ہو گیا ان سرکاری کارروائیوں میں۔"

"مجھے افسوس ہے۔۔۔ تمہاری محنت رائگاں گئی" وہ ہنس دیے۔

"کیوں؟" اسد کچھ نہ سمجھے۔

ریحان شوخی سے مسکرائے۔

"محنت رائگاں کیوں گئی؟"

"ان کاغذوں کو آگ دکھا دو" وہ شوخ نظروں سے اسد کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کیا کہہ رہے ہو۔" اسد جھنجھلائے۔

"میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اسد" ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ریحان خوشی سے مسکرا دیئے۔۔۔ "اب میں نہیں جاؤں گا۔۔۔ نہیں جا سکتا۔ نہیں جا سکتا اسد!"

ریحان وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسد سے لپٹ گئے۔ یہ والہانہ انداز ان کی

بے پناہ خوشیوں کا غماز تھا۔ اسد کو اپنے عزیز دوست کی خوشی سے بے پناہ مسرت ملی

"یہ مجھ سے زور آزمائی کس لیے کر رہے ہو۔۔۔ بات کیا ہے۔ مجھے تو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آ رہا۔ چہرہ تو دکھاؤ۔ ریحان ہی ہو۔۔۔ یا اس مردے کے پیکر میں کوئی اور رُوح سما گئی ہے"۔ اسد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"مذاق نہ کرو اسد۔۔۔ میری خوش بختیوں پر مجھے مبارک باد دو" ریحان ان سے الگ ہو کر بولے۔

"یہ خوش بختیاں اچانک کہاں سے ٹپک پڑیں۔"

"اللہ کی دین ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔ لیکن یہ دین اچانک ہوئی کیسے؟ وہ آگ کی لپٹیں کیا ہوئیں؟"

"گلزار بن گئیں۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسے؟"

"یہ تو میں ابھی تک خود بھی سمجھ نہیں پایا۔"

"بنتے کیوں ہو۔"

"واللہ نہیں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔"

اور پھر

اسد کے اصرار پر ریحان نے صاعقہ سے ملاقات کی ساری روئداد کہہ ڈالی۔

اسد مسکراتے ہوئے سن رہے تھے۔

"میں نہ کہتا تھا۔ تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"مایوسی کے اندھیروں میں ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔"

"واقعی ہر چیز تیرہ و تار نظر آتی تھی۔"

"اور اب؟" اسد نے شوخی سے پوچھا۔

"اب۔۔۔ اب۔۔۔ کچھ نہ پوچھو دوست۔۔۔" ریحان خوشی سے جھوم گئے۔ "شعر کی لطافت صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔۔۔ تشریح اس لطافت کو بکھیر کے رکھ دیتی ہے۔"

"اوہ"

دونوں مسکرا دیئے۔

رات فسوں خیز تھی۔

ریحان خواب گاہ کے مغربی دریچے کھولے باغ کی اونگھتی فضاؤں اور مدہوش ہواؤں میں گم سے تھے۔ تقدیر کا اچانک اور غیر متوقع التفات جہاں بے پناہ خوشیوں کا حامل تھا، وہاں اک لطیف سی الجھن بھی پیدا کر گیا تھا۔

صاعقہ کے نرم و گداز جسم کا لمس اور اس کے مہکتے سانسوں کا ہوشربا طلسم ابھی تک حواس پہ چھایا تھا۔

جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے جاگتے میں کوئی حسین سا خواب دیکھ لیا ہو۔

اور

پھر

جانے کیوں وہ یہ سوچ کر بیقرار سے ہو گئے۔ کہ یہ کہیں کوئی انوکھا خواب ہی نہ ہو۔ کوئی فریب خیال، کوئی سراب ------ اپنی تشنہ آرزوؤں کا عکس۔

وہ سوچ سوچ کر گھبرانے لگے۔

وہ رات کے کھانے پر بھی حاضر نہ تھی۔

کیا عجب تنہائی کے فسوں نے ان لمحوں کو جنم دیا ہو۔ جنھیں اپنی تقدیر کے درخشندہ ستارے سمجھ بیٹھے ہوں۔

یہ خیال مضحکہ خیز سہی، حقیقت سے بعید سہی لیکن ریحان اس خیال سے بے طرح گھبرانے لگے۔ بعض اوقات انسان اپنی الٹ پلٹ سوچوں ہی سے اپنے لیے خاصی الجھنیں پیدا کر لیتا ہے۔ ریحان بھی اس وقت کچھ اسی کیفیت سے دوچار تھے۔

وہ کمرے سے نکل آئے۔ کچھ دیر برآمدے میں ٹہلتے رہے۔

ان کا جی چاہا صاعقہ کی خواب گاہ میں جا کر اسے بلا لائیں۔ اور مدہوش اور متوالی فضاؤں میں ایک دوسرے کے قریب، ایک دوسرے میں کھوئے کھوئے بیٹھے رہیں۔ وقت گزرتا جائے۔ گزرتا جائے۔ اور وہ وقت اور ماحول کی قید سے آزاد ایک دوسرے میں کھوئے رہیں۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔

جرأت کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

لیکن عشق عقل کی قید و بند میں کب تک محبوس رہ سکتا تھا۔ وہ بڑے برآمدے کا آخری موڑ گھوم کر صاعقہ کی خواب گاہ کی طرف چل دیئے۔

دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ آیا خواب گاہ سے باہر نکلی۔ ریحان کچھ جھجکے۔

پھر

آگے بڑھ گئے۔

"صاعقہ سو تو نہیں گئیں؟" ریحان نے چلتے چلتے آیا سے پوچھا۔

"نہیں" آیا نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی لازوال چمک تھی۔

ریحان قدم بڑھا کر دروازے کے قریب پہنچے۔ لیکن پردہ اٹھانے سے پہلے آیا کی آواز پر پلٹے۔

"صاحبزادہ صاحب وہ کمرے میں نہیں ہیں۔"

"کہاں گئیں؟"

"شاید باغ میں"

"اس وقت؟"

"ہاں۔ کہہ رہی تھیں نیند نہیں آرہی ------"

ریحان نے چاہا پوچھ لیں۔ بیرونی باغ میں گئی ------ یا پچھلے ------ لیکن آیا سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جہاں بھی ہوگی جذبۂ عشق اسے ڈھونڈ لے گا۔

وہ مڑے۔

آیا نے آہستگی سے کہا "پچھلے باغ میں شاید بارہ دری کی طرف گئی ہیں۔ شام مجھے ستار وہاں پہنچانے کے لیے کہا تھا۔"

آپا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی ۔ ریحان اس مسکراہٹ سے کچھ خفیف سے نظر آنے لگے ۔ آپا کو ممنونیت سے دیکھتے ہوئے وہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے ۔ پچھلے باغ میں جانے کے لیے یہ راستہ مختصر تھا ۔

ریحان جیسے ہواؤں کے دوش پر اُڑتے چلے جا رہے تھے ۔ مقناطیسی کشش منزل کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی تھی ۔

بارہ دری کی سنگین عمارت ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی میں بڑی پراسرار دکھائی دے رہی تھی ۔ ریحان کا سیلِ شوق انھیں بہائے لیے جا رہا تھا ۔

آپا کا کہنا درست تھا ۔ صاعقہ بارہ دری میں تھی ۔ دائیں جانب کی سیڑھیوں پر ارغوانی قالین بچھا تھا ۔ جو چاندنی میں سیاہی مائل نظر آ رہا تھا ۔

صاعقہ نے دودھیا رنگ کا چمکیلا گاؤن پہن رکھا تھا جس کی ڈوریاں اس کے کندھوں کی ڈھلانوں پر پھسل رہی تھیں ۔ باریک سا دوپٹہ شانوں پر پھیلا تھا ۔ گاؤن کا پھیلاؤ بارہ دری کی دو سیڑھیوں پر تھا ۔ وہ اس ملگجی سی چاندنی میں کوئی خوابناک سا تصور لگ رہی تھی ۔ ستار قریب ہی رکھا تھا ۔ لیکن صاعقہ کا دھیان اس کی طرف نہ تھا ۔
قریب ہی پھولوں کی بیلیں اُٹھتی چلی گئی تھیں ۔ صاعقہ لاشعوری طور پر بیل سے پھول اور پتیاں نوچتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھیں ۔

ریحان دبے قدموں سے اس کے قریب آ گئے ۔ دودھیا چمکیلے لباس میں صاعقہ بیٹھی انھیں یوں محسوس ہوئی ۔ جیسے چاند کی ساری چاندنی صاعقہ کے پیکر میں سمٹ آئی ہو ۔

نگاہِ شوق و تجسس سے دیکھتے ہوئے وہ اس کے سامنے آتے ہوئے رک گئے ۔

"اوہ ۔۔۔" صاعقہ کی محویت ٹوٹی ۔ کچھ گھبراہٹ ، کچھ شوق ، کچھ وارفتگی اس کے سراپا پر چھا گئی ۔ ریحان مسکرا دیئے ۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی ۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں حیا کا بار اتنا تھا کہ وہ پھر ریحان کی طرف نہ دیکھ سکی ۔

آج شام اسے جانے کیا ہو گیا تھا ۔ وہ کس بیباکی سے ریحان کے سینے سے جا لگی تھی ۔ اس احساس سے وہ کتنی زیر بار تھی ۔ کتنی شرم آ رہی تھی اُسے ۔۔۔ رات وہ کھانے کے کمرے میں بھی تو اسی لیے نہ گئی تھی ۔ ریحان سے سامنا کرتے ہوئے اسے بڑی ہی جھجک آئی تھی ۔ وہ دیر ہی سے سوچ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی ۔

اب ریحان کو یوں سامنے کھڑے دیکھ کر وہ گھبراہٹ اور ندامت کے ملے جلے جذبات سے دوچار تھی ۔

لیکن ان جذبات میں شوق کا عنصر بھی تھا ۔ ہجومِ تمنا بھی اور جانفزا آرزو بھی ۔ وہ جھجک کر سمٹی ۔

ریحان بلا جھجک اس کے قریب جا بیٹھے ۔

صاعقہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی ۔ ریحان کی جواں جواں نظروں سے اسے کتنا حجاب آ رہا تھا ۔

"مخل تو نہیں ہوا؟" ریحان نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

صاعقہ لجا گئی ۔

"صاعقہ" ریحان قدرے وقفے کے بعد پھر بولے ۔

صاعقہ نے کوئی جواب نہ دیا ۔ اس کی تو زبان گنگ ہو گئی تھی جیسے ریحان کی قربت لطیف احساسات کو بھڑکا رہی تھی ۔ اک سرور سا تھا جو سر تا پا چھایا جا رہا تھا ۔ جواب دینے کی فرصت ہی کسے تھی ۔

ریحان نے گردن کو خم دے کر قدرے جھکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا ۔ شرماتی لجاتی صاعقہ دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی ۔ اک طمانیت کا احساس ان کی شریانوں میں دوڑتے لہو میں نشہ کی کیفیت پیدا کر گیا ۔

"میری موجودگی ناقابلِ برداشت تو نہیں؟" محبوب نظروں کی شہ پا کر ریحان شوخی سے بولے ۔

صاعقہ نے اک نگاہِ غلط انداز ان پر ڈالی ۔ اس کے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو رہا تھا ۔ اس نے شرما کر منہ پھیر لیا ۔

کچھ دیر خاموشی رہی ۔ ایسی خاموشی جس میں نغموں کا ترنم تھا ۔ بہاروں کی دلکشی تھی ۔ ایک دوسرے کی جانفزا قربت کا احساس حواس پر سرور و انبساط بن کر چھا رہا تھا ۔

"صاعقہ" سکوت کو اس سرگوشی نے توڑ دیا ۔

"جی" وہ آہستگی سے بولی ۔

"نیند آ رہی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر چپ کیوں ہو ۔ کوئی بات کرو۔"

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا ۔ ایسی نظروں سے جن پر خواہ مخواہ پیار آجائے ۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں اب بات کرنے کو رکھا ہی کیا ہے۔

"تنہائی چاہتی ہو۔ تو میں چلا جاؤں۔" کچھ رک کر ریحان بولے۔

"تنہائیوں سے نباہ کرتے تھک چکی ہوں" صاعقہ مترنم لہجے میں بڑی آہستگی سے بولی۔

"صاعقہ" ریحان وفورِ جذبات سے آگے کچھ نہ کہہ سکے ۔ بے اختیار ہو کر انھوں نے صاعقہ کا ہاتھ تھام لیا ۔ پھر اسی مترنم خاموشی کا فسوں طاری ہو گیا ۔

نرم و گداز سنہری ہاتھ ریحان کے مضبوط ہاتھ میں تھا ۔ وہ بے اختیاری کے عالم میں بار بار ہاتھ دبا رہے تھے ۔ یہ دباؤ ان کے پیار کی شدت اور عشق کی تندی کا غماز تھا۔

صاعقہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ریحان نے اس کا ہاتھ نہیں اس کی زندگی کی باگ ڈور اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی ہو ۔

اس رات دونوں دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔

ایک دوسرے کی قربت کا جانفزا احساس نشہ بن کر چھایا رہا۔

دونوں نے بہت کم باتیں کیں۔

لیکن

جو سرورِ تکلم اس خاموشی میں تھا، وہ شاید صدیوں باتیں کرنے پر بھی میسر آسکتا تھا۔

(۴۳)

اُبھرتی صبحوں کے فرحت بخش اجالے اور ڈوبتی راتوں کی چاندنی کے نور میں ڈوبے اندھیرے صاعقہ اور ریحان کے عشق کے شاہد تھے ۔ دن میں بہت کم دونوں کا ٹکراؤ ہوتا ۔ اگر ہوتا بھی تو صاعقہ بڑی خوب صورتی سے کترا جاتی ۔ ریحان بعض اوقات جھنجھلا بھی جاتے ۔ شاکی ہوتے تو صاعقہ بڑی اپنائیت سے کہتی ۔ "آپ بدل گئے ہیں ریحان ۔ زمانہ تو نہیں بدلا۔۔۔ چبھتی ہوئی نظروں کا نشانہ کیوں بنانا چاہتے ہیں مجھے۔"

ریحان قائل ہو جاتے ۔ گھر والوں کے خیالات سے وہ بے خبر تو نہ تھے ۔ صاعقہ بھی تو تھی ۔ یہ اسی کی محتاط روی تھی ۔ جو اب تک دونوں کے تعلقات عشق کی بلندیوں کو چھونے کے باوجود کسی کی نظروں میں نہ کھٹکے تھے ۔ ریحان کے ہمدم و ہمراز اسد تھے ۔ ریحان دل کی دھڑکنوں کی لے پر تھرکتے ہوئے نغمے انھیں سنا دیا کرتے تھے ۔ اسد کتنے خوش تھے ۔ لیکن اس کے باوجود ماحول و فضا دیکھتے ہوئے ریحان کے راز ان کے سینے کی گہرائیوں میں دفن تھے ۔

لیکن احتیاط کے باوجود صادق جذبات کا اظہار موقع بے موقع ہونے ہی لگا ۔ کوئی صاعقہ کی نحوست کا نام لیتا تو ریحان کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو جاتا، بات کرنے والے کو لینے کے دینے پڑ جاتے ۔ یہ حمایت اکثر نظروں میں کھٹکنے لگی۔

کوئی کھیل کھیلا جاتا تو صاعقہ کا وہاں ہونا ضروری ہو جاتا۔ کھیل میں حصہ لینا نہ سہی ۔ خاموش تماشائی کی حیثیت سے اسے وہاں بیٹھنا پڑتا ۔ اب تو ریحان کی نگاہیں ایسے موقعوں پر محبت و عقیدت کے خاموش اظہار میں بھی بیباکی سے کام لینے لگی تھیں ۔

ریحان کے بدلتے تیور کئی ہم جلیسوں کی نظروں میں کھٹک رہے تھے ۔ لیکن

ابھی تک اظہارِ خیال کی جُرأت کسی کو نہ ہوئی تھی ۔ ایسی انہونی بات پر یقین کرنا بھی تو آسان نہ تھا ۔

دن گزرتے جا رہے تھے ۔

فرخ نے سینما کا پروگرام بنایا ۔ اس تفریح کے لیے وہ دن موزوں بھی بہت تھا ۔ کچھ ردوکد کے بعد دادی حسن بانو سے اجازت لے لی گئی ۔ کہ نوجوانوں کی پارٹی سینما جائے گی ۔

مقررہ وقت پر دس پندرہ لڑکوں اور لڑکیوں کا حسین جھمگھٹا برآمدے میں تھا ۔ چار موٹریں تیار تھیں ۔ سب سے اگلی موٹر ریحان کی ذاتی گاڑی تھی ۔ جس کے پائدان پر ایک پاؤں رکھے وہ سیاہ چشمہ ہاتھ سے گھما رہے تھے ۔ اگلی سیٹ پر کیمرہ بھی رکھا تھا ۔ سب سے الگ تھلگ کھڑے وہ سراپا انتظار تھے ۔

برآمدے میں خاصا شور تھا ۔ ریشمی اور رنگین لباسوں کی مہکتی سرسراہٹیں اس شور کو مترنم بنا رہی تھیں ۔

"سب آگئے؟" فرید نے آتے ہی اک اچٹتی سی نظر اس حسین جھمگٹے پر ڈالی ۔

"ہاں" کسی نے جواب دیا۔

"تو انتظار کس کا ہے ۔ وقت تو ہو رہا ہے۔"

"صاعقہ نہیں آئیں" ثمینہ نے کہا۔

"وہ بھی جائے گی؟" سمیرا نے بڑی نخوت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ۔ کیوں نہیں" شاہد بولے۔

"کسی نے کہا تھا اس سے"؟ فرخ نے پوچھا۔

"پروگرام تم نے بنایا کہنا بھی تمہارا ہی فرض تھا" نعیم بولے۔

"مجھے تو اس کا خیال ہی نہ آیا" فرخ نے کہا۔

"اب جا کر کہہ دیں وہ کونسا جائے گی" سمیرا نے جیسے اس کی کسمپرسی پر رحم کھایا۔

"جائیں گی کیوں نہیں" اسد بولے۔

"اب کہوں تو برا مانیں گی" فرخ کچھ کترائے۔

"کچھ ضرورت نہیں اب ۔ میں نے کہہ دیا تھا۔" اسد بولے۔

"پھر آئی کیوں نہیں۔"

"میں نے کہا نا۔ اس نے جانا تھوڑا ہی ہے ۔ یہ پروگرام کوئی نیا تو نہیں ۔ پہلے کب ہمارے کسی پروگرام میں حصہ لیا ہے اس نے"۔ سمیرا بڑے غرور سے بولی۔

"بھئی جائیں گی اور ضرور جائیں گی ۔ ۔ ۔" اسد نے دور کھڑے ریحان کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا ۔ لیکن اس مسکراہٹ کو معنی کا جامہ کوئی نہ پہنا سکا ۔

یونہی باتیں ہوا کیں۔

"وہ آگئیں" اسد نے برآمدے کے آخری سرے پر صاعقہ کو دیکھا سفید لباس میں وہ یوں نمودار ہوئی جیسے شفاف مطلع پر اچانک ماہِ کامل نمودار ہوا ہو ۔ جھجکتے قدموں سے وہ اس رنگ و بو کے سیلاب کی طرف بڑھی ۔

"چلو چلو جلدی کرو" نعیم نے آستین کھینچ کر وقت دیکھا۔

کئی نظریں صاعقہ کی طرف اٹھ گئی تھیں ۔ کوئی اس کے حسن کی معترف ہوئیں ۔ کوئی مرعوب ہو کر رہ گئیں ۔

سمیرا نے اسے سر تا پا یوں گھورا جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو ۔ اس کے آجانے سے محفل کا رنگ بھی تو پھیکا پڑ گیا ۔ اب تک ستارے ہی جھلملا رہے تھے ۔ چاند اتر آنے سے جیسے ستاروں میں روشنی نہ رہی ہو۔

باتیں کرتے ہوئے لڑکوں لڑکیوں کا حسین جھرمٹ پورچ میں آگیا ۔ صاعقہ سب سے پیچھے تھی ۔ ثمینہ ساتھ دینے کو کچھ رسمی سی باتیں کر رہی تھی ۔

ریحان اسے دیکھ کر سب کی طرف آگئے ۔

"بیٹھنے کی کیا ترتیب ہو گی؟" فرخ نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی ۔

"چار موٹریں ہیں ۔ حساب نکالو" نعیم بولے۔

"چار نہیں" ریحان نے ٹوکا۔

"کیوں ۔ ۔ ۔ چار ہی تو ہیں۔" فرید گنتے ہوئے بولے۔

"میری گاڑی شامل نہ کرو" ریحان اسد کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولے۔

"کیوں؟" کئی آوازیں تھیں۔

"اس میں صرف ایک سواری کی گنجائش ہے۔" ریحان ہنسے ۔ اسد انھیں گھور کر مسکرائے ۔ اور صاعقہ اس شوخ جسارت پر سرتاپا کانپ گئی۔

"وہ کون خوش نصیب ہے"؟ نعیم نے کن انکھیوں سے سمیرا کی طرف دیکھا۔
شاہرخ نے سمیرا کی کمر میں ٹہوکا دیا اور سمیرا کانوں کی لوؤں تک سُرخ ہو گئی۔

"بھئی جلدی کرو نا دیر ہو رہی ہے۔" اسد نے بات کا رخ بدلا۔

"کون کس گاڑی میں بیٹھے یہ بھی تو پتہ چلے۔ ریحان نے تو صاف جواب دے دیا ہے۔ اب ایک گاڑی اور نکالنا پڑے گی۔"

"تو پھر لے جائیے اپنی سواری کو۔۔۔"

ریحان بڑھے۔

سب کی نظریں سمیرا پر لگی تھیں۔ جو پھولوں سے لدی شاخ کی طرح دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

لیکن

سب کا قیافہ غلط تھا۔

ریحان سب کے پیچھے سے گھوم کر صاعقہ کی طرف آئے۔

صاعقہ اس غیر متوقع بات پر بے طرح گھبرا گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

"آؤ" ریحان نے اس کی حیرت سے پوری کھلی آنکھوں میں مسکرا کر دیکھا۔

صاعقہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"آؤ بھی" ریحان نے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھاما اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لے گئے۔

اک سناٹا سا طاری ہو گیا۔ گنگ، ششدر اور حیرت سے بُت بنے سب دیکھتے رہ گئے۔ ریحان نے کسی کی پروا کیے بغیر اسے اگلی نشست پر دھکیلا۔ دروازہ بند کر کے دوسری طرف آئے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا اور پھر سب کی طرف دیکھے بغیر گاڑی چلا دی۔

اسد کے علاوہ کوئی بھی تو کچھ نہ سمجھ سکا۔

"یہ کیا؟؟؟" آنکھوں ہی آنکھوں میں استفسار ہو رہے تھے۔

اچھا خاصہ معمہ تھا۔

جو نوعیت کے اعتبار سے انوکھا بھی تھا اور دلچسپ بھی۔

ہر کوئی اس معمے کا حل چاہتا تھا۔

"بیچاری صاعقہ" بالآخر سکوت کو سمیرا نے توڑا۔

"بیچاری"!!

"تو اور کیا۔ ریحان ساتھ لے گئے ہیں۔ اللہ جانے کیا گت بنائیں گے۔"

کوئی نیا مذاق سوجھا ہے انھیں"؟

"میں بھی دیکھ رہا تھا کہ کئی دنوں سے ریحان اس کی حمایت کر رہے ہیں۔"

"یہی تو ان کے مذاق کی تمہید ہے۔"

"پچھلے واقعات یاد نہیں آپ کو۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ ایک دفعہ پہلے بھی ریحان نے یوں ہی اسے بنایا تھا۔"

"لیکن ہے بری بات۔۔۔ جب تو خیر وہ چھوٹی تھی۔ اب یہ فعل کچھ زیب نہیں دیتا۔"

"اسی لیے تو میں نے بیچاری کہا۔"

"بری بات ہے۔"

"واقعی۔"

اسد سگریٹ ہونٹوں میں دبائے یہ تبصرہ سن رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں میں سگریٹ سے کہیں زیادہ مسکراہٹ دبی تھی۔

"اب یہیں کھڑے رہنا ہے؟"

"چلیے۔"

"ایک اور موٹر نکال لائیں۔"

"لانا پڑے گی۔"

"مجھے تو بار بار صاعقہ کا خیال آ رہا ہے۔ بیچاری" سمیرا نے پھر ہمدردی جتائی۔ شاید دل میں اُٹھنے والے کسی موہوم خدشے کا ردِ عمل تھا۔

سب سمیرا کے ہم خیال نظر آ رہے تھے۔ جذبہ ترحم موج میں آیا ہوا تھا۔ بار بار صاعقہ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔

چوتھی گاڑی بھی لائی گئی۔ سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی اور اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سینما کی طرف چل دئے۔

۴۴

موٹر سینما جانے والی کشادہ سڑک کو چھوڑ کر اس تنگ سڑک کی طرف گھوم گئی۔ نصیر آباد کی پہاڑیوں کے دامن سے ہوتی ہوئی اونچائیوں کی طرف دھیرے دھیرے اٹھتی جا رہی تھی۔

صاعقہ کے حواس پر اب تک گھبراہٹ اور خوف کی کپکپی طاری تھی۔ ریحان کی جسارت ڈھکے چھپے رازوں کو مشتہر کر دینے کو کافی تھی۔ اور اس بات سے جن نتائج کے ظہور پذیر ہونے کی توقع تھی۔ صاعقہ ان کے خیال ہی سے سہم گئی تھی۔

ریحان اس کی قلبی کیفیت سے آگاہ تھے۔ دو تین بار بلانے پر بھی وہ نہ بولی تو ریحان شرمسار اور مخمور نگاہوں سے اسے مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگے۔

صاعقہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پہاڑیوں کے اٹھتے ہوئے سلسلے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

ریحان نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زیرِ لب مسکراتے ہوئے لاتعلقی سے سٹیرنگ تھامے بیٹھے رہے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ سراسیمہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہوش میں آ گئیں" ریحان نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"آپ نے بہت بُرا کیا" وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

"کیا؟"

"سب کے سامنے......"

"تمہیں بھگا لیا"۔

صاعقہ انہیں گھور کر رہ گئی۔

"ڈر رہی ہو" قدرے توقف کے بعد ریحان نے پھر چھیڑا۔

صاعقہ پلکیں جھپکا کر انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"بزدل" ریحان مخمور سے نظر آ رہے تھے۔

"وہ سب کیا کہیں گے؟"

"میں بتاؤں"۔

صاعقہ انہیں شاکی نظروں سے گھور رہی تھی۔

"بتاؤں کیا کہیں گے سب" ریحان چھیڑنے کے موڈ میں تھے۔

"جائیے بھی" صاعقہ کی خفگی میں بھی لگاوٹ تھی۔

"بتا دوں؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"میں جانتی ہوں کیا کہیں گے سب ـ ـ ـ" اور پھر وہ مغموم سی ہو گئی۔ افسردہ آواز میں بولی "اک قیامت کھڑی ہو جائے گی۔"

"ہونہہ" ریحان کی گرفت سٹیرنگ پر مضبوط ہو گئی۔ سنجیدہ اور ٹھوس آواز میں بولے: "اس قیامت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

صاعقہ اس آواز کے ٹھوس اور سنگین استحکام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

گاڑی پیچیدہ راستے پر آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔

کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد صاعقہ نے گوشۂ چشم سے ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک خاصے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"آپ کس طرف جا رہے ہیں؟"

"کیوں؟"

"سینما نہیں جا رہے؟"

"بڑا شوق ہے فلم دیکھنے کا!"

"نہیں تو......"

"پھر چپ چاپ بیٹھی رہو۔"

"کچھ پتہ بھی تو چلے۔"

"مجھ پر اعتماد کرو۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔"

"تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں کا کیا جواب دوں۔"

صاعقہ مسکرا کر انھیں دیکھنے لگی۔

اک پیچیدہ موڑ سے کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں ریحان نے کاڑی روک دی ۔ سیاہ چشمہ آنکھوں پر تھا ۔ کیمرہ کندھے پر ڈالا ۔۔۔ اور دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے "آؤ"۔

صاعقہ اس معمول کی طرح جو عامل کے اشارۂ ابرو پر ناچ اٹھتا ہے ۔ کاڑی سے نکل آئی ۔

موسم انتہائی رنگین تھا ۔ اونچے لانبے درختوں میں الجھی ہوئی پچھلے پہر کی دھوپ ہواؤں کی رندانہ چھیڑ سے کانپ رہی تھی ۔ پہاڑیوں کے اٹھتے ہوئے طویل سلسلے بڑے جاذبِ نظر تھے ۔ سبز مخملیں گھاس پر خودرو پھولوں کے گچھے بڑی بہار دکھا رہے تھے ۔ دور پہاڑی ندی الہڑ نغمے گنگناتی مستی کے عالم میں اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔

ایک اونچے پتھر پر ریحان صاعقہ کے قریب کھڑے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"آؤ" کچھ دیر بعد ریحان پتھر سے نیچے اترے۔

"اب کہاں"؟

"نیچے ۔۔۔۔۔ گھاٹی میں"

"وہاں ۔۔۔۔۔ وہاں کیا کریں گے"؟

"ان مدہوش فضاؤں میں کھو جائیں گے"۔

صاعقہ کے لب مسکرائے ۔ جیسے نازک سی پنکھڑیاں ہوا کے ہلکوروں سے کانپ گئی ہوں ۔

"واپس چلیئے"۔

"کیوں"

"سب سینما میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

"کرنے دو"۔

"لیکن"

"صاعقی ۔۔۔۔۔۔ خواہ مخواہ اس فضول ذکر سے بور نہ کرو"۔

"فضول ذکر"؟

"تو اور کیا ۔ دیکھو کتنا مدہوش کُن سماں ہے ۔ بھول جاؤ سب کچھ بھول جاؤ ان لمحوں کو کسی ڈر یا خوف سے مغلوب نہ ہونے دو"۔

ریحان نے صاعقہ کا ہاتھ تھام لیا اور محتاط قدموں سے گھاٹی میں اترنے لگے ۔

نفیس سفید ریشمی لباس میں صاعقہ کتنی حسین دکھائی دے رہی تھی ۔ چہرے پر خوشی کے تاثرات بھی تھے اور تفکر کے سائے بھی ۔ یہ حسین سا امتزاج اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔

کافی دیر دونوں اس گھاٹی میں گھومتے رہے۔ ریحان نے صاعقہ کی کئی تصویریں لیں ۔ درختوں کے گھنیرے سایوں تلے، ندی کے کنارے، پتھروں پر بیٹھے ہوئے خودرو پھولوں کے قدرتی تختوں کے درمیان، حسن کے کئی انداز کیمرے کی آنکھ میں مقید ہو گئے ۔

دھوپ کے سائے دراز ہونے لگے ۔ ہواؤں میں کچھ تیزی آگئی ۔ صاعقہ دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی ۔ کئی بار واپس چلنے کی استدعا کی تھی لیکن ریحان الجھ پڑے تھے ۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا ۔ لیکن ریحان تو جیسے وقت، ماحول اور اپنے آپ کو بھول جانے کے لیے آئے تھے۔ وہ سبز گھاس پر ایک ہاتھ کا تکیہ بنائے نیم دراز تھے ۔ سگریٹ کے کش اطمینان سے لیتے ہوئے وہ پاس بیٹھی خوف زدہ سی صاعقہ کو دیکھ رہے تھے ۔

"ابھی تک ڈر رہی ہو"؟ انھوں نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔

"اب تو چلیئے"۔

"کیوں"؟

"یہیں رات گزارنا ہے"؟

"عمر گزر جائے تو پروا نہیں"۔

"یہ شاعری چھوڑیئے حقیقت کی دنیا میں آیئے ۔ سب سینما سے واپس ہونے والے ہوں گے ۔ وہ کیا کہیں گے ریحان ۔۔۔۔۔"

کہیں گے صاعقہ اور ریحان اک ان ٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ وہ لاپرواہی سے بولے۔ لیکن اس بات کے پس پردہ طوفان کا احساس صاعقہ کے رگ و پے میں کپکپی پیدا کر گیا۔

"کیوں صاعقی ...... ٹھیک ہے نا، یہی کہیں گے نا سب"۔

صاعقہ نے بےچارگی سے ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ اچانک کچھ زیادہ ہی مغموم ہو گئی تھی۔ ریحان کے شگفتہ استفسار کا جواب وہ معمولی سی مسکراہٹ سے بھی نہ دے سکی۔

"صاعقی"!

"جی"

"کیا بات ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

"ڈر رہی ہو نا۔"

"ہاں"

"پگلی"

"ریحان"

"ہوں"

"آپ نے اچھا نہیں کیا!"

"کیوں؟"

"سب کیا کہیں گے۔"

"صاعقی اگر میں یہ کہہ دوں کہ یہ قدم میں نے اٹھایا ہی اس لیے ہے کہ سب کچھ کہیں ...... تو"

صاعقہ حیران سی انھیں دیکھنے لگی۔

ریحان اس کے برابر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولے "صاعقی اب میری برداشت جواب دے گئی تھی۔ کب تک ہم مجرموں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے رہتے۔ پیار کرنا کوئی جرم تو نہیں ...... میں دانستہ آج تمہیں سب کے سامنے یہاں لے آیا ہوں۔ سب جان جائیں ...... کسی کو کوئی غلط فہمی نہ رہے۔"

"سب کا جان جانا۔ جانتے بھی ہیں کتنا ......" اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔ آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ سر جھکا کر وہ گھاس کے تنکے مسلنے لگی۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں صاعقی ...... لیکن اپنے عزم میں بھی پوری آن ہے۔ میں سب سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تم ذرہ بھر تردد نہ کرو صاعقی ...... میں کسی بات سے بے خبر نہیں جسے سر نہ کیا جا سکے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے ریحان" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے بھی۔"

ریحان نے اس کی ٹھوڑی چھو کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔

صاعقہ نے ریحان کی نظروں سے نظریں ملائیں تو اسے یوں محسوس ہوا کہ ریحان اس کے لیے ایک ایسا سہارا ہیں جو خاندان تو ایک طرف، زمانہ بھی ٹکرا جائے تو لرزیدہ نہ ہو ...

"میرے ہوتے ہوئے بھی ڈرتی ہو صاعقہ" ریحان نے پھر پوچھ لیا۔

"نہیں" صاعقہ نے سحر زدہ آواز میں کہا۔

ریحان کو جیسے اس نے جہان بھر کی خوشیاں دے دیں۔ خوشی سے سرشار ہو کر جھوم گئے۔

"کسی کی پرواہ نہ کرو ... کسی کے بارے میں نہ سوچو ... بھول جاؤ۔ سب تلخیاں بھول جاؤ۔ ان لمحوں کو ڈر یا خوف سے ملوث نہ کرو ... ہنسو۔ مسکراؤ ...... گاؤ ...... ایک دوسرے کی قربت میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ حاصل زندگانی ہے صاعقی۔

میں تو صرف یہی جانتا ہوں ...... بھول جاؤ ...... سب کچھ بھول جاؤ"

اور صاعقہ

جیسے سب کچھ ہی بھول گئی۔

ریحان کی سنگت میں وہ مسکراتی رہی۔ ہنستی رہی اور زندگی کی شادمانیوں سے اپنی جھولی بھرتی رہی۔

ریحان نے گانے کی فرمائش کی۔

اور

اس کی جاں گداز آواز سے فضائیں مرتعش ہو گئیں۔ وہ دلفریب انداز میں

ریحان کے قریب بیٹھی حسین نغمے سناتی رہی ۔

خاصی شام ہو رہی تھی ۔ جب ان متوالوں کو وقت کا احساس ہوا ۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے بلندی کی طرف چڑھنے لگے ۔

بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے ریحان اک نشیبی جگہ پہ آکر رک گئے ۔

"تمہیں ایک یادگار دکھاؤں" ریحان نے کہا ۔

"میں جانتی ہوں ۔ یہ ابا مرحوم کی یادگار ہے۔" وہ عقیدت سے سر جھکا کر بولی ۔

"تم پہلے کبھی یہاں آئی ہو؟"

"اکثر"

"اکیلی؟"

"نہیں ۔ آپا کے ساتھ ۔۔۔۔۔ اس نے بتایا تھا ۔۔۔۔۔ یہاں ابا مرحوم نے گر کر جان دی تھی۔"

"دادی حضور نے یہاں پتھر چنوا دیئے تھے تاکہ یادگار رہے۔۔۔۔۔"

دونوں چند لمحے خاموشی سے ان بے جان پتھروں کو عقیدت سے دیکھتے رہے ۔ جن سے اک شہید وفا کی داستان وابستہ تھی ۔

○

(۴۵)

سینما میں ریحان کا سبھی انتظار کر رہے تھے ۔ لیکن سمیرا کے انتظار کی نوعیت جدا تھی ۔ گھبراہٹ، خوف اور پریشانی کے ملے جلے جذبات سے وہ انتظار کر رہی تھی ۔ ریحان صاعقہ کو ساتھ لے گئے تھے ۔ سمیرا نے ان کی یہ حرکت ان کی شرارت سے تعبیر کی تھی لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا، اُس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

فلم شروع ہو گئی۔

لیکن

کسی نے دلچسپی سے فلم نہ دیکھی ۔ سرگوشیاں ہی ہوتی رہیں ۔ نعیم، فریدون، فرخ، شاہد وغیرہ کھسر پھسر کر رہے تھے ۔ اسد اطمینان سے سگریٹ پیتے ہوئے انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے ۔

وقفہ شروع ہوا۔ سب لڑکے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ سگریٹ کی طلب سے کہیں زیادہ انہیں ریحان کے متعلق کُرید تھی۔

"ابھی تک وہ دونوں لاپتہ ہیں۔"

"کہاں گئے۔"

"کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔"

"قصہ کیا ہے؟"

"اگر ریحان مذاق کے موڈ میں ہیں تو سراسر زیادتی ہے۔

سگریٹ پھونکتے ہوئے سب قیاس آرائیاں کر رہے تھے ۔ اسد بڑی لاتعلقی سے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔

"یہ کیا قصہ ہے صاحب؟" فرید نے اسد سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں" اسد راکھ جھاڑتے ہوئے بولے۔

"کچھ تو جانتے ہو۔"

اسد نے سن کر نفی میں سر ہلایا۔

لیکن ہنسی اتنی معنی خیز تھی کہ سب ان کے گرد ہو گئے ۔

"کیا بات ہے ۔ کچھ تو بتاؤ۔"

"میں کیا بتاؤں۔"

"جو جانتے ہو۔"

"صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کا سینما کا پروگرام نہیں تھا۔"

"ہیں؟؟؟" ششدر سی نگاہیں اسد کی طرف اٹھ گئیں ۔

"حیرانگی کی کیا بات ہے؟" اسد نے سب کو چپ دیکھ کر پوچھا۔

"کیا پروگرام تھا ان کا؟"

"کہیں سیر و تفریح کا۔"

"صاعقہ کے ساتھ؟؟" فرخ نے طنزیہ ہنس کر کہا۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے فرخ ۔۔۔۔۔۔"

"عجیب سی بات ہے۔"

"عجیب کیوں؟"

"ریحان اور صاعقہ ۔۔۔۔۔۔ صاعقہ ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ ریحان"۔

"کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے"۔

"یہ بات ہے؟"

"کیا واقعی؟"

چہ مے گوئیاں ہونے لگیں ۔

"چلو تمہیں اس سے کیا ۔ معاملہ ریحان اور صاعقہ کا ہے ۔۔۔۔۔" اسد ہنس کر بولے ۔ لیکن سب حیران سے کھڑے تھے ۔ فرخ تو اب بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھے ۔ فرید البتہ خوش ہوئے تھے۔

انکشاف حیران کن تھا لیکن دلچسپی کا پہلو لیے ہوئے ضرور تھا۔

بات چیت کا موضوع بدل گیا۔

"محبت غیر اختیاری جذبہ ہے ۔۔۔۔۔۔" ریحان کی مثال سامنے رکھ کر اچھی خاصی

بحث ہونے لگی۔

"کہیں یہ کسی مذاق کی تمہید تو نہیں" فرخ نے ہنس کر کہا۔

"نہیں" اسد بولے۔

"ریحان سنجیدہ ہیں" نعیم نے پوچھا۔

"پورے خلوص کے ساتھ" اسد نے جواب دیا۔

"واقعی؟"

"ہاں"

"چند دنوں سے مجھے کچھ شبہ ضرور ہو رہا تھا۔" شاہد کچھ سوچ کر بولے ۔

"ریحان کا بدلا ہوا رویہ میں نے بھی محسوس کیا۔"

"اس دن دیکھا نہیں ۔۔۔۔۔۔ صاعقہ جب تک چمن میں آئی نہیں ۔ جناب نے کھیل شروع نہیں کیا۔"

"اور اس دن جب بڑی ممانی نے اسے منحوس کہا تو کس طرح ان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔"

"یہ جو اکثر غائب رہتے تھے میں بھی کرید میں تھا۔"

"کچھ کھٹک مجھے بھی ضرور رہی تھی لیکن اتنا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔"

"اب بھی یقین نہیں آرہا ۔ کہ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہو گیا؟"

"اچانک ۔۔۔۔۔۔ بالکل اچانک ۔۔۔۔۔۔ آناً فاناً" اسد ہنس کر بولے۔

"مجھے دلی خوشی ہوئی ۔۔۔۔۔۔" فرید بولے۔

"واقعی ۔۔۔۔۔۔ اب تو صاعقہ کی مظلومیت پر دل کٹ جاتا تھا"۔

"میرا تو دل سہم گیا ہے ۔ خوشی کیسی" فرخ بولے۔

"کیوں؟"

"خدا ہی خیر کرے ۔۔۔۔۔۔ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔"

"یہ تو ہو گا ہی۔"

"نانی حضور اپنی آن اور وقار کی خاطر جلاد بھی بن سکتی ہیں ۔ انہوں نے تو کچھ اور طے کر رکھا ہے۔"

"ہوں۔"

سب کچھ متفکر سے نظر آنے لگے۔

شاید سلسلۂ گفتگو طوالت کھینچتا ۔ لیکن وقفے کی گھنٹی ہو چکی تھی۔ سب کیبن کی طرف مڑے۔

"میرا تو جی نہیں چاہ رہا --- واپس گھر چلیں۔" نعیم نے کہا۔

"نہیں" فرید نے جواب دیا۔

"وہ نہیں آئیں گے" شاہد بولے۔

"کیوں؟" سمیرا نے جلدی سے پوچھا۔

"ان کا پروگرام کچھ اور تھا۔" شاہد ہنس کر بولے ۔ اسد نے آنکھ کے اشارہ سے روکا ۔ لیکن وہ یہ اشارہ سمجھے نہیں ۔

"کیسا پروگرام؟" سمیرا بیتابی سے بولی۔

شاہد شاید وضاحت کر دیتے ۔ لیکن اسد نے بڑھ کر ان کی کمر میں ٹہوکا دیا ۔ بتیاں بجھ گئیں۔ اندھیرے میں اسد نے شاہد کا کان مروڑ کر یہ وضاحت کرنے کی کوشش روک دی ۔

باقی سارا وقت کسی کا دل فلم دیکھنے میں نہیں لگا ۔ کھسر پھسر ہوتی رہی ۔ سمیرا نے بہت کان دھرے ۔ لیکن پلے کچھ نہ پڑا۔

اس کی الجھن بیقراری بن گئی ۔ بار بار دل کو سمجھایا ۔ خود ہی دل کو تسلیاں دیں۔

صاعقہ اور ریحان کو ازل و ابد کے سرے مان کر سوچا ۔ دو مخالف راستے خیال کیا ۔ لیکن ہر تسلی پر دل بیٹھتا ہی گیا ۔

شاہد کی بات سے تو وسوسے کچھ تشویشناک ہو گئے تھے ۔

واپسی پر سبھی باتیں کر رہے تھے۔

لیکن

وہ خاموش تھی ۔ گھر پہنچنے تک طبیعت اچھی خاصی خراب ہو چکی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھی ریحان کی رہائش گاہ کی طرف گئی ۔

ملازم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے ۔

وہ صاعقہ کے کمرے کی طرف گئی ۔

آیا سے پوچھا۔

لیکن صاعقہ بھی ابھی تک نہ آئی تھی۔

اس کی بے قراری بڑھتی گئی ۔ معاملہ سوچ کی حدود سے باہر تھا ۔ لیکن دل اس واقعے کی سنجیدگی کی گواہی دے رہا تھا۔

ریحان ، صاعقہ بار بار دونوں نام اس کے ذہن میں تلاطم بپا کر رہے تھے۔

ریحان کو وہ اپنا بہت کچھ مان چکی تھی ۔ گو کبھی ان کی طرف سے اظہار محبت کی طرف قدم نہیں اٹھایا گیا تھا ۔ تاہم وہ ان کی دلچسپی سے بے بہرہ نہ تھی اور پھر گھر والوں کے خیال سے بھی تو آگاہ تھی ۔ دادی نے جو کچھ سوچا تھا' اس کی بھنک بھی تو کانوں میں پڑ چکی تھی ۔

شام کے دھندلکے گہرے ہو چکے تھے ۔ وہ بیتابی کے عالم میں بیرونی برآمدے میں ٹہل رہی تھی ۔ وہ ان دونوں کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی ۔

کافی دیر ٹہلنے کے بعد اس نے تھک کر ستون کا سہارا لیا ۔ اس کی نظریں الحمراء کے گیٹ پر لگی تھیں ۔

خاصہ اندھیرا پھیل چکا تھا ۔ جب ریحان کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی گھبراہٹ سے سمیرا کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا ۔ جلدی سے وہ برآمدے کے ستونوں کے ساتھ لپٹی ہوئی بیلوں کی اوٹ میں ہو گئی۔

ریحان گاڑی پورچ کی طرف لائے ۔ تیز روشنی میں ریحان کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر سمیرا کا دل ہی تو ٹوٹ گیا ۔

اور

جب انہوں نے ہاتھ کے سہارے سے صاعقہ کو گاڑی سے باہر آنے میں مدد دی تو اس کا دل تو چلتے چلتے جیسے تھم ہی گیا ۔

ریحان نے جھک کر اس کے کان میں جانے کیا کہا۔

وہ کترا کر ایک طرف کو ہٹی ۔ اور پھر شرما کر بھاگی ۔ سامنے والے دروازے میں داخل ہوتے وقت ایک بار بڑی ادا سے مڑ کر ریحان کو دیکھا ۔ پھر اندر غائب ہو گئی ۔

سمیرا کی جیسے کسی نے ساری قوت سلب کر لی ۔ وہ بیلوں کی آڑ میں کسی بے جان بت کی طرح گڑی تھی ۔ ریحان گاڑی واپس لے گئے ۔

۳۶

سمیرا نے رات جیسے انگاروں پر لوٹتے ہوئے کاٹی ۔ صاعقہ اور ریحان کی انوکھی محبت کا انکشاف ہی دل جلا دینے کو کیا کم تھا۔ اس پر صاعقہ کا انداز قیامت تھا ۔ رات کھانے کے کمرے میں جاتے وقت برآمدے میں اس کا صاعقہ سے سامنا ہو گیا تھا ۔ زہر بھرے طنز سے اس نے پوچھا تھا "کونسی فلم دیکھی آج؟"

لیکن جواباً صاعقہ نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا ۔ کس شان استغنا سے وہ اسے نظرانداز کرتی کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی ۔

سمیرا کے زخموں پر یہ نمک پاشی ------ رات اس نے تلملاتے ہوئے گزاری وہ اس شعلے کی طرح بھڑک اٹھی جس کی ہر لپک میں کسی کا خرمن جلا دینے کی بیقراری ہو ۔ رات بھر بیقراری سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ معمول سے کچھ پہلے ہی بستر سے اٹھ بیٹھی ۔

دل گھبرا رہا تھا ۔ روح میں جلن محسوس ہو رہی تھی ۔ ریحان سے زیادہ اسے صاعقہ پر غصہ آ رہا تھا ۔ اس ذلیل اور منحوس لڑکی کی جسارت پر وہ زہریلی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی ۔

اس نے اپنا گاؤن پہنا اور کمرے سے باہر نکل گئی ۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے تپتے ذہن کو سکون دیا ۔ لیکن اس کی سوچ سے وہی آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں ۔ ستون سے ٹیک لگا کر وہ کافی دیر کھڑی رہی ۔ ہر گزرنے والا لمحہ اسے صاعقہ سے متنفر کر رہا تھا ۔ انتقامی آگ بھڑک رہی تھی ۔

وہ یونہی گھومتی پھرتی رہی ۔ بیقرار ------ بے چین ------ وہ کافی دور نکل گئی ۔ دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ۔

سورج ابھر رہا تھا ۔ دریا کی سطح پر سنہری کرنوں کا جال سا پھیلا تھا ۔ سمیرا اس حسین منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے کھو سی گئی ۔

دریا کی روپہلی لہروں پر اک گلابی کشتی بڑی روانی سے بہی چلی جارہی تھی ۔ سمیرا کی محویت اس کشتی کو دیکھ کر ٹوٹ گئی ۔

سمیرا غور سے کشتی کی طرف دیکھنے لگی ۔ اتنی دور سے کسی کو شناخت کرنا تو ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کا دل بے طرح دھڑک دھڑک کر آگہی دینے لگا کہ یہ صاعقہ اور ریحان کے سوا اور کوئی نہیں ۔ لڑکی کا فیروزی آنچل ہوا سے لہرا لہرا کر لڑکے کے کندھے سے چھو رہا تھا ۔ سمیرا نے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے جیسے یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ رہی ہو ۔

کشتی اک روانی کے ساتھ بہی چلی جارہی تھی ۔ سمیرا نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں ۔ کشتی کو حسرت سے دیکھتے ہوئے اس نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی اور بھی تو سکتا ہے ۔ اسد اور گلرخ کیوں نہیں ہو سکتے ۔ انھیں تو کشتی کی سیر کا جنون ہے ۔ طفل تسلیوں سے وہ اپنے دل کو بہلانے لگی ۔

کشتی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے روپوش ہو گئی۔

وہ کتنی ہی دیر انتظار میں کھڑی رہی ۔ کشتی پھر نظر نہ آئی ۔ مایوس ہو کر وہ وہاں سے ہٹی اور آہستہ آہستہ اس جگہ جا پہنچی ۔ جہاں محل کے ساکنوں کی تفریحی کشتیاں بندھی رہتی ہیں ۔

بوڑھا نگہبان چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا ۔ سمیرا کو دیکھتے ہی مودبانہ اٹھ کھڑا ہوا ۔

"کشتی کھول دوں سرکار؟" اس نے انکسارانہ لہجے میں پوچھا ۔

"نہیں" سمیرا نے سوچ میں کھوئے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا ۔

بوڑھا کسی استفسار کا منتظر رہا۔

سمیرا نے دریا کی سمت نظر دوڑائی ۔ کشتی کا کہیں نام و نشان نہ تھا ۔ تجسس اپنی جگہ بدستور اکسا رہا تھا ۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا "گلابی کشتی میں کون سیر کے لیے گیا ہے؟"

بوڑھا نگہبان خاموش تھا ۔ سمیرا نے پھر اپنا سوال دہرایا ۔ بوڑھے نے لاٹھی کا سہارا لیا ۔ جب ریحان اور صاعقہ گئے تھے ۔ بوڑھا اپنی کوٹھری میں تھا ۔

"شاید اسد میاں گئے ہوں ۔ اکثر وہی اس سمے سیر کے لیے کشتی لے جاتے ہیں"

لیکن جانے اندر سے کونسی آواز اٹھ رہی تھی جو بوڑھے کے ان الفاظ کو جھٹلا رہی تھی ۔ سمیرا کے چہرے سے بے اطمینانی جھلک رہی تھی ۔ وہ محل کی طرف جانے کی بجائے دریا کی سمت مڑ گئی ۔

کنارے کے ساتھ درختوں کے گھنے جھنڈ میں وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی ۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کشتی میں کون ہے ۔ انتظار جان لیوا ہی سہی ------ لیکن وہ اس کوفت سے دوچار ہونے کے لیے تیار تھی ۔ اپنے زخم خوردہ جذبات تسکین جو چاہتے تھے ۔

وہ سامنے دریا کی سطح پر نظریں جمائے بیٹھی تھی ۔

اک نقرئی قہقہے نے اسے چونکا دیا ۔ اس نے جلدی سے دیکھا ۔ گلابی کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی ۔ وہ درختوں کی اوٹ میں نہ ہوتی تو شاید ریحان کی نظر اس پر پڑ ہی جاتی ۔ دھڑکتے دل سے اس نے پھر کشتی کی طرف دیکھا ۔ وہ پتھر کے ساتھ ساتھ ہو کر گزر رہی تھی ۔ صاعقہ کا چہرہ بشاش تھا ۔ جانے اس نے کس بات پر قہقہہ لگایا تھا ۔

کشتی گزر گئی ۔ سمیرا کا دم سینے میں رکنے لگا ۔ وہ وہیں بیٹھی کشتی کو دیکھتی رہی ۔ کچھ ہی دور کشتی ایک ہموار جگہ پر کنارے سے جا لگی ۔

پہلے ریحان اترے ۔

اور

پھر

ہاتھ کا سہارا دے کر انہوں نے صاعقہ کو اتارا ۔ صاعقہ ان کے بازو پر لچکیلی شاخ کی طرح جھول گئی ۔

اور

سمیرا نے گھبرا کر آنکھیں زور سے بند کر لیں ۔ قوت برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ۔ کچھ دیر وہ بے سہارا ناؤ کی طرح ڈولتے جذبات کی کش مکش میں مبتلا رہی ۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں ۔ اور اس طرف دیکھا جس طرف ریحان کے بازو پر صاعقہ لچکیلی شاخ کی طرح جھول گئی تھی ۔

ریحان کشتی کا رسہ درخت سے باندھنے کے لیے کھینچ رہے تھے اور صاعقہ انھیں

بڑھنے میں مدد دے رہی تھی ۔

چند لمحوں بعد دونوں وہاں سے جانے کے لیے مڑے ۔

شانہ بشانہ چلتے ہوئے مخمور و شادماں وہاں سے درختوں کی اوٹ میں ہو گئے ۔

سمیرا انھیں حسرت سے دیکھتی رہی ۔

اور

اس کے سینے میں ناکامی کی آگ کا دھواں اٹھتا رہا ۔ وہ اس شکست خوردہ سپاہی کی طرح نظر آ رہی تھی ۔ جس کے اعصاب پر شکست جھنجھلاہٹ اور افسردگی بن کر نمایاں ہو جاتی ہے ۔

ناشتے کی میز پر جب سمیرا پہنچی تو ریحان کی عدم موجودگی پر دادی بڑی برہم ہو رہی تھی ۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے سونے کا ۔ اس عمر میں اتنی سستی کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں ۔ یا تو ناشتے کے وقت آنے کا ہی نہیں ۔ یا اتنی دیر سے پہنچے گا کہ سب انتظار دیکھ دیکھ کے تھک چکے ہوں ۔ نیند نہ ہوئی نشہ ہو گیا ۔ ہوش ہی نہیں آتا ۔ آج بھی دیکھ لو ۔ جناب ابھی تک سو رہے ہوں گے ۔"

"سو کہاں رہے ہیں دادی حضور" سمیرا دادی کے سامنے ہی تو بیٹھی تھی ۔ موقع ملتے ہی زہر اگلنے کو تیار ہو گئی ۔

"سو نہیں رہا تو ناشتے کے لیے آیا نہیں ؟"

"کشتی کی سیر کی تھکن اتار رہے ہوں گے ۔" سمیرا نے طنزیہ انداز میں کہا ۔ زاویہ نظروں سے اس نے صاعقہ کی طرف دیکھا ۔ کانٹا بے اختیار اس کے کانپتے ہونٹوں سے پھوٹ گیا تھا ۔ اسد نے سمیرا کی بات سنی اور پھر صاعقہ کی طرف دیکھا ۔ فق چہرہ لرزتے ہاتھ ، سفید ہونٹ --- حاضر دماغی سے کام لے کر انہوں نے فوراً ممن بانو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔ باتوں میں یوں الجھایا کہ وہ اور کوئی بات سمیرا سے کر ہی نہ سکیں ۔

اور

کوئی عجب نہ تھا کہ سمیرا اسی وقت کوئی ایسی بات اگل دیتی جو ریحان و صاعقہ کے تعلقات کو مشتہر کرنے کو کافی ہوتی --- اور دادی کا عتاب بدبختی کی مہر بن کر

صاعقہ کی تقدیر پر اسی وقت ثبت ہو جاتا ۔

صاعقہ سہمی ہوئی میز پر بیٹھی رہی ۔ سمیرا کی بات اور بات کرنے کے طریق سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے ریحان اور اسے کشتی میں جاتے دیکھ لیا ہے ۔ وہ بیچاری تو ریحان کی کل کی جسارت سے سہمی ہوئی تھی ۔ اس پر یہ انکشاف ۔۔۔ خوف اس کے سراپا پر چھا کیوں نہ جاتا ۔

سمیرا صاعقہ کی طرف دیکھ کر خوش ہو رہی تھی ۔ اس کی دگرگوں حالت اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی ۔۔۔ مسرور تھی کہ اس نے صاعقہ پر واضح کر دیا کہ وہ انھیں کشتی کی سیر کرتے دیکھ چکی ہے اور یہ دیکھ لینا ہی ان کے حق میں قیامت بن سکتا ہے ۔ ان کے خوابوں کو اک لمحہ میں بے تعبیر بنا سکتا ہے ۔

میز سے اٹھتے وقت صاعقہ و سمیرا کی نگاہیں ملیں ۔ سمیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔

جس میں ناکامی کی راکھ بھی تھی ۔ اور انتقام کی آنچ بھی ۔

صاعقہ اس مسکراہٹ سے بے طرح سہم گئی ۔

---

(۴۷)

محل کی بالکنی میں فوزیہ کھڑی تھی ۔ وہ باغ کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ نگاہیں شوق اور دلچسپی کی غماز تھیں ۔

کسی کام کی غرض سے ادھر سے گزر ہوا تھا ۔ نگاہ اچانک نیچے باغ کی طرف گئی اور اسی کی ہو کر رہ گئی ۔ وہ جالی دار کٹہرے کو پکڑے دلچسپی سے نیچے دیکھنے لگی ۔

پچھلے پہر کی دھوپ کے لانبے سائے خوبصورتی سے گھاس پر پڑ رہے تھے ۔ اونچے اونچے درخت ۔۔۔ پھیلی پھیلی بیلیں ۔۔۔ رنگا رنگ پھولوں سے سجی ہوئی روشیں ۔ مرمریں فواروں سے پھوٹتی ہوئی پھوار ۔۔۔ پہر کے لانبے سایوں والی دھوپ میں دستِ باغبان سے نکھرا ہوا باغ بڑا دلفریب دکھائی دے رہا تھا ۔

فوزیہ کو باغ کی مہکتی فضا نے متوجہ کیا تھا نہ فواروں کی دلکش اور مترنم پھوار نے ۔ اس کی توجہ کا مرکز دور درختوں کے عقب میں دوڑتے ہوئے لڑکی اور لڑکا تھے ۔ ریحان کو تو اس نے دور ہی سے پہچان لیا تھا ۔ کچھ دیر پہلے اسی براؤن سوٹ میں اس کے پاس ہی تو بیٹھے تھے ۔

اور

لڑکی ؟

سرمگیں آنچلوں والی لڑکی اس نے سمیرا سمجھ لی تھی ۔

جوانی کے معصوم کھیل کو وہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی ۔ لڑکی آگے آگے بھاگ رہی تھی اور لڑکا اسے پکڑنے کو لپک رہا تھا ۔

ریحان کے ہاتھ میں آنچل کا سرا آگیا ۔ فوزیہ زیر لب مسکرا دی ۔ وہ کسی انجانے جذبے کے تحت وہاں سے ہٹنے کو تھی کہ :

"امی !" پشت سے سمیرا کی آواز پر وہ چونک گئی ۔ ایک دم پلٹ کر اس کی طرف

دیکھا ۔

"تم ۔۔۔۔۔۔ تم؟" وہ ہکلا سی گئی ۔ جلدی سے پھر اس نے نیچے باغ میں دیکھا ۔ ریحان نے سارا دوپٹہ اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا تھا ۔ لڑکی درخت سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی تھی ۔ اس کا صرف دایاں بازو ہی نظر آ رہا تھا۔

"دادی حضور آپ کو بلا رہی ہیں" سمیرا نے آہستگی سے کہا ۔

فوزیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا ۔ اس کا چہرہ افسردگی کا رنگ لیے ہوئے تھا ۔

"تم کہاں تھیں؟" اس نے پلکیں جھپکا کر بیٹی کو دیکھا۔

دادی حضور کے پاس"

"میں سمجھی ریحان کے ساتھ باغ میں ہو ۔۔۔۔۔۔" وہ بڑبڑائی ۔

سمیرا نے اک گہرا سانس لیا ۔ فوزیہ کی نظروں سے اس کی بے چینی چھپی نہ رہ سکی ۔

"وہ کون ہے؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"کہاں؟" افسردہ آواز میں جواباً پوچھا ۔

"وہ!" فوزیہ نے باغ کی طرف اشارہ کیا۔ "ریحان کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔؟"

سمیرا نے نیچے دیکھا ۔ درخت کے ساتھ لگی لڑکی کا بازو نظر آ رہا تھا۔

ریحانہ دوپٹہ ہاتھ پر لپیٹے ہوئے کچھ آگے کو جھکے تھے ۔ سمیرا کا رنگ متغیر ہو گیا ۔

"کون ہے وہ ۔ ۔ ۔" فوزیہ نے بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاعقہ کے سوا کون ہو سکتا ہے" سمیرا پلٹی ۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں ۔

"صاعقہ ۔۔۔۔۔۔" فوزیہ اس انکشاف سے گنگ ہو گئی ۔ اس نے اس بات کی وضاحت کے لیے سمیرا سے کچھ پوچھنا چاہا ۔

سمیرا آنچل سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ وہ کسی شکستہ عمارت کی طرح چور چور نظر آ رہی تھی ۔

فوزیہ نے ایک نظر اسے دیکھا ۔ پھر نیچے باغ کی طرف ۔

صاعقہ و ریحان ہاتھ میں ہاتھ دیے نچلے تختوں کی طرف جا رہے تھے وہ نظروں سے

وجھل ہو گئے

اور

فوزیہ مرقع حیرت بنی وہیں کھڑی رہی۔

"بیگم صاحبہ" کنیز کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا ۔

"ہوں"۔

"بڑی بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں"۔

"سمیرا کہاں ہے؟"

"نیچے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔"

خالہ جان سے کہہ دو میں کچھ دیر بعد آؤں گی۔"

کنیز چلی گئی ۔

فوزیہ کچھ لمحے سوچ میں ڈوبی کھڑی رہی ۔ سمیرا کے چہرے کی افسردگی اور آنکھوں کے آنسوؤں نے اس کی ناکامی کی داستان کہہ سنائی تھی ۔ اپنی ایک ہی ایک نازوں کی پالی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اس کا صبر و قرار لٹتا کیونکر نہیں۔۔۔

وہ سمیرا کے احساسات و جذبات سے آگاہ تھی ۔ ریحان کو وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ لیکن اب یہ نیا قصہ۔۔۔ فوزیہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ وضاحت کے لیے اسے سمیرا سے ہی سب کچھ پوچھنا تھا ۔

تیز قدموں سے وہ سمیرا کے کمرے کی طرف چل دی ۔

سمیرا اپنی مسہری پر تکیے میں منہ دیے پڑی تھی ۔ کل سے وہ سارا معاملہ دادی اماں کے گوش گزار کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی ۔

بلکہ

ان کے رعب و دبدبے کے سامنے زبان پر یہ قصہ لاتے کترا رہی تھی ۔

سنائے۔۔۔ کیونکر کہے؟ یہی سوچ رہی تھی۔

فوزیہ کمرے میں آئی ۔ بیٹی کو یوں نڈھال پڑے دیکھ کر دل بیٹھ ہی تو گیا۔

پیار سے اس نے سمیرا کا کندھا ہلایا۔

سمیرا ماں کی ہمدردی اور محبت سے مچل گئی ۔ سر اٹھایا نہیں۔ تکیے میں منہ لیے لیے رونے لگی ۔

"کیا بات ہے سمیرا۔۔۔ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ تمہاری بات کی کچھ سمجھ ہی نہ آئی۔ صاعقہ تھی ریحان کے ساتھ۔۔۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

وہ پیار سے بیٹی کو بہلاتی پھسلاتی رہی۔ سمیرا سسکتی رہی۔ یہی طریق تھا جس سے ماں پر وہ اپنی ناکامی ظاہر کر سکتی تھی۔

ماں کا دل کٹا جا رہا تھا۔

"یہ سب ہوا کیونکر۔۔۔ ریحان تو اس کے سائے سے بدکتے تھے۔ سب سے زیادہ نفرت انہیں ہی تھی اس سے۔۔۔ قصہ کیا ہے؟"

بڑی دیر کے بعد سمیرا آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔۔۔ ماں بیقرار تھی۔ سمیرا نے موقعہ غنیمت جانا۔ دادی سے تو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ ماں سے سب کچھ کہہ دیا۔

ریحان اور صاعقہ کی جتنی ملاقاتیں علم میں تھیں۔ بڑھا چڑھا کر بیان کیں۔

فوزیہ بت بنی بیٹھی تھی۔

سمیرا تکیے پر گر گئی۔ وہ سسکنے لگی۔

فوزیہ گنگ سی اسے دیکھنے لگی۔۔۔ اس کا شعور لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ برسوں پہلے کچھ اس کیفیت سے وہ بھی دوچار ہوئی تھی۔ طاہر اور ناجی کی رنگین ملاقاتوں کا حال جب اسے معلوم ہوا تو وہ بھی یونہی سسک سسک کر روئی تھی۔

وہ سمیرا کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سمیرا نہیں وہ خود سسک رہی ہے۔ ناکامی کی آگ میں جل رہی ہے۔

کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی؟ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھا۔

بے چین ہو کر وہ اپنی بیٹی پر جھک گئی۔ اسے پیار کیا۔ تسلیاں دیں وہ بیٹی کو بہلا پھسلا رہی تھی اور اس کا ذہن زہریلی گیسوں کا سا اثر قبول کر رہا تھا۔ سسکتا ہوا ماضی نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔

ناجی ذہن میں تحرک رہی تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے ناجی مسکرا رہی ہو۔۔۔ اس کی ابدی ناکامی پر مسکرا رہی ہو۔ اس کی شکست پر ہنس رہی ہو۔

فوزیہ نے گھبرا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سسک رہی تھی۔

فوزیہ کا کلیجہ شق ہونے کو تھا۔

ناجی

ناجی نے اسے شکست دی۔

اور

اب

ناجی کی بیٹی اس کی بیٹی کو شکست دے رہی ہے۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی۔ وہ اپنی مرحوم بہن کا بھی ناجی کی بیٹی سے انتقام لے گی۔ سمیرا کی جھولی مسرتوں سے بھر دے گی۔ وہ صاعقہ کی بہاروں کو ویران کر دے گی۔

فوزیہ رات بھر نہ سو سکی۔

اس کا ماضی وقت کی دھول تلے دبا پڑا تھا۔ لیکن آج سمیرا کے آنسوؤں سے یہ دھول اک لمحہ میں دھل گئی۔ ماضی کے خدوخال واضح ہو گئے۔ فوزیہ کے لیے ہر چبھن تازہ ہو گئی۔

ماضی حال کی صورت میں پھر پلٹ آیا تھا۔

ناجی کی بیٹی اس کی بچی کو سرنگوں کرے۔ اس احساس سے ہی اس کا جوش رقابت خوفناک حدود کو چھونے لگا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے سارے ماحول میں ناجی کے تمسخرانہ قہقہوں کی گونج ہے۔ وہ پاگل سی ہو گئی۔

رات بھر وہ زہریلی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی۔ اس کے سینے میں آگ سلگتی رہی۔ برسوں پہلے کی خونچکاں داستانیں سر اٹھانے لگیں۔

سمیرا کے دل کا درد اسے اپنے درد کا عکس دکھائی دینے لگا۔

وہ اپنی ناکامی سہہ گزری تھی۔ لیکن اپنی بچی کی مسرتوں کے جنازے دیکھنے کی اس میں ہمت کہاں تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ صاعقہ کے خوابوں کو چکنا چور کر دے گی۔ وہ ناجی کی بیٹی سے انتقام لے گی۔ بھرپور انتقام۔ اپنا انتقام۔ اپنی بیٹی کا انتقام۔ وہ صاعقہ کو کچل کر رکھ دے گی۔

اس عمل کے لیے اسے خون کی ہولی بھی کھیلنا پڑی تو دریغ نہ کرے گی۔ اگر اس کی اینٹ سے اینٹ بجانا پڑی تو وہ چوکے گی نہیں۔

(۴۸)

فوزیہ کمرے سے نکل رہی تھی ۔

اور

صاعقہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی ۔

دونوں کی ٹکر ہوتے بچی ۔ فوزیہ کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے ۔ وہ گر گئے ۔ صاعقہ جلدی سے اٹھانے کو جھکی ۔

"چربی آگئی ۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ ہوش میں رہا کرو ۔ دماغ ٹھکانے پر لے آؤں گی ۔۔۔ بہت کچھ سمجھنے لگی ہو اپنے آپ کو ۔"

تشکر کے کسی کلمے کی بجائے صاعقہ کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے فوزیہ برس پڑی "مجھے کیا پتہ تھا ۔۔۔ چچی جان ۔۔۔ آپ اندر سے آ رہی ہیں" ہکلاتے ہوئے صاعقہ صرف اتنا ہی کہہ سکی ۔

"ہاں ہاں ۔ تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا ۔ سب کچھ اپنے آپ ہو جاتا ہے ۔ بڑی معصوم بنتی ہو ۔۔۔ تمہارے سب کرتوت میں جانتی ہوں" خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے فوزیہ بولی "سنبھل کر رہو ۔ ورنہ ۔۔۔؟"

فوزیہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی ۔

اور

صاعقہ وہیں بت کی طرح کھڑی رہ گئی ۔ فوزیہ نے کبھی اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا اپنی ہوش میں اس نے کبھی اس سے التفات نہیں پایا تھا ۔ لیکن آج ۔۔۔ آج ۔۔۔ تو اس کے تیور ہی اور تھے ۔۔۔ آنکھوں میں آگ تھی ۔ اور یہ آگ وہ الفاظ کی صورت میں اس پر برسا بھی گئی تھی ۔

رات بھی اس نے یہ آگ فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھی تھی ۔ کھانے کی میز پر وہ بار بار اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی ۔ صاعقہ کا دل سہم سہم گیا تھا ۔ ساری رات وہ ان نظروں سے خوف کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ فوزیہ کی ان نظروں کا مطلب کیا ہے ۔

سمجھ تو وہ رات ہی گئی تھی ۔ لیکن اب اس ٹکراؤ کے معمولی سے واقعے نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا ۔ صاعقہ کے لیے اس واقعے سے یہ اخذ کرنا مشکل نہ رہا تھا کہ فوزیہ ان کی محبت کے راز سے واقف ہو چکی تھی ۔

فوزیہ جیسی کینہ پرور عورت کے ہاتھ میں اتنا بڑا راز آ جانے سے جو قیامت جنم لے سکتی ہے ۔ صاعقہ اس کے خیال ہی سے اپنی جان ہوا ہوتے محسوس کرنے لگی ۔

مہرالنساء اور ریحان کی نسبت ٹھہرائی جانے والی تھی ۔ یہ اڑتی اڑتی خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی ۔ لیکن ریحان کی محبت کا سیلاب ہر بات کو بہائے گیا تھا ۔ وہ حقائق کی دنیا سے دور ہو گئی تھی ۔ اپنے آپ کو بھول گئی تھی ۔

صاعقہ کا دماغ گھوم رہا تھا ۔ اور بے ہنگم سی سوچیں اسے نڈھال کیے جا رہی تھیں ۔ ریحان پر اعتماد سہی ۔

ان کی محبت میں استحکام سہی ۔

پھر بھی وہ جانتی تھی کہ دادی کا آہنی اور اٹل فیصلہ اپنی جگہ رہے گا اور فوزیہ اپنی رنجش کے لیے اس پر مظالم ڈھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی ۔

اپنی محبت کے حسرت ناک انجام کا سوچ کر وہ تڑپ گئی ۔ افسردگی اور مایوسی کی تیز دھارا نے اس کی ساری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ اپنی تقدیر کی ہولناکیوں کا تصور ذہن میں لہراتا رہا ۔

اور

وہ

ریحان کے حسین وعدوں اور آپا کی خوش گوار تسلیوں کے باوجود کسی اچھے انجام کی توقع نہ رہی ۔

ہر طلوع ہونے والا دن اس کی مایوسیوں میں اضافے کا باعث بنتا گیا ۔ ڈر خوف نے اس کی ہستی کا سارا رس نچوڑ لیا ۔ اس کی حالت اس انسان کی سی تھی ۔ جو توپ کے منہ پر مسلط کر دیا ہو ۔ اور کسی بھی لمحہ توپ سے نکلنے والا بارود اس کی ہستی کو ریزہ ریزہ کر سکتا

فوزیہ کی نگاہیں دن بدن خوفناک ہوتی جا رہی تھیں ۔ معمولی باتوں پر بڑے بڑے طنزیہ جملے کہنا اس کا معمول بن گیا تھا۔

اس دن آپا کی طبیعت کچھ خراب تھی ۔ صاعقہ صبح ہی سے اس کے پاس بیٹھی تھی ۔ دس بجے کے قریب تکلیف بڑھ گئی ۔

صاعقہ ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے جلدی سے گئی ۔

راستہ مختصر کرنے کے لیے وہ درمیانی کمروں میں سے ہوتی ہوئی ٹیلیفون کرنے جا رہی تھی ۔ بائیں کمرے میں فوزیہ اور سعدیہ بیٹھی تھیں ۔

صاعقہ دونوں کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی ۔ جلدی سے کمرے سے نکل جانا چاہا

"بڑی جلدی میں ہو؟" سعدیہ نے یونہی کہہ دیا۔

"ملاقات کا وقت نکلا جا رہا ہو گا۔" فوزیہ نے طنز کیا۔

اور صاعقہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی ہو۔ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر وہ وہیں کھڑی رہ گئی ۔

"کیسی ملاقات" سعدیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ اسی سے پوچھ لو" فوزیہ نے تیر چھوڑا۔

"کیا معاملہ ہے۔" اب سعدیہ سنجیدہ تھی ۔

صاعقہ کا رنگ فق ہو گیا ۔ ہاتھ پاؤں سے پسینہ چھوٹ گیا ۔ سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا ۔ جانے کے لیے وہ کرسی سے ہٹی اور کمرے سے نکل گئی ۔ نکلتے ہوئے اس نے فوزیہ کے زہر آلود جملے سن ضرور لیے۔

"کم ظرف سے اچھائی کی توقع فضول ہوتی ہے ۔ کس ماں کی بیٹی ہے ۔ ماں نے عشق لڑایا تھا ۔ بیٹی کیونکر پیچھے رہتی۔"

وہ کچھ اور نہ سن سکی لیکن جو سن لیا تھا، وہی اتنا تھا کہ اس کا وجود اسے سہارنے کا متحمل نہ تھا۔

برآمدے میں رکھی ہوئی کرسی پر وہ گر سی گئی ۔ سارا ماحول گھوم رہا تھا ۔ توپ کے دہانے سے آگ برسنے کا وقت اب آ گیا تھا ۔ صاعقہ کے حواس جواب دیے جا رہے تھے ۔

جانے کتنی دیر وہ وہیں پڑی رہی۔

خادمہ اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ پہنچی ۔ آپا نے اسے بلا بھیجا تھا۔

بمشکل حواس مجتمع کر کے وہ اٹھی ۔

ڈاکٹر کو فون کیا۔

اور

آپا کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس دن وہ بڑی دیر تک آپا کے سینے پر سر رکھے روتی رہی ۔ بیمار آپا اس کی اس رُت کو اپنے ساتھ بے پناہ محبت سے تعبیر کر رہی تھی ۔ لیکن اس کی تسلیوں و تشفیوں سے صبر کے ٹوٹے بند جوڑے نہ جا سکے ۔

اسی شام سعدیہ کی کنیز خاص اس کے کمرے میں آئی ۔

سرکار آپ کو بلا رہی ہیں۔"

کنیز کا یہ جملہ کسی بم کی طرح اس کے حواس پر گرا ۔ بے حس و حرکت وہ کنیز کا منہ تکنے لگی ۔

کنیز نے دوبارہ اور سہ بارہ اپنے جملے کی وضاحت کی۔

اور

جب وہ سعدیہ کے کمرے میں لرزتے دل اور کانپتے وجود کو لیے داخل ہوئی۔ سعدیہ چند لمحے اسے ساکت نظروں سے دیکھتی رہی۔

صاعقہ نے اسے دیکھا ۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بیقرار شعلہ سعدیہ کے قلب میں مقید ہو۔

"میں تمہارے اور ریحان کے تعلقات کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں ۔ تم سے کچھ پوچھنے کی گنجائش ہے نہ ضرورت ۔ صرف اتنا کہنے کے لیے تمہیں بلایا ہے کہ تمہاری ماں اس خاندان کے وقار و عزت کو سرنگوں کر چکی ہے ۔ اب تم اسی ڈگر پر چل نکلی ہو ۔۔۔ لیکن ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ ۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک بار پھر وہی طوفان اٹھ کھڑا ہو جس کے اثرات اب تک ہمارے خاندان پر ہیں ۔ تمہیں معلوم نہیں تو یہ بھی بتائے دیتی ہوں کہ ریحان و سمیرا کی نسبت ٹھہرانے کا فیصلہ ہو چکا ہے ۔۔۔ میرے بیٹے کے راستے سے ہٹ جاؤ ۔۔۔ ورنہ انجام ۔۔۔ شاید تم اس انجام کا تصور بھی نہ کر سکو ۔ بس جاؤ ۔۔۔ صرف اتنا ہی

کہہ دینا کافی ہے کہ تم اپنے آپ کو بھولو نہیں۔"

صاعقہ اس تذلیل پر کٹ کر رہ گئی۔ ندامت سے اس کا سر جھکا جا رہا تھا، سارے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ بے بسی آنسو بن کر آنکھوں میں امڈ آئے۔۔۔

لیکن جذبۂ ترحم کس دل میں تھا۔ سعدیہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر کر بولی۔

"تم ان آنسوؤں سے ہمدردی جیتنے کی توقع نہ رکھو۔۔۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ چکی۔ یہ بھی میری شرافت سمجھو جو تمہیں بلا کر معاملے کی نزاکت سمجھا رہی ہوں۔ میں چاہتی تو سارا واقعہ ابھی تمہاری دادی کے گوش گزار بھی کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔۔۔ سمجھیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ سوچ سمجھ سے کام لو۔ چاند کو چھونے کی کوشش فضول ہوتی ہے۔"

صاعقہ کسی زندہ لاش کی طرح اس کے کمرے سے نکلی۔ اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ کیا کرے۔ ایک طرف بلکتی ہوئی محبت تھی۔ اور دوسری طرف چنگھاڑتا ہوا خاندانی وقار ریحان سے علیحدگی کا تصور بھی اس کے لیے مشکل تھا۔

لیکن

انہیں پا لینا بھی درس حالات ناممکن تھا۔

○

۴۹

صاعقہ برآمدے کے در میں کھڑی تھی۔ رات کے اندھیرے گہرے ہو رہے تھے۔ ہوئیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ گم صم سی کھڑی سوچوں کے دھارے پر بہہ رہی تھی۔ آج شام سعدیہ کے کہے ہوئے الفاظ اب تک اس کے کانوں میں سیال آگ کی طرح ٹپک رہے تھے۔

وہ واقعی اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ اس خاندان میں اپنی حیثیت کو بھول گئی تھی۔ چکوری بھی تو اپنے بال و پر کی کمزوری کو بھول کر چاند کی طرف اڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ دیوانی!

وہ بھی دیوانی تھی۔ چکوری کی طرح۔

جذباتی کش مکش نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ صبح سے شام تک کتنے لرزہ خیز واقعات کا تصادم ہو چکا تھا۔ تبھی اس کی روح لرز رہی تھی۔ وہ بے بال و پر پرندے کی طرح صرف پھڑپھڑا رہی تھی اس تباہی سے بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہ آ رہی تھی۔

"صاعقہ!" ریحان کی آواز پر وہ چونکی۔

"بہت انتظار کروایا تم نے۔ بارہ دری میں آئی کیوں نہیں؟"

صاعقہ خاموش رہی۔ اندھیرے میں ریحان اس کے تاثرات نہ دیکھ سکے۔

"آؤ"

لیکن صاعقہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

"ارے کیا ہو گیا؟" ریحان نے اس کا کندھا ہلایا۔

"ریحان۔۔" وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی۔

"کہاں؟"

"میں۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی آواز سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

"کیا بات ہے۔۔ آؤ نا ادھر چلیں۔۔ بارہ دری کی طرف۔۔"

"نہیں۔۔ نہیں۔۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"کوئی دیکھ لے گا ریحان۔"

"تمہارے حواس پر تو ابھی بھوت سوار رہے گا۔۔ پگلی۔۔ چلو آؤ۔" ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیکن

اس نے گھبرا کر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے صاعقہ۔۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"تو چلتی کیوں نہیں؟"

"کوئی دیکھ لے گا۔"

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہو گا" جھلا کر ریحان بولے۔

"طوفان پھوٹ پڑے گا" وہ سہمی ہوئی بڑبڑائی۔

"پھوٹنے دو" وہ لاپروائی سے بولے۔

ریحان نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبایا اور پھر سگریٹ کیس واپس رکھتے ہوئے لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔

لائٹر کے دم بھر کے خفیف سے شعلے میں انہوں نے صاعقہ کا چہرہ دیکھا۔ انہیں کچھ شبہ سا ہوا۔۔ دوبارہ لائٹر جلایا۔

صاعقہ نے منہ پھیر لیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے صاعقہ؟"

لیکن وہ کچھ نہ بولی۔

ریحان آگے بڑھے۔ اس کا ہاتھ تھام کر برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ وہ مسحور سی ان کے ساتھ چل دی۔ اسے ہوش تک نہ رہا کہ ابھی ابھی وہ کن مایوس سوچوں میں ڈوبی تھی۔

ریحان بازو کے سہارے اسے باغ میں لے کر چل رہے تھے۔ صاعقہ خاموش تھی۔ ریحان کا دم اس خاموشی سے الجھنے لگا۔

"صاعقی!" انہوں نے چلتے چلتے کہا۔

"جی!"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"اپنے آپ کو بھول گئی ہوں۔"

"پیار میں اپنے آپ کو بھول جانا تو بہت بڑی سعادت ہے۔۔" ریحان اپنی لے میں کہہ گئے۔ صاعقہ چپ رہی۔

دونوں بارہ دری تک آ پہنچے۔ صاعقہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔

"اپنے آپ کو بھول گئی ہو" ریحان بشاش لہجے میں بولے۔ "اس اعتراف کے باوجود پریشان رہتی ہو۔۔ بتاؤ گی نہیں کس بات سے پریشان ہو۔"

وہ ایک پاؤں سیڑھی پر رکھ کر گھٹنے پر بازو رکھ کر صاعقہ کی طرف جھک گئے۔

"صاعقہ!"

"جی"

"چپ کیوں ہو۔۔ تمہاری خاموشی میری تشویش بن رہی ہے۔ کئی دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ ہر وقت سہمی رہتی ہو۔۔ تمہارے "کچھ نہیں" کہنے کے باوجود تمہاری سراسیمگی چھپی نہیں رہتی۔۔"

صاعقہ سر جھکائے اپنی مخروطی انگلیاں عالم اضطراب میں مسلتی رہی۔ ریحان دیکھ رہے تھے۔ چند دنوں سے صاعقہ سہمی سہمی ڈری ڈری رہتی ہے، اس میں پہلی سی شوخی ہے نہ طراری۔۔ وہ اندازِ سپردگی بھی نہیں۔ ناز و ادا بھی نہیں۔۔ کبھی کبھی تو انہیں وہم سا ہونے لگتا کہ وہ ان سے خوش نہیں ہے۔

صاعقہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ریحان کے دل میں پھر وہی وہم جو کبھی کبھی انہیں پریشان کیا کرتا تھا سر اٹھانے لگا۔

"صاعقہ!"

"ہوں"

"کبھی کبھی عجیب سا وہم آنے لگتا ہے۔"

"جی"
"سوچتا ہوں، تم شاید مجھ سے خوش نہیں ہو۔۔؟"
"ریحان!" صاعقہ پارے کی طرح مضطرب ہو گئی۔
"صاعقہ یہ حقیقت ہوئی۔ تو۔۔ تو۔۔ میں نہیں جانتا میں کیا کروں گا۔۔"
"ریحان۔۔ بخدا کسی غلط فہمی میں نہ پڑیئے۔"
ریحان اس کے قریب بیٹھ گئے۔ صاعقہ نے ان کے ہاتھ پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔ ریحان نے اس کا ٹھنڈا کپکپاتا ہوا ہاتھ دبایا۔ آہستگی سے بولے۔ "مجھے معاف کر دو صاعقہ۔ یونہی تمہیں چپ چاپ دیکھ کر یہ بے ہنگم سا وہم دل میں آجاتا تھا۔"
"مجھے ڈر لگتا ہے ریحان" وہ بے تابی سے بولے۔
"کس سے؟"
صاعقہ پھر چپ تھی۔
"گھر والوں سے؟" ریحان نے پوچھا۔
"نہیں"
ریحان حیران ہو کر بولے۔ "پھر کس سے ڈرتی ہو؟"
"اپنی تقدیر سے۔"
اس کے رقت انگیز لہجے سے ریحان سر تا پا کانپ گئے۔ اسے بہلانے کو ہنس کر اس کا ہاتھ دبا کر بولے "پگلی!"
"سچ کہتی ہوں ریحان۔۔ میں ازلی بدنصیب ہوں۔ اپنی تقدیر سے ڈر لگتا ہے۔۔ تقدیر نے کبھی مجھ سے اچھا۔۔"
"تمہاری تقدیر میں ہوں صاعقی۔۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ یہ فضول سے وسوسے دل سے نکال دو۔ میرے الفاظ پر یقین نہیں تمہیں۔۔ کتنی بار سمجھا چکا ہوں۔۔"
صاعقہ کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے گرتی دیوار کو سنبھالا دے دیا ہو۔ بڑی عقیدت سے اس نے ریحان کے ہاتھ پر اپنا سر ٹکا دیا۔
اور
اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی طرح گرنے لگے۔
آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے ریحان تڑپ اٹھے۔ اپنا ہاتھ جلدی سے کھینچ کر اس نے صاعقہ کا چہرہ اونچا کیا۔ اور گھمبیر آواز میں بولے "یہ آنسو تمہیں زیب نہیں دیتے۔ صاعقہ تمہاری رگوں میں تو ان بہادر والدین کا خون ہے جو اپنے پیار کی خاطر والدین، خاندان اور زمانے تک سے ٹکرا گئے تھے۔"
"میں کیا کروں ریحان۔۔ چاروں سمت محاذ ہی محاذ ہیں۔ میں کس کس کا مقابلہ کروں۔۔؟" صاعقہ بے بسی کے عالم میں روتے ہوئے کہہ گئی۔ ریحان ان الفاظ کو سن کر مبہوت سے رہ گئے۔
اور
پھر
اس سے ان چاروں سمت محاذوں کی تفاصیل پوچھنے لگے۔
صاعقہ ڈری، سہمی، کترائی لیکن ریحان کے پُر اصرار استفسار پر اس نے سب کچھ کہہ دیا۔
سمیرا کے متعلق۔۔ فوزیہ کے بارے میں اور آج شام سعدیہ چچی کی کہی ہوئی باتوں کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔
ریحان کی حالت قابلِ دید تھی۔ گھر والوں کا سلوک صاعقہ سے اچھا نہیں تھا۔ وہ یہ جانتے تھے۔ لیکن بہیمیت ان حدود کو چھو جائے گی، انہیں گمان نہ تھا۔ غصے سے ان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ سینے میں رنج و غم سے اُبال اُٹھنے لگے۔ صاعقہ رو رہی تھی۔ لیکن وہ اس طرح مشتعل تھے کہ صاعقہ کے بہتے آنسو پونچھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ تسکین کا کوئی کلمہ بھی نہ کہہ سکے۔
"زندگی نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا ریحان" صاعقہ سسکتے ہوئے بولی۔ "اب کچھ دیا ہے تو یہ لوگ چھین لیں گے۔۔ میں۔۔ میں۔۔ کیا کروں ریحان۔۔ میں کیا کروں۔۔"
اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ بے اختیار رونے لگی۔
"چپ ہو جاؤ" وہ انتہائی افسردہ آواز میں بولے۔
صاعقہ روئے گئی۔
"تم نے اتنے دکھ اکیلے ہی جھیل لیے۔ مجھے پہلے سب کچھ کیوں نہ بتلایا!" بڑی سوگوار

آواز میں ریحان کہہ رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ صاعقہ کی دبی دبی سسکیاں اسی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔ ریحان بڑی ہی سنجیدگی سے کچھ سوچ رہے تھے۔

"صاعقہ آنسو پونچھ ڈالو۔۔ ہمیں حالات کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا ہے۔ یوں رو رو کر زندگی اجیرن نہ بناؤ۔"

ریحان نے تسلی دی۔ بہلایا۔ حسین وعدوں کی یاد دہانی کرائی:

"میں جانتا ہوں۔ طوفان اٹھے گا۔ لیکن اس سے ٹکرانے کا میں پورا عزم کر چکا ہوں۔ حالات کو میری مرضی کے مطابق ڈھلنا ہو گا۔ میں اس طوفان کا ہر لمحہ انتظار کرتا ہوں۔ یاد رہے اس دن میں تمہیں سینما کی بجائے گھاٹی کی طرف لے گیا تھا۔ میں نے یہ قدم دانستہ اٹھایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہمارے پیار کا راز مشتہر ہو جائے۔ بات بڑوں تک پہنچ جائے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ افتاد اکیلے تم پر ہی پڑے گی۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں کل ہی دادی حضور سے خود ساری بات کہہ دوں گا۔"

"ریحان۔۔" صاعقہ کانپ گئی۔ "نہیں۔۔ ان سے کچھ نہ کہیئے گا۔"

"اور تاخیر برداشت نہیں کی جا سکتی۔"

ریحان کے لہجے میں اتنی گونج تھی کہ صاعقہ مرعوب ہو گئی۔

"ہمارا قصور کیا ہے صاعقہ۔۔ کہ یوں سسک سسک کر مر جائیں۔ پیار کرنا جرم تو نہیں۔ خاندان حائل کیوں ہوتا ہے۔۔ ہم اپنی زندگی کی راہیں خود استوار کریں گے۔ کسی کا ناجائز دخل برداشت نہیں کیا جا سکتا۔"

ریحان اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

"مایوسی گناہ ہے صاعقی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اس طرح مایوس نہیں ہو گی۔ اگر پھر بھی تم نے افسردگی و مایوسی کو اپنے اوپر مسلط کیا تو میں سمجھوں کا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔۔"

صاعقہ نے ریحان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس لمس نے ریحان پر آشکار کر دیا کہ اسے ان پر کتنا اعتماد تھا۔

ریحان اسے طوفانوں سے لڑنے اور حوادث سے ٹکرانے پر آمادہ کرتے رہے۔

صاعقہ سہمی ہوئی ان کی باتیں سنتی رہی۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ پچھلی تاریخوں کا چاند فلک کے کسی کنارے پر نمودار ہو رہا تھا۔ دونوں وہاں سے اٹھے۔

شانہ بشانہ چلتے دونوں برآمدے کی طرف آئے۔ دور پورچ میں جلنے والی برقی روشنی کا عکس اندھیروں کو چاٹ رہا تھا۔

ریحان نے ہلکی ہلکی روشنی میں صاعقہ کا بھیگا ہوا چہرہ دیکھا "بزدل!" وہ مسکرائے۔ صاعقہ نے سر جھکا لیا۔

ریحان نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا "آج تمہارے وہم و تردد کی آخری رات ہے۔ صبح میں دادی حضور سے۔۔!"

"صبح نہیں ریحان"

"کیوں؟"

"پرسوں آپ کی سالگرہ ہے نا"

"تو کیا ہوا؟"

"یہ تقریب تو بخیریت گزر جانے دیں۔"

—o—

۵۰

دادی کا چہیتا اور منظورِ نظر ہونے کی وجہ سے ریحان کی سالگرہ بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھی۔ جشن کا سارا انتظام دادی اپنی نگرانی میں کرواتیں۔ یہ دن عید سے بھی زیادہ خوشی و مسرت سے منایا جاتا تھا۔

اس دن ناشتے کے بعد پورا کنبہ دادی حسن بانو کے کمرے میں جمع ہوتا۔ یہ اک رسم سی بن گئی تھی۔ دادی حسن بانو نے ایک سونے کی زنجیر بنوا رکھی تھی۔ ہر سالگرہ کے دن وہ اس زنجیر میں سفید قیمتی موتی پرو دیا کرتیں۔ پھر وہ زنجیر واپس اسی مخملیں صندوقچی میں رکھ دی جاتی۔

اس کے بعد وہ سب سے پہلے اپنا تحفہ ریحان کو دیتیں۔ ریحان مسند پر ان کے قریب بیٹھے ہوتے۔ سارا کنبہ ان پر ٹوٹا پڑتا۔ تحفہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ تعریفیں ہوتیں۔ مبارک سلامت کا شور اٹھتا۔ چھینا جھپٹی ہوتی۔ اس دن دادی کے رعب و دبدبے میں خاصی لچک آجاتی۔ شور و غل اور چھینا جھپٹی جسے عام حالات میں وہ کبھی گوارا نہ کر سکتیں، نظر انداز کر دیتیں۔

پھر سارا دن خوشی و مسرت کے بھرپور جذبات سے گزارا جاتا۔ رات جشن میں رشتہ دار، دوست احباب شرکت کرتے اور رنگ و بو کی یہ محفل آدھی رات تک جاری رہتی۔

زنجیر میں موتی پرونا حسن بانو کی رسم تھی۔ جسے ہر سال بڑے اہتمام سے پورا کرتیں۔ موتیوں کی یہ مالا وہ ریحان کی منگنی پر اس کی دلہن کو دینے والی تھیں۔ کتنی یادگار چیز تھی یہ۔

صاعقہ بچپن میں اس رسم کو بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ گو اسے بہت کم اس موقع پر قریب پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ منحوس جو تھی وہ۔۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس موقع پر وہاں پہنچ جاتی۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں چھپ چھپ کر یہ رسم دیکھا کرتی۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور نظروں کی بیزاری کو سمجھنا شروع کیا تھا، وہ ذات کترا جایا کرتی تھی۔ ہاں انجم پھوپھی اکثر اسے بلا کر لے جاتیں۔ صاعقہ ان کے مجبور کرنے پر کبھی چلی جاتی تو مسند کے قریب جانے کی بجائے پرے ہٹ کر یگانہ سی کھڑی رہتی۔

معمول کے بعد آج بھی ناشتے کے بعد سب زرق برق لباسوں میں دادی حسن بانو کی نشست گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

مسند پر دادی سفید لباس میں اک تمکنت کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ان کے بوڑھے چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ دونوں بیٹے اطہر اور فو دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سعدیہ اور فوزیہ، حسن آرا اور انجم آرا بھی مسند پر بیٹھی تھیں۔

ریحان دادی کے دائیں ہاتھ بیٹھے تھے۔ وہ کسی افسانوی شہزادے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ کتنی وجاہت تھی ان میں۔۔ سعدیہ تو بیٹے کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ رہی تھی۔ مبادا نظر لگ جائے۔ یہی حال دادی کا تھا۔ دل ہی دل میں بلائیں لے رہی تھیں۔

آج ریحان نے صاعقہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس رسم کے موقع پر ضرور دادی کے کمرے میں آئے گی۔ اس نے بہ منت ریحان سے معذرت چاہی تھی لیکن وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہ تھے۔ صاعقہ کو وعدہ کرنا پڑا تھا۔

اور

اسی وعدے کو نباہنے کے لیے وہ دھڑکتے دل اور سن ہوتے ہاتھ پاؤں لیے دادی کی نشست گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی جانے کہاں سے فوزیہ آن دھمکی "کدھر منہ اٹھائے چلی جا رہی ہو۔۔ معلوم نہیں ہے سالگرہ کی رسم ہونے والی ہے۔ یہ منحوس وجود کہیں دور دفان کرو۔۔ کسی زعم میں نہ رہنا۔"

اور

صاعقہ کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اتنی ذلیل۔۔ اف۔۔ وہ ریحان سے کیا ہوا وعدہ بھول کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

ریحان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ مسند کے گرد کافی مجمع سا جمع ہو گیا تھا۔ چھوٹے بڑے خوش تھے چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔

"سمیرا نہیں آئی؟" حسن آرا نے فوزیہ سے پوچھا۔

فوزیہ نے گرد و پیش دیکھا۔ سمیرا نہیں آئی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازے میں کھڑی کنیز کو بلا کر بھیجا۔۔ لیکن کنیز واپس آگئی۔ سمیرا نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا تھا۔

فوزیہ کے کلیجے میں نشتر سا چبھ گیا۔ سمیرا کے نہ آنے کی وجہ اسے معلوم ہی تھی۔

ریحان کا انتظار شدت اختیار کر گیا۔ تقریباً سبھی لوگ آ پہنچے تھے۔ وہ بے قرار سے نظر آنے لگے۔

دادی حسن بانو نے مخملیں صندوقچی اپنے سامنے رکھی۔

"ٹھہریئے دادی حضور!" ریحان اٹھتے ہوئے بولے۔

"کیوں؟"

"میں ابھی آیا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بس ابھی آیا۔" کہتے ہوئے وہ بمشکل جگہ بنا کر نکل گئے۔

صاعقہ کی عہد شکنی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

وہ سیدھے اس کے کمرے میں پہنچے۔

وہ کھڑکی میں کھڑی باہر خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پلکیں اب تک بھیگی ہوئی تھیں۔ رخساروں کی سرخی بھی نم آلود تھی۔

ریحان نے اسے دیکھا۔ صاعقہ آہٹ پر پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔

ان کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ اس کے سامنے آ گئے۔

چپ چاپ اسے دیکھتے رہ گئے۔

صاعقہ نے سر جھکا لیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ امنڈنے والے آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کرنے لگی۔

"آج بھی رو رہی ہو۔۔" بڑی افسردہ سی آواز میں ریحان نے کہا۔

اور

صاعقہ کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور روتے ہوئے بولی۔ "میری تقدیر میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔۔ مجھے کچھ نہیں ملنا۔۔ یہ آنسو۔۔ ہی ملیں گے۔"

"صاعقی" ریحان نے اس کے ہاتھ زبردستی چہرے سے ہٹا دیئے سنجیدگی سے بولے:

"پھر کچھ ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں نہیں جاؤں گی وہاں۔۔"

"کیوں نہیں جاؤ گی۔ کسی نے کچھ کہا؟"

صاعقہ روتی رہی۔

"بتاتی کیوں نہیں۔ کس نے کچھ کہا۔۔؟" ریحان غصے سے جھلا کر بولے۔

صاعقہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ریحان کے چہرے کے تناؤ اور آنکھوں کی خشمناک سرخی دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس موقع پر وہ کسی طوفان کو اٹھنے نہ دینا چاہتی تھی۔

"کس نے کہا کچھ؟" ریحان نے سختی سے پوچھا۔

"کسی نے بھی نہیں" وہ دانستہ جھوٹ بول گئی۔

"پھر ہوا کیا ہے۔۔؟"

"کچھ بھی نہیں"

"رو کیوں رہی ہو؟"

"دل بھر آیا تھا۔ اب نہیں روؤں گی۔" وہ مسکرا دی۔

"چلو پھر!"

"نہیں۔۔ نہیں ریحان آپ جائیے۔ چھوٹی سی بات کے لیے ضد نہ کیجئے۔"

ریحان کے بار بار اصرار کرنے پر وہ لجاجت سے انکار کرتی رہی۔

"نہ جانے کی وجہ کیا ہے۔ صرف اتنا بتا دو۔"

"یہ کوئی راز نہیں۔"

"پھر بھی۔"

"آپ جانتے ہیں ریحان۔۔ ایسے موقعوں پر میری شمولیت منحوس سمجھی جاتی

ہے۔" بالآخر وہ کہہ اٹھی۔

"صاعقہ!" ریحان غصے سے کانپنے چیخے۔

صاعقہ بمشکل مسکرائی۔

"یہ احساس تمہارے ذہن سے کب مٹے گا صاعقہ۔۔ میری انتھک کوششیں بھی ناکام رہیں۔" جانے وہ کیا کیا کہتے رہے لیکن صاعقہ ان کے ساتھ جانے کی حامی نہ بھر سکی۔

فوزیہ کا خوفناک لہجہ کانوں میں زہر گھول رہا تھا۔ اگر وہ اب وہاں چلی گئی تو کیا عجب سب کے سامنے وہ اس کی تذلیل کرے۔ بھرے مجمعے سے دھکے دے کر نکال دے۔ وہ اپنی تحقیر سے ڈرتی تھی۔

"صرف اتنا بتا دو تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

صاعقہ نے صبح کا سارا واقعہ انہیں کہہ سنایا۔ احساس کے نازک آبگینوں پر طنز کا پتھراؤ۔ ریحان خاصے مشتعل نظر آنے لگے۔

ریحان کی حالت قابل دید تھی۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ کمرے میں بے تابانہ ٹہلتے ہوئے وہ فوزیہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اس وقت وہ ان کے سامنے ہوتی تو شاید وہ کوئی گستاخانہ حرکت کر بیٹھتے۔

صاعقہ کھڑکی کی طرف پھر مڑ گئی۔ خلاؤں میں گھورتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوب گئی۔

"صاعقی!" ریحان کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"آؤ!" وہ سنگین آواز میں بولے۔

"نہیں" وہ گھبرا گئی۔

ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "آؤ دیر ہو رہی ہے۔"

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ کتنی سنگین سی سنجیدگی ان پر مسلط تھی۔ وہ ڈر گئی۔ کوئی ہنگامہ پھوٹ پڑے گا۔ اس کے دل سے صدا اٹھی۔

اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ پرے ہٹ گئی۔

"تم نہیں جاؤ گی؟" سنگین سنجیدگی میں افسردگی کا عنصر بھی تھا۔

"بھری محفل میں ذلیل ہونے کی مجھ میں ہمت نہیں ریحان" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے

پکڑ کر بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے بھی ایسا ہو گا؟"

"زہریلی نظریں تو ہوں گی۔"

"تم کسی کی پروانہ کرو۔"

"نہیں ریحان۔۔"

"میری خاطر سب کچھ گوارا کر لینا۔"

"ضد نہ کیجئے ریحان۔۔ رسم ہو جانے دیں۔ پھر۔۔ پھر۔۔"

"رسم تمہارے بغیر کیسے ہو گی۔"

"جیسے ہمیشہ ہوتی ہے۔"

"ہمیشہ اور اب میں کوئی فرق نہیں؟"

"آپ کے سوا شاید کسی کے لیے بھی نہیں۔"

"تمہیں میری خوشی دیکھنا ہے صاعقہ۔۔"

گھبرا کر صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ لیکن ڈر و خوف اس پر اس طرح مسلط تھا کہ وہ حامی نہ بھر سکی۔

ریحان چند لمحے منتظر رہے۔ لیکن صاعقہ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ ریحان کی کشادہ جبیں پر سلوٹیں سی آگئیں۔ بے مہری کا گلہ نگاہوں سے چھلکا۔

بغیر کچھ کہے وہ پلٹے۔

صاعقہ انہیں یوں جاتے دیکھ کر بے قرار ہو گئی، دوڑ کر ان کے سامنے آگئی، بے ساختہ ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"آپ خفا ہو گئے؟"

"نہیں نہ جانتا تھا کہ میری خوشی کی خاطر تم اتنی سی بات گوارا نہ کر سکو گی۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

صاعقہ تڑپ اٹھی۔ ریحان کو اداس دیکھنا اس کے بس میں نہ رہا۔ اپنی ذلت کا خوف اور رسوائی کا ڈر سب کچھ بھول گئی۔

ان کی طرف دیکھا۔

اور پھر سر جھکا کر بولی۔ "چلیے میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں، میں کسی سے نہیں

ڈروں گی۔ فوزیہ چچی بھرے مجمعے میں مجھے دھکے دے کر بھی ذلیل کریں تو میں آپ کی خاطر گوارا کر لوں گی۔"

"صاعقی" ریحان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

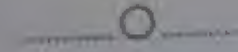
اور

ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

دھوپ چھاؤں کا حسین امتزاج اس کے چہرے کو کتنا پرکشش بنا رہا تھا۔

ریحان قدرے جھکے اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کی "اب آئی ہو راہِ راست پر۔"

صاعقہ آنکھیں بند کیے مسکرا دی۔



www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

۵۱

ریحان کی خوشنودی کی خاطر صاعقہ انکے ساتھ چل تو دی، خوف اب تک اس کے حواس پر مسلّط تھا۔ دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ نظریں بہک رہی تھیں۔ کتنے بڑے خطرے سے ٹکرانے جا رہی تھی وہ۔۔ آج وہ طوفان پھوٹ پڑے گا جس کی ہلاکت آفرینی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔

لیکن

اس کے باوجود ریحان کے ساتھ جا رہی تھی۔ دادی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی معمول کسی عامل سے لگا بندھا چلا جا رہا ہو۔

کمرے میں خاصہ شور تھا۔ حسن بانو کی مسند گھر کے افراد سے گھری ہوئی تھی۔ کوئی بیٹھا تھا۔ کوئی کھڑا تھا۔ کوئی کسی کے سہارے جھکا تھا۔ شانے سے شانہ ٹکرا رہا تھا۔ ہر کوئی مسند کے قریب تر ہونے کی کوشش میں تھا۔

خوب خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ دادی حسن بانو آج دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔

صاعقہ کمرے میں داخل ہوتے ہی سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ریحان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

وہ تعمیل حکم کے لیے آگے بڑھی۔

"جگہ دو اسد!" ریحان نے سٹول پر بیٹھے ہوئے اسد کی کمر میں ٹھوکا دیا۔ اسد نے گردن موڑ کر دیکھا۔

ریحان نے صاعقہ کی طرف اشارہ کر کے جگہ خالی کرنے کو کہا۔

اسد ریحان کی جسارت پر گنگ سے رہ گئے۔

"کیا منہ دیکھ رہے ہو۔ جگہ دو۔۔ کچھ آداب بھی سیکھو!" ریحان مسکرا کر بولے۔ اسد

اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ بیٹھو صاعقہ" انہوں نے سٹول قدرے آگے کو دھکیلا۔

صاعقہ سحرزدہ سی بیٹھ گئی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح پتھرائی پتھرائی سی تھی۔

ریحان آگے بڑھ کر مسند پر دادی کے دائیں ہاتھ جا بیٹھے۔

صاعقہ کی طرف دیکھ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا دیئے۔ لیکن صاعقہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں۔ مسکراہٹ کا کیا اثر لیتی۔ اس کا تو رسوائی کے خوف سے دم نکلا جا رہا تھا۔ فوزیہ کی طرف صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اُف ان نظروں میں جہنمی شعلوں کی لپک تھی۔ کس طرح بیقراری سے اس نے پہلو بدلا تھا۔ مجسم برق نظر آ رہی تھی۔ جو کسی کا آشیانہ بھسم کرنے کے لیے مچل رہی ہو۔

اُس کے علاوہ کسی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ نظروں کے تیر وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دم ہوا ہو رہا تھا۔ چہرہ فق تھا اور ہونٹ تک سفید پڑ چکے تھے۔

دادی حسن بانو کی اللہ جانے اس پر نظر ہی نہ پڑی تھی یا مزاج میں ہی آج اتنی لچک آ گئی تھی کہ اس کی موجودگی کو گوارا کر لیا تھا۔ فخر چچا اسے دیکھ کر خوش ضرور ہوئے۔ جانے انہوں نے کیا کہا۔ صاعقہ کے کانوں میں صرف سائیں سائیں کا شور تھا۔ ان کی بات سمجھ نہ سکی۔ نہ ہی کچھ جواب دیا۔

ریحان دادی سے چونچلے کر رہے تھے۔ سب کی توجہ انہی کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ "اب نکالیے بھی زنجیر" ریحان نے مخملیں صندوقچی دادی کے سامنے رکھ دی۔

دادی نے بسم اللہ پڑھ کر صندوقچی کو کھولا۔ زیر لب دعائیہ کلمے کہتے ہوئے سرخ مخملی ڈبی میں پڑی ہوئی زنجیر نکالی۔

"واہ واہ سبحان اللہ" کا شور بلند ہوا۔ سفید موتی طلائی زنجیر میں بڑی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔

"کتنے ہوئے ہیں؟" ریحان نے مالا ہاتھ میں لے لی۔

"چھبیس ہوں گے" کسی نے کہا۔

"ہاں۔۔ آج ماشاءاللہ تم ستائیس سال کے ہو گئے۔ یہ ستائیسواں موتی ہے۔"

دادی نے پھر اللہ کا نام لے کر ڈبی سے سفید موتی اٹھایا۔ دعائیں پڑھتے ہوئے زنجیر میں پرو دیا۔

مبارک سلامت کا شور سا اٹھا۔ دادی اماں، پھوپھیوں، چچی سب نے ریحان کے بالوں پر شفقت آمیز بوسے دیتے ہوئے مبارک کہی۔

باپ نے اٹھتے ہوئے انکے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے درازئی عمر کی دعا دی۔ ان کی تقلید میں فخر چچا بھی اٹھے۔ ریحان تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فخر چچا نے بڑی محبت سے انہیں لپٹا لیا۔

دعائیں دی جا رہی تھیں۔ کنیز چاندی کا تھال لے آئی۔ حسن بانو نے کئی طلائی سکے اس میں ڈال دیئے۔ ریحان کا صدقہ اتارا گیا۔ حاضرین نے حسب استطاعت اس میں نقدی ڈالی۔ کنیز جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے تھال واپس لے گئی۔

صاعقہ کے کانوں سے شور ٹکرا ضرور رہا تھا۔ لیکن سمجھنے کی قوت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اظہر اور فخر دونوں بھائی اس رسم کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔ نئی پود ان کے سامنے ذرا جھجک محسوس کرتی تھی۔ آج اس مبارک موقعہ پر انہیں کچھ تو آزادی ملنا چاہیئے تھی۔

ان کے جاتے ہی محفل میں کچھ حرکت سی آ گئی۔ قہقہے خوش گوار ہو گئے۔ باتوں میں بے تکلفی سی آ گئی۔

"یہ موتی کب پروئے جائیں گے دادی حضور" ریحان نے دانستہ شوخی سے پوچھا حالانکہ جس مقصد کے لیے یہ مالا بن رہی تھی، وہ جانتے تھے۔ ہر سالگرہ پر ہی تو دادی اعلان کرتی تھیں۔

"یہ ستائیسواں موتی ہے۔" دادی نے بڑے فخر سے کہا۔

"بہت ہو گئے اب" ریحان جلدی سے بولے۔

"اتنے بے صبر نہ بنو" پھوپھی حسن آرا نے ان کے سر پر پیار سے چپت لگائی۔

"کیوں دادی حضور۔۔ بہت لمبی ہو گئی مالا۔ اب اسے بند کر دیں۔"

"خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ یہ آخری موتی ہو گا۔"

"پھر کیا کریں گی اس مالا کو؟"

"تمہاری منگنی پر تمہاری دلہن کو دوں گی۔"

"واہ وا۔۔"

"یہ آخری موتی ہے نا" اسد نے پوچھا۔

"انشاء اللہ" حسن بانو نے جواب دیا۔

"اللہ مبارک کرے۔"

"آمین"

کافی دیر یونہی باتیں ہوتی رہیں۔

"دادی حضور!"

"ہوں"

"اجازت ہو تو اس زنجیر کو آج گرہ لگا دوں۔۔"

"کیوں؟" دادی نے پوچھا۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے؟" انجم پھوپھی ہنس کر بولیں۔

"جو کام ختم ہو جائے وہی اچھا۔ آپ کا کیا ہے، ستائیس کی جگہ اٹھائیس موتی پسند کریں اور اپنا حساب کتاب اگلے سال میں جا پڑے۔"

"ارے ہے۔۔ پگلے۔۔ انشاء اللہ اسی سال یہ کام ہو جائیگا۔"

"اسی سال" فرخ نے منہ بنایا "سال بہت ہے نانی حضور۔"

"کیا پاگل ہیں یہ لڑکے۔۔ سال سے مراد بارہ مہینے تو نہیں۔"

"پھر؟"

"یہی دو تین ماہ بعد۔۔ عید کے چاند انشاء اللہ منگنی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔"

"واہ۔۔ وا۔۔ واہ۔۔ وا۔۔۔۔" ریحان کے ہم جلیسوں نے نعرے لگائے۔

"تو پھر لائیے میں زنجیر کو آج ہی گرہ لگا دوں۔"

"ابھی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں دادی حضور۔۔ فوری ضرورت ہے۔"

سب ہنس دیئے۔ ریحان نے کھینچا تانی کی۔ ماں نے ڈانٹا بھی لیکن دادی نے ٹوک دیا اور ہنستے ہوئے زنجیر ریحان کے ہاتھ میں دے دی۔

"لو اپنی خوشی پوری کر لو۔"

ریحان نے سرے کا کنڈا ذرا سا کھینچا اور دوسرے سرے میں اٹکا کر دبا دیا۔

"یہ لیجئے مالا مکمل ہو گئی۔" انہوں نے ہاتھ قدرے اوپر اٹھایا۔

مبارک۔۔ مبارک کا طوفان تھا۔ تالیوں کی گونج تھی۔ خوشی و مسرت کا ہنگامہ تھا۔

"لاؤ اب" دادی نے مالا ریحان کے ہاتھ سے لے کر صندوقچی میں رکھنا چاہی۔

"نہیں"

"کیوں؟"

"یہ آپ نے میری دلہن کے لیے بنائی ہے نا؟"

"ہاں تو؟"

"میں اپنی دلہن کو دے کیوں نہ دوں۔"

"ریحان" سعدیہ نے ڈانٹا۔

"کیوں دادی حضور۔۔" ریحان مسکرا کر دادی کی طرف دیکھ کر بولے "اس کار خیر سے ابھی کیوں نہ فارغ ہو جائیں۔"

"اتنے بیتاب کیوں ہو رہے ہو" پھوپھی حسن آراء نے چھیڑا۔

"پگلا ہے نا" دادی پیار سے بولی۔ "اتنا شاندار جشن مناؤں گی اپنے بیٹے کی منگنی کا کہ کسی نہ دیکھا نہ سنا ہو گا۔ اس دن یہ مالا دوں گی۔۔ تمہاری دلہن کو۔۔ تجھے۔"

"نہیں دادی حضور۔۔" ریحان ضد کر بیٹھے "جشن جتنا بھی چاہے شاندار منائیے لیکن یہ مالا تو میں ابھی پہناؤں گا اپنی دلہن کو۔۔"

ریحان نے مالا ہاتھوں میں تھام لی۔ سب ان کی ضد پر ہنس رہے تھے۔

فوزیہ البتہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔ کچھ یہی حال سعدیہ کا تھا۔

اور

صاعقہ کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی۔ دل رک جانے کی حد تک دھڑک اٹھا تھا۔

"پہناؤ گے کیسے، دلہن تو یہاں ہے ہی نہیں" پھوپھی حسن بانو نے صبا کی عدم موجودگی کا اشارہ کیا۔

"ہے کیوں نہیں" ریحان نے ترچھی نظروں سے صاعقہ کو دیکھا۔

صاعقہ نے اک لمحہ کو ان کی طرف دیکھا۔ انکی آنکھوں سے چھلکتا ہوا عزم دیکھ کر اس کے اپنے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ماتھے پر پسینے کی نمی تھی اور بس آنکھیں۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔

"اجازت ہے دادی حضور؟" ریحان نے پھر پوچھا۔

"لیکن دلہن کہاں ہے" حسن آراء نے پھر شوخی سے پوچھا۔

"یہ رہی۔۔" وہ اٹھے اور بڑے ڈرامائی انداز میں بڑھ کر مالا صاعقہ کے گلے میں ڈال دی۔

صاعقہ اٹھ کر بھاگ جانے کی کوشش میں تھی۔ لیکن ریحان نے پہل کی۔ مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔

تعجب خیز سی سنسناہٹ سارے کمرے میں پھیل گئی۔

اور

اس کے بعد

اک جامد سناٹا۔

جو حقیقتِ حال سے باخبر تھے۔ وہ بھی ریحان کی جسارت پر گنگ رہ گئے اور جو بے خبر تھے۔ اسے ریحان کا مذاق سمجھ کر چپ ہو گئے۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے ریحان" چند لمحوں کا جامد سناٹا دادی کی آواز کی گونج سے ٹوٹ گیا۔

"جی دادی حضور۔"

"مذاق حد سے بڑھ جائے تو بیہودگی ہوتی ہے۔"

"لیکن یہ مذاق کہاں ہے دادی حضور۔۔۔" ریحان نے اس سنجیدگی سے کہا کہ دادی حسن بانو پلکیں جھپکا جھپکا کر انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

"ریحان۔۔" اسد نے جلدی سے انہیں پکارا۔

"ہوں" وہ مڑے اور پھر تیزی سے لپک کر آگے آئے۔ صاعقہ سٹول سے گری جا رہی تھی۔ اسد نے دونوں ہاتھوں سے اسے سنبھالا دے رکھا تھا۔

"بے ہوش ہو گئیں۔" اسد نے آہستگی سے کہا۔

"صاعقی" ریحان نے اس پر جھکتے ہوئے پکارا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ برف کے تودے کی طرح ٹھنڈی تھی۔

"صاعقی، صاعقی" ریحان نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

"ہوش میں نہیں ہیں۔" ثمینہ اس پر جھکتے ہوئے بولی۔

"یہیں لٹا دو۔" فرید قریب آ کر بولے۔

"گری جا رہی ہے۔ سنبھالو تو اسے" انجم پھوپھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ریحان کے مذاق پر انہیں غصہ بھی آ رہا تھا۔ ان لوگوں کی بے حسی پر دل جل اٹھا تھا۔

لیکن

جب ریحان نے بڑھ کر صاعقہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور کسی کی پروا کیے بغیر کمرے سے نکل گئے تو سب کے ساتھ انجم پھوپھی بھی حیرت زدہ سی ہو گئیں۔



۵۲

صاعقہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ریحان دادی کی نشست گاہ سے نکل تو گئے لیکن پیچھے اک ہنگامہ چھوڑ گئے۔ ان کے مالا ڈالنے کی جسارت ہی کیا کم تھی۔ اس پر بے ہوش صاعقہ کو یوں اٹھا کر کسی کی پروا کیے بغیر چل دینا جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا۔

دادی کے لیے یہ انکشاف نیا بھی تھا اور حیران کن بھی۔۔ سب کچھ اتنی جلدی اور غیر متوقع طور پر ہوگیا کہ وہ بوکھلا سی گئیں۔

"یہ قصہ کیا ہے؟" بڑی دیر چپ رہنے کے بعد حسن بانو نے جیسے سب سے سوال کیا۔

"ماں کا مقام بیٹی نہ لے گی۔" فوزیہ غصے سے بل کھا رہی تھی۔ آخر ابل پڑی۔

دادی نے پلٹ کر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا شعلہ بنی تھی۔

معاملہ سنجیدہ تھا۔ دادی نے سب بچوں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ سب آگے پیچھے سر جھکائے کمرے سے نکل گئے۔ دادی کے حضور کسی کو کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس واقعے سے سبھی متاثر نظر آتے تھے۔

کمرے میں حسن بانو اپنی دونوں بیٹیوں اور بہوؤں سمیت رہ گئیں۔ فوزیہ کی حالت قابل دید تھی۔ سعدیہ بھی پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

حسن آراء اور انجم آراء ماں کی طرح بے خبر تھیں۔ وہ کچھ حیرت زدہ سی دونوں بہنوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ قصہ کیا ہے آخر۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔" حسن بانو بولیں۔

"سمجھ میں نہ آنے والی بات ہی کونسی رہ گئی ہے۔" فوزیہ تلخ سی آواز میں بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" حسن آراء متانت سے بولیں "لیکن۔۔ سمجھ میں نہیں آرہا یہ بات ہوئی کیسے۔۔؟ ریحان تو اس کے سائے سے دور بھاگتا تھا۔"

"اسے ستانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے تو کبھی سیدھے منہ اس سے بات نہ کی تھی۔" سعدیہ سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

"اب تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ میں نے کچھ جھوٹ تو نہ کہا تھا۔" فوزیہ سعدیہ سے مخاطب تھی۔

"اسی بات کی تو حیرانگی ہے۔" سعدیہ نے جواب دیا۔

"بڑی انہونی بات ہے۔" حسن آراء کہہ رہی تھیں۔

"جو بھی سمجھو حقیقت تو یہ ہے کہ انہونی ہوگئی۔" فوزیہ غصے سے بولی۔

کافی دیر اسی بات پر لے دے ہوتی رہی۔ پھر حسن بانو کے استفسار پر فوزیہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

"بات یہاں تک بڑھ چکی ہے۔۔" حسن بانو کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"تو اور کیا۔۔ بات یہاں تک بڑھی نہ ہوتی تو ریحان آج آپ کے سامنے اتنی جرأت کیوں کر کرتا۔" فوزیہ نے ان کے غصے کو جانچ کر کہا۔

سعدیہ نے ندامت سے سر جھکالیا۔ انجم آرا خاموشی سے سب کچھ سنتی اور دیکھتی رہیں۔ باتیں ہوتی رہیں۔۔ ریحان سے زیادہ صاعقہ کو کوسا گیا۔ جتنی بددعائیں دی جاسکتی تھیں، دی گئیں۔ اس کی ماں کے قصے کو از سرِ نو عریاں کیا گیا۔

یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی دلوں کی آگ سرد نہ ہوئی۔

"مجھے تو اپنی بچی کا خیال آتا ہے۔" فوزیہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی "اتنا سا منہ نکل آیا ہے اس کا۔ خواہ مخواہ نام لے لیا تھا ریحان کے ساتھ۔ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔۔ خدا جانے اس کا کیا ہوگا۔۔"

"فوزیہ تم نے ساری بات ہمیں پہلے کیوں نہ بتائی"۔ حسن بانو فوزیہ کے رونے سے بڑی متاثر نظر آرہی تھیں۔

"کیا بتاتی۔۔ تقدیر میں دکھ ہوں تو انہیں کون بدل سکتا ہے۔ بیس برس بعد پھر ایسا صدمہ دیکھنا پڑا۔۔" ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

سب سر جھکائے سوچ میں ڈوبے تھے۔

حسن بانو نے سر اٹھایا۔۔ بھانجی کی ہچکیاں سینے میں تلاطم بپا کر رہی تھیں۔ اس کا دکھ انہیں اپنا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

"نہ رو فوزیہ۔۔ میرے ہوتے ہوئے اتنی مایوس کیوں ہو۔ میں ریحان کی تقدیر کا

فیصلہ کر چکی ہوں اور دیکھوں گی کہ یہ فیصلہ بدلنے کی کس میں مجال ہے۔ تم بچی کو تسلی دو۔ نا کہ الٹا رو رو کر اسے جیتے جی مار ڈالو گی۔"

"لیکن امی حضور" انجم آراء پہلی دفعہ بولیں۔ "تقدیروں کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں۔"

"اے ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" حسن بانو نے انجم کو ڈانٹ دیا۔

"حالات کا پوری طرح جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کریں۔"

"آپ تو خوش ہیں نا؟ شروع ہی سے اس کی حمایت کرتی آئی ہیں۔" فوزیہ نے طنزیہ کہا۔

"وہ بھی اپنا ہی خون ہے۔ حمایت کرنے میں بُرائی کیسی؟"

"آپ تو یہی چاہیں گی کہ وہ منحوس میری بچی کے سینے پر مونگ دلتی رہے۔"

"میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہو چکا۔ اسے بدلا نہیں جا سکتا" حسن بانو نے عزم سے کہا۔

"وہ ڈائن ہمارے ریحان ہی کے لیے تو رہ گئی ہے۔" حسن آرا بولی۔ "آپا آپ بھی تو غضب کرتی ہیں۔ کہاں ریحان کہاں وہ منحوس بلا۔ پیدا ہوتے ہی ابا حضور کو کھا گئی۔ خاندان پر آفتیں ہی ٹوٹ پڑیں۔"

"میں تو اس کا سایہ نہ پڑنے دوں گی اپنے بیٹے پر" سعدیہ غرائی۔

"بیٹا تو لٹو ہے اس پر۔" فوزیہ تلخی سے بولی "کس طرح ہاتھوں پر اٹھا کر لے گیا۔ دادی سے بھی شرم نہ آئی۔ بڑوں کا کچھ لحاظ بھی ہونا چاہیئے۔"

"سب ٹھیک کر لوں گی۔ سب ٹھیک کر لوں گی۔" حسن بانو گردن ہلا کر کہنے لگیں۔ "میرے لاڈ پیار سے اس نے بے جا فائدہ اٹھایا ہے لیکن نا سمجھ ہے۔ میری سختی سے پالا نہیں پڑا۔"

"سختی نے ہمیشہ کام بگاڑا ہے" انجم آہستگی سے بولیں۔

"تمہارا کیا مطلب ہے انجم۔ اسے من مانی کرنے دوں؟"

"پیار سے سمجھا دیکھئے۔ مان جائے تو اچھا ورنہ سختی نہ کیجیئے۔"

"اور اس منحوس بلا کو ہمیشہ کے لیے اس کے پلے باندھ دیں؟" حسن آرا غرائی۔

"یہی تو مطلب ہے ان کا۔" فوزیہ پھر رو دی۔

"میرے مطلب سے کیا ہوتا ہے فوزیہ" انجم کو بھی غصہ آگیا۔ "دیکھنا تو یہی ہے لڑکے کی مرضی ہے۔ جبر کسی صورت میں سود مند نہ ہوگا۔"

"میری بیٹی عمر بھر بلکتی رہے۔" فوزیہ روتے ہوئے بولی۔

"یہ ضروری نہیں۔ ابھی کونسا منگنی کا اعلان ہوگیا ہے۔" انجم نے کہنے کی جرأت کر ہی لی۔ "صلاح مشورہ ہی ہو رہا ہے نا۔ لڑکی کو اتنا اثر نہیں لینا چاہیئے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے انجم!" سعدیہ نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

"میری بچی کو چپ ہی لگ گئی ہے۔ اور آپ کے لیے یہ اثر لینے والی بات ہی نہیں۔" فوزیہ بولی۔

"میں ابھی زندہ ہوں فوزیہ۔" حسن بانو نے سنگین آواز میں کہا۔

وہ سارا دن اسی قصے کو دہراتے ہوئے گزر گیا۔ رات جشن خاصہ بدمزہ رہا۔ اہل خانہ ہی کے مزاج درست نہیں تھے۔ مہمانوں کی آمد بھلا کہاں تک ماحول کو خوش گوار بناتی۔ جوں توں کر کے وہ دن گزرا۔ فوزیہ نے ہر لمحہ ساس کے اشتعال کو ہوا دیا۔ آنسوؤں کے چھینٹے دے کر آگ پر تیل کا کام کیا۔

حسن بانو کی آن، وقار اور ساکھ پھنکارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح انہوں نے ریحان کو اپنی نشست گاہ میں بلا بھیجا۔

ریحان آئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے، نہ ملامت کے۔ طوفان سے ٹکرانے کو تیار نظر آرہے تھے۔

حسن بانو کی مسند کے قریب آکر وہ رک گئے۔ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی حسن بانو کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ سر تاپا انہیں گھورا لیکن بولنے میں پہل نہ کی۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا دادی حضور۔"

"ہوں"

"فرمائیے!"

"یہاں بیٹھو۔"

ریحان مسند کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ ریحان اس خاموشی سے الجھ رہے تھے۔ دو ایک بار حسن بانو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا۔

"ریحان" سنجیدہ اور باوقار آواز میں دادی نے مخاطب کیا۔
"جی" سعادت مندی سے جواب دیا گیا۔
کہنے والوں کے لہجے کا تناؤ ظاہر کر رہا تھا کہ جھکنے والے دونوں ہی نہیں ہیں۔
"میں نے تمہیں اک خاص بات کے لیے بلایا ہے۔"
"جی"
"میں تم سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتی۔ صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تمہاری نسبت ہم سمیرا سے ٹھہرا چکے ہیں۔"
"دادی حضور۔۔"
"اور تمہیں ہمارے فیصلے کا پابند ہونا پڑے گا۔"
"یہ نہیں ہو سکتا دادی حضور۔"
"یہ ہو گا۔"
آواز میں اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ ریحان چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئے۔
"دادی حضور۔" وہ وقفے کے بعد لجاجت سے بولے۔
"میں کچھ نہیں سنوں گی۔"
"لیکن مجھے۔۔ افسوس ہے۔۔ میں آپ کے فیصلے کا پابند نہیں ہو سکتا"۔
"میں جانتی تھی تمہارا جواب یہی ہو گا۔ لیکن جذبات کی رو میں نہ بہو۔ سوچ سمجھ لو۔"
"سب سوچ چکا دادی حضور۔۔ میرے فیصلے میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔"
"بچہ نہ بنو۔ جاؤ آرام سے سوچو۔۔ دو چار دن سوچ لو۔ پورے اطمینان سے۔۔ تمہیں میرے فیصلے کا پابند ہونا ہے۔ نہیں تو انجام کا خیال خود کر سکتے ہو۔"
"دادی حضور۔۔"
"جاؤ۔۔ دو چار دن سوچ لو۔ پھر جواب دینا۔۔"
ریحان نے کچھ کہنا چاہا۔
لیکن دادی نے ٹوک دیا۔
وہ جھکے۔ بہ منت دادی سے اپنی خواہش کا اظہار کرنے کو لیکن دادی غصے میں آ

گئیں۔
ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔
ریحان ہلتے ہوئے پردہ کو دیکھتے رہ گئے۔



(۵۳)

اچھا خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

ریحان اور حسن بانو دونوں اپنی اپنی جگہ سنگلاخ چٹان تھے۔ دادی جھکنا جانتی تھیں نہ ریحان۔ گھر کی فضا خاصی مکدر ہو چکی تھی۔ ہر دل سہما ہوا تھا۔

انجم آراماں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی تھیں۔ لیکن وہ بیٹی کی نصیحتوں پر کان دھرتیں یا بہو کے آنسو دیکھتیں۔ فوزیہ نے جو محاذ قائم کر رکھا تھا، اسے بھی تو دیکھنا تھا۔

دن کا چین اور رات کی نیند۔ بس تقریباً سب کے لیے حرام ہو گئی تھیں۔ بحثیں تکراروں میں بدل رہی تھیں۔ ریحان کے والد نے چند الفاظ میں بیٹے کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ لیکن سعدیہ کو ایک طرف اپنی عزیز بھانجی سمیرا کا خیال تھا۔ دوسری طرف یہ وہم کہ صاعقہ ازلی منحوس ہے۔ وہ کسی طور ریحان و صاعقہ کا بندھن ماننے کو تیار نہ تھیں۔

فخر چچا بھی حالات کے پیش نظر ریحان کے حامی تھے۔ گو اس زد میں اپنی بیٹی آ رہی تھی۔ تاہم شادی کے معاملہ میں جبر کے قائل نہ تھے۔ بیوی کی تکرار کے ڈر سے انہوں نے اپنا فیصلہ محفوظ ہی رکھا۔

حسن بانو ریحان کی ضد سے ٹکرا رہی تھیں۔ ریحان جتنا اپنی بات پر اڑ رہے تھے۔ حسن بانو اپنی بات منوانے پر اتنا ہی تل رہی تھیں۔

نوجوانوں کی اکثریت ریحان کی حامی تھی۔

معاملہ خاصا الجھ رہا تھا۔ ریحان کو حق پر سمجھتے ہوئے بھی سب متفکر تھے۔ دادی سے ٹکرانا کوئی آسان بات تو نہ تھی۔ اپنے وقار، ظاہری نام و نمود اور جھوٹی عزت پر وہ بیٹے کو قربان کر چکی تھیں۔ پوتے کو بھلا کیا سمجھتیں۔ ریحان یوں ضد میں نہ آتے تو شاید پچھلی خونچکاں داستاں دادی کے نظریے کو بدلنے میں مدد و معاون ہوتی لیکن یہاں تو ضد کا معاملہ تھا۔

بچوں کے ہاتھ کھلونا بننا دادی کی سراسر توہین تھی۔

اور

توہین وہ مر کر گوارا نہ کر سکتی تھیں۔

گھر میں جو ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ریحان اس سے قطعاً لاپروا تھے۔ اپنی ناکامی کے متعلق تو انہوں نے نہ سوچنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ عزم و عقیدہ اتنا راسخ تھا کہ ہر گام پر منزل نظر آتی تھی۔ فکر تھی تو صرف صاعقہ کی جو ان دنوں اس پھول کی طرح کملا گئی تھی جس کی جھلسا دینے والی گرمی میں بھی آبیاری نہ ہوئی ہو۔

سارا دن اپنے کمرے میں مقید رہتی۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا اور آنکھیں سوج گئی تھیں۔ سہمی ہوئی خوف زدہ سی رہتی۔ ریحان اسے بہتیرا سمجھاتے، تسلیاں دیتے، ہنسانے کی کوشش کرتے۔ جھلا کر غصے بھی ہوتے، خفگی کا اظہار بھی کرتے لیکن وہ تو موت سے پہلے مری جا رہی تھی۔ ریحان کی کوششیں رائگاں جا رہی تھیں۔

دادی وضعداری پر جان دینے والی عورت تھیں۔ رعب و دبدبے سے اپنی من مانی شروع سے کرتی آئی تھیں۔ صاعقہ سے ہار مان لیتیں تو ان کی وضعداری کیا ہوتی

انجم بار بار سمجھا رہی تھیں۔ حسن بانو نے کئی بار ریحان کو بلا کر ڈانٹنے کا ارادہ کیا۔

"امی حضور۔۔ جوان لڑکا ہے۔ کوئی ایسی حرکت یا بات کہہ دے گا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں۔ وہ اپنی ضد میں ہے۔ اس طرح اسے اور مشتعل کرنا اچھا نہیں۔"

حسن بانو کی سمجھ میں یہ نقطہ آگیا۔

"میں خود اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔"

"تم کیا سمجھاؤ گی۔ جو خود اس کی حامی ہو۔"

"آپ کی خوشنودی کی خاطر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ ورنہ یہ تو فضیلت ہے امی حضور! مجھے تو یہ بات معیوب نظر نہیں آتی۔ صاعقہ بھی اپنا ہی خون ہے۔۔"

"بس بس۔۔ میں کچھ نہیں سنوں گی۔۔ میرا فیصلہ پتھر پر لکیر ہے۔"

"اگر ریحان کسی صورت اس فیصلہ کا پابند نہ ہو سکا؟"

"کیوں نہ ہو گا۔"

"فرض کیجئے نہ ہوسکا تو۔۔!"

"تو۔۔"

"ایک بار پھر وہی قصہ دہرایا جائے گا۔ طاہر کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں، بے ساختہ طاہر یاد آجاتے ہیں۔ وہی انداز وہی ضد۔۔" انجم آرا نے اک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔

"طاہر کا فعل شاید مستحسن نہ ہو، لیکن ریحان کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتیں"

"کیوں؟"

"طاہر نے اک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جسے ہمارا خاندان قبول کرتے ہوئے ہچکچا سکتا تھا۔ لیکن صاعقہ اپنی ہی اولاد ہے۔۔ اپنا ہی خون ہے۔ اپنے مرحوم طاہر کی بچی ہے۔ خاندان اسے قبول کرنے میں ہچکچا نہیں سکتا۔۔ وقار، نام و نمود، آن بان کیوں معترض ہوں گی۔"

"لیکن میرا فیصلہ جو ہوچکا ہے" حسن بانو کچھ مرعوب سی نظر آنے لگیں۔

"وہ وقت گئے امی حضور۔۔ جب تقدیروں کے فیصلے بلا سوچے سمجھے ہو کر بھی کامیاب ہوا کرتے تھے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ ریحان صاعقہ کے بغیر۔۔"

"جو کچھ بھی ہے میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

انجم آرا خاموش ہوگئیں۔ لیکن انہوں نے ماں کو سمجھانے کا خیال چھوڑا نہیں۔ جس وقت بھی موقعہ ملتا کوشش ضرور کرتیں۔ فوزیہ نہ ہوتی تو شاید انہیں کامیابی ہو بھی جاتی۔ لیکن فوزیہ سے نپٹنا مشکل تھا۔ وہ تو جب بھی حسن بانو کے پاس بیٹھتی، رو رو کر ہی ہلکان ہوتی۔ سمیرا بھی گم صم ہوگئی تھی۔ دادی جتنا اپنی ضد پہ اڑ رہی تھیں' وہ اتنا ہی کامیابی کی امید لگا رہی تھیں۔

بات بڑھتی گئی۔ لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے۔ رات گئے تک یہی بحث ہوتی رہتی۔

ریحان کو باری باری سبھی سمجھا چکے تھے۔ جو حامی تھے وہ بھی، جو مخالف تھے وہ بھی۔ سارا خاندان جو اس جھگڑے کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

ریحان نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا تھا۔ جس پر سوچنے کی ضرورت ہوتی۔ اپنی بات

اس دن ماں کی ایما پر حسن آرا نے ریحان سے اچھی خاصی بحث کی۔ صاعقہ کی نحوست کے قصے کو اچھالا۔ اس کی ماں کے فرار کی داستان دہرائی لیکن یہ اوچھے ہتھیار ریحان کو قائل نہ کرسکے۔ ان کا ایک ہی جواب تھا۔

"صاعقہ جیسی بھی ہے۔ جس ماں کی بھی بیٹی ہے، مجھے منظور ہے۔"

"لیکن تمہاری دادی اماں! یہ بات گوارا نہیں کرسکتیں۔"

"میں اپنی زندگی کا مختار آپ ہوں۔ فیصلہ مجھے کرنا ہے دادی حضور کو نہیں۔۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو وہ ایک بات زبان سے نکال چکی ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ کتنی بری بات ہے اور اس کا اثر براہِ راست سمیرا پر بھی پڑتا ہے۔"

"قطعاً نہیں۔۔"

"یہی تو تمہاری نا سمجھی ہے۔"

"سمیرا عقلمند لڑکی ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کے لیے وبال بننا بالکل پسند نہ کرے گی۔ جو اسے زندگی اور زندگی کی خوشیاں نہ دے سکے۔ پھوپھی جان۔۔ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی صاعقہ ہے۔ اس کے بغیر کسی اور کو اپنانے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"اس ضد کا انجام جانتے ہو!"

"مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کے بہت سے طریق آتے ہیں پھوپھی حضور۔۔ خودسری سب سے بڑا راستہ ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ میں سب کی خوشنودی چاہتا ہوں۔"

"خاک خوشنودی چاہتے ہو۔ گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا رہے ہو۔ کسی کی سنتے ہی نہیں۔۔ سمیرا میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔۔؟"

"پھوپھی جان۔۔ میں اس سے آگے کچھ نہیں سنوں گا۔ میرا پہلا اور آخری فیصلہ یہی ہے۔ اس میں کسی لچک کی گنجائش نہیں۔ دادی حضور نے برضا و رغبت میری خواہش کا خیال نہ کیا تو میں۔۔ میں مجبور ہوؤں گا۔ نبھاو مجھے کرنا ہے۔ کسی اور کو نہیں۔۔ میں اپنے اوپر زبردستی کا فیصلہ مسلط نہیں کروں گا۔"

کی کوشش کرتے رہے لیکن قائل کوئی بھی نہ ہو سکا۔

جب ریحان کو سمجھانے بجھانے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو پالیسی کا رخ بدلا گیا۔ صاعقہ کو ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔۔ فوزیہ تو پہلے ہی اس کی جان کی بیری تھی۔ اب سعدیہ اور حسن آراء نے بھی اس کا ناک میں دم کر دیا۔

صاعقہ تو اپنے کمرے ہی میں مقید ہو گئی تھی۔ بہت کم سامنے آتی۔ حالات جو سنگین صورت اختیار کر رہے تھے، اس سے وہ بے خبر نہ تھی۔

اس دن اچانک حسن آرا اس کے کمرے میں پہنچی اور بلا تمہید اس پر برسنا شروع کر دیا۔

"آگ لگا کر تماشہ دیکھ رہی ہو۔ سارے خاندان کو جنجال میں پھنسا دیا ہے۔ ماں کم بخت کم تھی، بیٹی اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ اپنے آپ کو بھول کیوں گئی ہو۔ دماغ عرش پہ جا پہنچا ہے۔ جو کچھ تمہاری ماں کی وجہ سے ہوا تھا، اب پھر وہی کچھ ہونے والا ہے۔ بھس میں آگ لگا کر خود الگ ہو بیٹھی ہو۔"

وہ جانے کیا کیا کہہ کر دل کا غبار نکالتی رہی۔۔ صاعقہ پتھر کی طرح چپ چاپ ان کا منہ تکے گئی۔ وہ تو اس طرح سکتے میں آئی تھی کہ آنکھوں میں آنسو تک منجمد ہو گئے تھے۔

—— ○ ——

(۵۴)

صاعقہ کی حالت اس مریض کی سی تھی جو چارہ گر کی انتھک کوششوں اور تسلی دلاسوں کے باوجود موت کو اپنے قریب تر پا رہا تھا۔

فوزیہ، سعدیہ اور حسن آراء نے طعن و تشنیع سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ وہ اب تا سمجھ گئی تھی کہ ریحان نے خود سری سے اپنی من مانی کر بھی لی تو بھی خوشیاں اسے اپنے دامنوں میں نہ لے سکیں گی۔ گھر بھر کا تنفر کچھ کم تو نہ تھا۔

حسن آرا طنز کے تیر برسا کر کئی دھمکیاں دے گئی تھی۔ صاعقہ نے رونے دھونے کے بعد سارے معاملے پر دلجمعی سے غور کیا۔ اس کا آخری فیصلہ یہ تھا کہ وہ ریحان کے راستے سے ہٹ جائے گی۔ سارے خاندان کو جنجال سے نکالنے کا یہ طریقہ رہ گیا تھا۔

رات ریحان اس کے کمرے میں آئے۔ وہ اتنی دل گرفتہ، مایوس اور مضمحل نظر آتی تھی کہ ان کا دل کٹ گیا۔ انہیں صاعقہ پر غصہ بھی آیا۔ انکی تسلیوں کے باوجود وہ اتنی ہراساں تھی۔

اور جب اس نے رو رو کر ریحان سے بہ منت کہا کہ وہ دادی کی بات مان لیں تو ریحان مشتعل ہو گئے۔ صاعقہ نے رو رو کر اصرار کیا۔۔ "سارے خاندان میں بھونچال آیا ہوا ہے ریحان۔۔ آپ دادی حضور کی بات مان لیں۔"

"صاعقہ" ریحان نے چیخ کر کہا۔ وہ غصہ میں بھر گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ صاعقہ کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے تیزی سے بولے "میری ہمت بڑھانے کی بجائے مجھے بزدلی پہ آمادہ کرتی ہو؟"

"اسی میں مصلحت ہے۔۔" صاعقہ ان کی مجنونانہ حرکت کو نظر انداز کرتے ہوئے رو دی۔

"صاعقہ" ریحان نے بھرپور غصے سے جھنجھوڑ کر اسے پرے دھکیلا۔ "تم میرے ضمیر

شاید زندگی گزار لو لیکن میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مشتعل سے پلٹے۔ صاعقہ دوڑ کر ان کے سامنے آگئی۔ "ریحان ریحان۔۔" وہ بے اختیار ہو کر رو دی۔ ریحان نے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

صاعقہ ان کے کندھے پر سر ٹکا کر بے اختیار سی ہو کر ہچکیاں لینے لگی۔ ریحان کا غصہ دھیما پڑ گیا۔

"مجھے بہت بڑے طوفان سے نپٹنا ہے صاعقہ۔ تم میری ہمت بند جاؤ۔ تمہاری مایوسی مجھے کہیں کا نہ رکھے گی۔"

اسی رات ریحان دادی کے کمرے میں بلائے گئے۔ دادی سے کئی بار الجھ چکے تھے۔ کئی بار منت و خوشامد سے منانے کی سعی کی تھی۔ عجز وانکساری سے راغب کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ لیکن دادی تو مونگے کی چٹان تھیں۔ اپنی بات پر پورے جاہ و جلال سے قائم تھیں۔ ریحان کے صبر کے بند بھی اب ٹوٹ گئے۔ وہ آج طوفان سے آخری بار نپٹنے کے ارادے سے آئے تھے۔ ان کی چال میں متانت تھی۔ چہرے پر سنگین سی سنجیدگی۔ ورنہیں یا سر نہیں والا معاملہ نظر آتا تھا۔

دادی اپنے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ فوزیہ منہ بسورے قریبی کرسی پر نیم دراز تھی۔ انجم پرے کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ آج ماں سے انہوں نے جھڑپ لی تھی۔ خاصہ قائل بھی کر لیا تھا۔ لیکن سعدیہ اور فوزیہ نے وہ طوفان اٹھایا تھا کہ انہیں چپ ہو جانا پڑا تھا۔

سعدیہ حسن بانو کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ کاہے کاہے ان کے کندھے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی۔ حسن آرا مسہری کے تکیے سے ٹیک لگائے تھی۔

زیر بحث وہی موضوع تھا۔

ریحان اک متانت آمیز چال چلتے دادی کے پلنگ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ سعدیہ کے ماتھے پر انہیں دیکھتے ہی بل پڑ گئے۔ حسن آرا اور فوزیہ بھی چپ ہو گئیں۔

حسن بانو نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "دادی حضور!"

"میں نے تمہیں طلب نہیں کیا۔۔"

"میں خود حاضر ہوا ہوں۔"

"کس لیے"

"یہ آپ جانتی ہیں۔"

"کسی قسم کی گفتگو سے پہلے جواب دو کہ تم نے کیا سوچا ہے"؟

"عمر بھر بھی سوچتا رہوں تو فیصلہ وہی ہوگا جو آپ کے گوش گزار ہو چکا ہے۔"

"ریحان" سعدیہ نے ڈانٹا۔ ریحان نے اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہ لیا۔

"خود سری پہ اتر آئے ہو؟" دادی نے پوچھا۔

"اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے آپ خود سری پر آمادہ نہ کریں۔" لہجے کی تنک سے دادی بھڑک اٹھیں۔ "تمہارے چچا نے بھی خود سری کی تھی۔ جانتے ہو انجام کیا ہوا تھا۔ وہی حالات پھر پیدا ہو رہے ہیں۔ سمجھ لو کہ ایک ماں اپنے بیٹے کی پروانہ کر سکی تو تمہاری کیا کرے گی۔ اپنے وقار کی خاطر ہم سب کچھ سہہ گزریں گے۔"

"اس میں وقار کا کیا سوال دادی حضور" حسن بانو کے اشتعال کے باوجود ریحان بڑے سکون سے بولے۔ "کیوں نہیں؟"

"کیا صاعقہ آپ کی پوتی نہیں۔۔؟" ریحان نے مسہری کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دادی کے گھٹنے پکڑ لیے۔ ان کی آواز میں گلہ بھی تھا۔ رنجش بھی۔۔ احتجاج بھی اور استفسار بھی۔

دادی کچھ بوکھلا سی گئیں۔ صاعقہ کو پوتی تسلیم کرنے سے انکار کیونکر کریں۔

حسن آرا نے جلد ہی بات سنبھالی۔ "پوتی۔۔ ہونہہ۔۔ ڈائن ہے ڈائن۔"

"پھوپھی جان" ریحان چیخے۔

"ریحان۔۔ تمیز کی حدود سے باہر مت نکلو" سعدیہ نے پھر ڈانٹا۔

"ڈائن ہو کہہ دیا اس کی چہیتی کو" فوزیہ غرائی۔

"ڈائن نہیں تو کیا ہے۔ پیدا ہوتے ہی ابا حضور کو نگل گئی" حسن آرا نے پھر وار کیا۔

"وہ پیدا نہ ہوتی تو دادا حضور نے وفات نہ پائی تھی؟" ریحان نے خشم ناک لہجے میں کہا۔

"ریحان" دادی کی آواز میں ڈانٹ تھی۔

"جی"

"تمہاری ان باتوں کا کیا مطلب؟"

"آپ لوگوں کی توہم پرستی نے صاعقہ کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ یہ خود ساختہ

خود ساختہ!!۔۔" فوزیہ تنک کر بولی۔

"تو اور کیا۔۔ صاعقہ کا ان سے کیا تعلق۔۔۔ دادا جان فوت ہو گئے گناہگار صاعقہ۔ پھوپھا جان کو فضائی حادثہ پیش آیا، موردِ الزام وہ بیچاری۔۔ گوداموں میں آگ لگی چوکیدار کی غفلت سے، عتاب صاعقہ پر ٹوٹا۔" ریحان نے جوش میں آکر کئی واقعے دہرا دیے:

"ذرا تو ٹھنڈے دل سے سوچیے۔ نحوست کو اس کی ذات سے وابستہ کرنے میں آپ سب کہاں تک حق بجانب ہیں۔"

"مجھے اس تکرار میں پڑنے کی ضرورت نہیں" حسن بانو جیسے کترانا چاہتی تھیں۔ "لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ جب سے پیدا ہوئی ہے ہمارے خاندان پر آفتیں ہی ٹوٹی ہیں۔"

"کیا اس کی پیدائش سے پہلے خاندان کسی آفت سے دوچار نہ ہوا تھا؟" ریحان نے دادی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا

"ریحان!!" سعدیہ نے ٹوکا۔

لیکن ریحان اپنی دھن میں جوش میں آکر بولے "دادی حضور آپ کے جواں سال بھائی مینار سے گر کر کب ہلاک ہوئے تھے؟ اور وہ جو قیمتی کاغذات اور دستاویز بس جلنے کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا تھا، وہ بھی صاعقہ ہی کی پیدائش کے بعد کی بات ہے کیا؟۔۔ اراضی کے جھگڑے میں کئی مزارعے جان گنوا بیٹھے تھے۔ یہ قصہ بھی تو صاعقہ کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔۔"

ریحان نے جوش سے بھڑکتے ہوئے کئی مثالیں دے ڈالیں۔ انحراف ممکن کہاں تھا۔ دلائل سے سب دم بخود سے ہو گئے۔

سعدیہ بار بار بیٹے کو ڈانٹ رہی تھی۔ لیکن جوش میں وہ کچھ سن تھوڑا ہی رہے تھے۔ حسن بانو چپ تھیں۔ ریحان کی تقریر کا اثر جو تھا، سو تھا، آج دوپہر سے ہی بجھی بجھی نظر آرہی تھیں۔ اس پر انجم آرا نے جو جھڑپ لی تھی' حقائق کو نظر انداز کرنا ناممکن نظر آرہا تھا۔ ان کے اندر کی عورت کسمسا اٹھی تھی۔ شام صاعقہ سے بھی سامنا ہوا تھا۔ اس کی پریشان حالی دیکھ کر ایک بار تو دل میں کسک ہوئی تھی۔ فوزیہ اور سعدیہ واویلا کرتیں تو شاید آج شام ان کی شفقتوں کے سمٹے دامن صاعقہ کے لیے خود بخود پھیل جاتے۔ جب

ے اب تک ضمیر برابر ملامت کر رہا تھا۔

"اور پھر ان سب آفتوں کو صاعقہ ہی کی ذات سے جانے کیوں وابستہ کیا جاتا ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ فرید ماموں کی موت اسی سے کیوں وابستہ کی جاتی ہے۔ میرا سے کیوں نہیں۔ جو ان دنوں صرف چھ ماہ کی تھی۔ فریدوں سے کیوں نہیں جو صرف دس دن کے تھے۔"

فوزیہ اس زبردست چوٹ سے تلملا اٹھی۔ سعدیہ اور حسن آرا بھی آتش زیر پا نظر آئیں لیکن حسن بانو چپ تھیں۔ فوزیہ انہیں چپ دیکھ کر غصے سے بھڑک اٹھی۔ سب کی سب ریحان کے پیچھے پڑ گئیں۔ انجم پرے کھڑکی میں کھڑی سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ ریحان چند لمحے خاموشی سے سنتے رہے۔

"جو کچھ بھی ہے۔۔ تم اس کی نحوست سے انکار کر سکتے ہو لیکن اتنا بھی جانتے ہو کہ اس کی ماں کون تھی؟" فوزیہ نے جیسے سب سے بڑا وار کیا۔

"جو بھی تھی" ریحان متانت سے بولے "اتنی واضح ارفع واعلیٰ تو ہوگی کہ اس کے لیے طاہر چچا زمانے سے ٹکرا گئے۔"

"ریحان بہت بڑھتے جا رہے ہو۔" سعدیہ نے سرزنش کے طور پر ڈانٹا۔

"سوچ کر بات کرو" حسن آرا غرائیں۔

دادی اب بھی چپ تھیں۔ شاید ان کے اندر کی عورت پھر کسمسا رہی تھی۔ ریحان کسی کی پروا کیے بغیر پھر دادی سے مخاطب تھے۔۔ "دادی حضور۔۔ آپ اتنی سنگ دل کیوں ہو گئیں!"

ریحان کے لہجے کی رقت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا۔

"طاہر چچا پر پابندی لگانے میں بے شک آپ حق بجانب تھیں۔ ہماری خاندانی روایات مجروح ہونے کا سوال تھا۔ لیکن صاعقہ کے بارے میں آپ کا یہ رویہ کیوں ہے۔ وہ تو آپ کا اپنا خون ہے دادی حضور۔ آپ کے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے۔" عالمِ جنون میں ریحان دادی کے گھٹنے بار بار جھنجھوڑ رہے تھے۔

"یتیم بچی آپ کے ہوتے ہوئے بھی ساری عمر آپ کے سایۂ عاطفت سے محروم رہی ہے۔ ہزاروں یتیم آپ کی ذرہ نوازی کی بدولت زندگی کی آسائشیں لوٹ رہے ہیں۔ آپ کی نگرانی میں یتیم خانے چل رہے ہیں۔ لیکن آپ کے گھر میں آپ کا اپنا خون آپ

سے واسطے شفقت کے لمس تک سے محروم ہے۔ کبھی جانتے ہیں آپ نے پیار کی نظر سے بھی اسے دیکھا ہے۔ کیا یہی فرمان خداوندی ہے دادی حضور۔ کیا یتیموں سے ایسا ہی سلوک روا رکھنا چاہیے!" ریحان جوش جذبات سے ابل رہے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔

ان کے سیاہ کوٹ کے کندھے پر ابھی تک صاعقہ کے آنسوؤں کے داغ تھے۔ ریحان بولتے گئے۔ ان کے الفاظ جادو کے سانچے میں ڈھلتے گئے۔ حسن آرا اور سعدیہ کو انہیں ٹوکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

پتھروں میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ سب کے سر جھکے جا رہے تھے۔ اک فوزیہ تھی جو ان جھکتے سروں میں اپنی شکست کا عکس دیکھ کر غصے سے جوش کھا رہی تھی۔

"آپ سب کتنے شقی القلب ہیں۔ آپ نے اک جیتی جاگتی زندگی کو موت سے ہم کنار کر رکھا ہے۔ آپ نے بےرحمانہ رویے سے ہمیشہ اس کے زخموں پر نمک چھڑکا ہے۔ کبھی کسی نے پیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا وہ انسان نہیں؟ اس کے سینے میں دل نہیں۔ وہ ماں کے پیار کی تمنا نہیں رکھتی۔ وہ باپ کی شفقتوں کی تمنائی نہیں۔ آپ نے اب تک اس کی ان مجروح اور سسکتی خواہشوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ بن ماں باپ کی بچی کو پیار کی نعمت سے کہاں تک نوازا ہے۔ اس خلا کو کہاں تک پورا کیا ہے جو آپ کے بیٹے کی وفات سے پیدا ہو گیا تھا۔ کہیئے دادی حضور۔۔ آپ نے اپنے مرحوم بیٹے کی روح کی آسودگی کے لیے اب تک کیا کیا ہے۔ کیا طاہر چچا کی روح اب تک بھٹک نہ رہی ہوگی۔ کیا اسے اس حالت میں قرار آ سکتا ہے۔ دادی حضور۔۔ دادی حضور۔۔!" ریحان ہانپ رہے تھے۔ انہوں نے دادی کے قدموں پر سر رکھ دیا، نڈھال ہو کر۔

"آپ نے اپنے اندر کی عورت کا گلا کہاں گھونٹ دیا دادی حضور۔" ریحان نے پھر سر اٹھا کر مجنونانہ انداز میں دادی کے پاؤں جھنجھوڑے۔۔ "جھوٹی آن، ظاہر داری اور تصنع کے لیے اس عورت کو کہاں سلا دیا ہے دادی حضور۔۔ جس کے سینے میں ممتا بھرا دل دھڑکتا ہے۔"

انجم زار زار رو رہی تھی۔ حسن آرا اور سعدیہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔

حسن بانو بدستور سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ وہ تو جیسے پتھرا ہی گئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر جلد چپ تھی۔ ریحان بار بار انہیں جھنجھوڑ کر اپنی بات کا جواب مانگ رہے

تھے۔

"آپ نے عمر بھر اسے کچھ نہیں دیا۔ ہر دل میں اس کی طرف سے نفرت و حقارت کا زہر بھرا ہے۔ بچوں کے ذہن آپ سب نے مسموم کیے۔ ہر کوئی اس کے سائے سے ڈرتا ہے۔ وہ نیک دل آپا نہ ہوتی تو بعید نہ تھا آپ جیسے لوگ اسے زندہ دفن کر دیتے۔ گلے میں پھندہ ڈال کر ختم کر دیتے۔ آپ اب بھی اسے کچھ نہیں دینا چاہتیں۔ اس کی خوشیوں کے گلے یوں گھونٹنے سے بہتر ہے آپ اس کا گلا گھونٹ دیں۔۔ لمحہ لمحہ کی موت سے ایک بار ہی مار ڈالیں۔" اور پھر جانے ریحان کو کیا ہوا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوش میں چیختے ہوئے بولے "آپ اب بھی اسے کچھ نہیں دینا چاہتیں تو میں اسے ابھی یہاں لے آتا ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیں۔ تڑپا تڑپا کر مارنے سے ایک بار ہی ختم کر ڈالیں۔۔ اسے ابھی لاتا ہوں۔ ابھی لاتا ہوں۔۔" وہ دیوانہ وار کمرے سے نکلے۔

اور چند ہی منٹوں بعد وہ صاعقہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے کر کمرے میں آ گئے۔ صاعقہ بدحواس تھی۔ چہرہ فق تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھی جم گئے تھے۔

شاید۔۔۔ کچھ بھی نہ سمجھ پائی تھی۔

ریحان نے پلنگ کے قریب پہنچ کر اسے دادی کی طرف دھکیل دیا۔ "یہ لیجیے اپنے ظلم کے شکار کو۔۔ ابھی آپ کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تو مار ڈالیے اسے۔۔ گلا گھونٹ دیجیے۔۔" ریحان ایک دم رک گئے۔

حسن بانو نے صاعقہ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا تھا۔ انکی بوڑھی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں تھا۔

"میرے بدنصیب طاہر کی مظلوم بچی۔۔!" وہ اسے دیوانہ وار سینے سے لگائے رو رہی تھیں۔

حسن آرا اور سعدیہ بھی یوں رو رہی تھیں جیسے طاہر آج سے بیس سال پہلے نہیں ابھی ابھی مرے ہوں اور ان کی بے یار و مددگار بچی ان کے سامنے پڑی بلک رہی ہو۔

نظارہ اس قدر رقت انگیز تھا کہ ریحان کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے۔ ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ماحول بدل چکا تھا اور اس کے ساتھ صاعقہ کی تقدیر بھی۔ دادی اسے سینے سے بھینچے جس بے اختیاری اور وارفتگی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ پچھلی تلخیاں خود بخود دھل رہی تھیں۔

صاعقہ روتے روتے بے دم ہو گئی تھی۔ آج زندگی میں پہلی بار اس نے دادی کی شفیق گود کی پناہ پائی تھی۔ وہ اس گود میں تحلیل ہو جانا چاہتی تھی۔
آہ محبت و شفقت کو ترسی ہوئی پیاسی رُوح!

———O———

۵۵

بہار کی نشیلی ہواؤں کی طرح جھومتی صاعقہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی آج شام کے غیر متوقع واقعے نے اس کی زندگی کے رخ اچانک کامرانیوں کی طرف موڑ دیے تھے۔ سرور جذبے اس کے سینے میں ہلچل مچا رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد ابھی تک وہ آپا سے نہ ملی تھی۔ آپا۔۔ جو اس کی حقیقی مونس و غمگسار تھی۔ "آپا!" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی وفور مسرت سے چلائی لیکن بتی جلاتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ جسے آپا سمجھ کر بولی تھی وہ آپا نہیں فوزیہ تھی۔
اتنی رات گئے فوزیہ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک جانا قدرتی امر تھا۔ فوزیہ نے سرتاپا اسے گھورا۔
صاعقہ اور سہم گئی۔ اس کا ننھا سا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔
"آ گئی ہو رنگ رلیاں منا کر" وہ تیکھے تیوروں سے اسے دیکھتے ہوئے بڑی کرخت آواز میں بولی۔ صاعقہ گنگ سی دروازے کے قریب کھڑی فوزیہ کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ کمرے کے عین وسط میں دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھے کھڑی تھی۔ چہرے سے کرختگی کے آثار صاف مترشح تھے۔ آنکھوں میں اک خوفناک سی چمک تھی جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔
"آج تم بہت خوش ہو۔۔ میدان مار لیا ہے نا۔۔ گھر والوں کے دل جیت لیے نا۔۔" فوزیہ تلخی سے مسکرائی۔
صاعقہ آنکھیں کھولے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ زبان گنگ تھی اور گھبراہٹ سے پسینہ آ رہا تھا۔
"تم جانتی ہو۔ سمیرا اور ریحان کی نسبت ٹھہرائی جا چکی تھی؟" فوزیہ نے بلا تمہید تلخ ہو کر سوال کیا۔ صاعقہ نے سر جھکا لیا۔ لیکن کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکی۔
"تم اگر نہیں جانتیں تو میں بتائے دیتی ہوں۔ یہ نسبت قرار پا چکی تھی اور تمہاری

آگہی کے لیے یہ بھی کہہ دوں کہ یہ نسبت میری بیٹی کی زندگی کی خوشیوں کی ضامن تھی۔۔"
فوزیہ نے اک قہر آلود نگاہ صاعقہ پر ڈالی۔

صاعقہ سر تا پا کانپ گئی۔

تمہارے وجود نے حائل ہو کر ساری بساط ہی پلٹ دی ہے۔ اور آج کے واقعے نے تو میری بچی کی تقدیر پر ابدی ناکامی کی مہر لگا دی ہے۔ آج سے بیس اکیس برس پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ تمہاری ماں نے میری زندگی کی بہاریں لوٹ لی تھیں۔۔ اور آج تم۔۔ تم وہی کردار ادا کر رہی ہو۔۔ لیکن۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔" فوزیہ رعد و باراں کی طرح کڑکی۔۔

"چچی حضور۔۔" کانپتے ہوئے جسم کو بمشکل سنبھالے صاعقہ مدھم آواز میں صرف اتنا کہہ سکی۔

"تم بہاریں لوٹو۔۔ اور میری بچی کانٹوں سے لہولہان ہو۔۔ میں جیتے جی یہ برداشت نہیں کر سکتی میں اپنی بیٹی کا دامن مسرتوں سے بھر کر رہوں گی۔۔ تمہیں اس کے راستے سے ہٹنا ہو گا۔"

فوزیہ دو قدم آگے بڑھی۔ اس کی آواز میں خوفناک گونج تھی "تم اس کے راستے سے اب بھی ہٹ جاؤ۔۔ نہیں تو یاد رکھنا اک ماں محرومیوں کی اذیت سے آشنا ماں، اپنے لختِ جگر کی مسرتیں لوٹانے کے لیے بھیانک سے بھیانک قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔"

صاعقہ کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید تھا۔ پٹ کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ لیکن ٹانگیں سہارے کے باوجود اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر نظر آ رہی تھیں۔

"وعدہ کرو۔۔" فوزیہ آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے بولی۔ "کہ تم ریحان اور سمیرا کے راستے سے ہٹ جاؤ گی۔"

"چچی۔۔ حضور۔۔" صاعقہ نے سراپا درد بن کر اس کی طرف دیکھا لیکن خونخوار نظروں میں رحم کا شائبہ تک نہ تھا۔ صاعقہ بے اختیار ہو کر رونے لگی "مجھے آنسوؤں سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔۔ میری بات کا جواب دو۔۔"

وہ چند لمحے رکی۔۔ پھر غرائی "تم مصالحت پہ آمادہ نہ ہوئیں تو میں دوسرا طریقہ بھی استعمال کر سکتی ہوں۔"

صاعقہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ فوزیہ کے ہاتھ

میں پستول تھا جس کی نالی کا رخ صاعقہ کی طرف تھا، اپنی جان عزیز ہے تو وعدہ کرو۔۔ نہیں تو میں اک لمحہ میں تمہیں ختم کر دوں گی۔ میری بچی اگر ناکامی کے دکھ جھیلے گی تو تم بھی بہاریں لوٹنے کے لیے نہ رہو گی۔۔ بولو۔۔ جواب دو۔۔ ورنہ۔۔!"

ایک ہاتھ لپکا۔ بجلی کی سرعت سے فوزیہ کے ہاتھ پر جھپٹا اور پستول چند گز کے فاصلے پر جا گرا۔ صاعقہ اور فوزیہ نے بیک وقت ادھر دیکھا۔ جھپٹنے والی آپا تھی جو صاعقہ کے ڈریسنگ روم سے اچانک نکل آئی تھی۔

آپا کی مداخلت پر فوزیہ کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ وہ چیل کی طرح پستول پر جھپٹی لیکن آپا نے تیزی سے بڑھ کر پستول اٹھا لیا۔

صاعقہ بت بنی وہیں کھڑی تھی۔ اس کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کر لی تھی۔ کسی بے جان تماشائی کی طرح آنکھیں کھولے ہوئے تھی۔

"پستول مجھے دے دو!" فوزیہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

آپا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میری راہ میں حائل نہ ہو آپا۔۔ ورنہ جان لے کر میرے انتقام کی آگ تجھے بھی ساتھ ہی بھسم کر ڈالے گی۔۔" فوزیہ خونخوار لہجے میں بولی۔

آپا نے فوزیہ کی طرف دیکھا۔۔ چند ثانیے دیکھتی رہی۔۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں چمک آئی۔۔ سانس پھول سا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان اس کے سینے کی ہڈیوں سے ٹکرا رہا ہو۔

فوزیہ پستول پر پھر جھپٹی۔

"ہٹ جاؤ!" آپا نے دھکا دے کر اسے دور ہٹا دیا۔

"تم کون ہو میرے معاملے میں دخل دینے والی؟" فوزیہ چیخی۔

"میں۔۔ میں۔۔" طوفان پھوٹ پڑنے کو بیتاب نظر آ رہا تھا۔ "میں بتا دوں میں کون ہوں۔۔ میں تیرے سینے میں بیس سال سے گڑی ہوئی میخ ہوں۔ میں تیری شکست کی آواز ہوں۔"

صاعقہ نے ششدر ہو کر آپا کی طرف دیکھا۔ فوزیہ خونخواری کے باوجود کچھ بوکھلا سی گئی۔

"بکواس بند کرو" فوزیہ پھر آپا سے پستول چھیننے کو لپکی۔

"پرے ہٹ جاؤ فوزیہ۔۔ کہیں میری بے صبر دبی ہوئی ناکام جبلتیں مجھے یہی پستول تم پر آزمانے کو مجبور نہ کر دیں۔۔"

"تم بہت بڑھ رہی ہو آپا۔۔ زبان بند رکھو!" فوزیہ غرائی۔

"آج یہ زبان بند نہ رہ سکے گی۔۔ زبان بند رکھنے کا عرصہ ختم ہو گیا۔ آج، آج میری ریاضت کو ثمر مل گیا فوزیہ۔۔ آج میری زبان بند نہیں رہ سکتی۔۔"

"بیہودہ بد تمیز کیا بک رہی ہے۔۔" فوزیہ آپا پر جھپٹی۔

آپا نے پورے زور سے دھکا دیا۔ فوزیہ گرتے گرتے بچی۔

"آپا!" فوزیہ ناکامی سے جھلا کر چیخی۔

"آپا نہیں۔۔ مجھے ناجی کہو۔۔ ناجی۔۔" آپا کے سینے کا نشیب و فراز طوفان کو روکنے سے قاصر تھا۔ طوفان پھوٹ پڑا۔ صاعقہ نے حواس باختہ ہو کر آپا کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر کے لیے تو فوزیہ بھی شل سی ہو گئی۔ لیکن آپا کو ناجی سمجھنا فہم و ادراک سے دور تھا۔ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو۔ غور سے دیکھو۔۔ پہچانو مجھے۔۔ میں کون ہوں۔"

فوزیہ جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔

اور صاعقہ! اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جانے اب تک حواس پر قابو کیسے پائے ہوئے تھی۔ "تم کہاں پہچانو گی مجھے۔۔ تم تو عرصہ ہوا مجھے نیست و نابود کر چکیں لیکن میں سائے کی طرح تم سے چمٹی رہی۔۔"

فوزیہ نے خشمناک نظروں سے آپا کو گھورا۔

"میں اپنی پہچان کروانے کو تیرے ہی دیئے ہوئے لاتعداد داغ دکھا سکتی ہوں۔ ان مظالم کی داستانیں دہرا سکتی ہوں جو تو نے مجھ پر ڈھائے۔ تو نے میری زندگی کو شمشان بنا دیا۔ اور اب میری بچی کی بہاریں لوٹنے آئی ہے۔۔ میں، میں تیری اس کوشش کا منہ توڑ جواب دینے کو زندہ ہوں۔"

صاعقہ کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ بڑھ کر آپا سے لپٹ ہی جاتی۔

"میں وہ آہنی حصار ہوں فوزیہ جس نے اپنی بچی کی حفاظت نامساعد حالات میں بھی

"تم ناجی ہو" فوزیہ نے گھورتے ہوئے بولی۔

"تمہارے شکوک رفع کرنے کو میرے سینے کے داغ اب بھی جل رہے ہیں۔ ظالم ڈائن مجھے برباد کر کے تسکین نہ ہوئی جو اب میری ممتا کو پھونکنے آئی ہو۔۔"

"تم ناجی ہو؟" فوزیہ دیوانوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

آپا اس کی بوالحواسی پر طنزیہ ہنس دی۔ "یقین نہیں تو سینے کے داغوں کے ساتھ پیٹ کے وہ داغ بھی دکھا سکتی ہوں۔ جو صاعقہ کی پیدائش پر آپریشن کے ہونے کے ضامن ہیں۔۔"

اس ہنسی۔۔ طنزیہ ہنسی نے جیسے بارود کو آگ دکھا دی۔ فوزیہ کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

"تو ناجی ہے۔۔ اگر واقعی ناجی ہے تو میں آج صاعقہ کے ساتھ تجھے بھی ختم کر دوں گی۔ اپنی انتقام کی جلتی ہوئی آگ تم دونوں کے خون سے بجھاؤں گی۔۔ تو ناجی ہے۔ تو میں تجھے مار ڈالوں گی۔۔"

بپھرے ہوئے جذبات لیے وہ پاگلوں کی طرح آپا پر جھپٹی۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش میں وہ خوفناک سے خوفناک تر ہوتی گئی۔ آپا پوری قوت سے مدافعت کر رہی تھی۔

اس ہاتھا پائی میں فوزیہ کا ہاتھ پستول کی لبلبی پر پڑا۔ اس نے تیزی سے لبلبی دبا دی۔ اک گولی چل گئی۔

بارود کی دھماکے سے کمرہ لرز گیا۔ اور نسوانی چیخیں اس دھماکے میں ڈوب گئیں۔

—O—

۵۶

گولی کی آواز سن کر محل کا ہر فرد ہڑبڑا کر اٹھا۔ سب حیران پریشان کمروں سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔

دوسری گولی چلنے کی آواز پر سب حواس باختہ ہو کر آواز کی سمت لپکے۔ صاعقہ کی خواب گاہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے ریحان تھے۔ کمرے کا وحشت ناک منظر دیکھ کر ان کا دماغ چکرا گیا۔

صاعقہ دروازے کے قریب بے ہوش پڑی تھی۔ آپا اور فوزیہ گتھم گتھا تھیں۔ دونوں کے ہاتھ پستول پر تھے۔

فوزیہ وحشیانہ طریق سے چیخ رہی تھی۔۔ "تو ناجی ہے تو میں تجھے ختم کر کے دم لوں گی۔۔ تجھے مار ڈالوں گی۔۔ مار ڈالوں گی۔۔۔!"

چند ثانیوں میں کمرہ محل کے افراد سے بھر چکا تھا۔ اظہر نے بڑھ کر فوزیہ کو آپا سے الگ کیا۔

اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ وہ اظہر کے مضبوط ہاتھوں سے بھی نکلی جا رہی تھی۔ آپا کو کچا چبا جانا چاہتی تھی۔

بمشکل فوزیہ کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ آپا سنبھل کر بیٹھی۔ صاعقہ کو بستر پر لٹا کر ہوش میں لانے کی تدبیریں ہونے لگیں۔

ہر فرد ہراساں تھا۔ صورت حال سے نا آشنا۔۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ ایک دوسرے سے ایک ہی نوعیت کے سوالات پوچھے جا رہے تھے۔

پستول میں باقی چار گولیاں تھیں۔ دو گولیاں چھت کے مختلف حصوں میں سوراخ ڈال چکی تھیں۔

حسن بانو بھی موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ ہر کوئی حالات سے آگہی پانے کو بیتاب نظر آ رہا

تھا۔ ناجی کا ذکر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

آپا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز اب پرسکون تھے۔ پستول اب اظہر کے ہاتھ میں تھا۔

دوسرے کمرے میں فوزیہ اب بھی چیخ رہی تھی۔۔ "ناجی کو میں مار ڈالوں گی۔۔"

صاعقہ کو ہوش آ گیا۔ اتنے بڑے ہجوم کو اپنے گرد دیکھ کر وہ پھر گھبرا گئی۔ آنکھیں بند کر لیں اور بے دم سی نظر آنے لگی۔

ریحان پریشانی اور بیتابی سے بار بار صاعقہ کا کندھا ہلا رہے تھے۔ صاعقہ نے کئی منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ اب اس کا خوف زدہ ذہن حالات کو سمجھنے کی اپنے میں صلاحیت پا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آپا اٹھی اور صاعقہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ صاعقہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ آپا کی طرف دیکھا۔

آپا کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنی بے تاب ممتا کو بہ مشکل قابو کیے وہ صاعقہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صاعقہ اسے دیکھتی رہی۔ آپا کی بھیگی آنکھوں میں ممتا کی لہریں اٹھنے لگیں۔ لہریں اٹھتی گئیں اور ان میں صاعقہ کا وجود بہتا گیا۔ بہتا چلا گیا۔ اور پھر جیسے اسے یہی لہریں کنارے تک لے آئیں۔ وہ اٹھی اور بے تابی سے آپا سے لپٹ گئی۔

"ماں" وہ اس سینے سے لپٹ گئی جس سے لپٹنے کی تمنا نے بارہا اسے تڑپایا تھا۔ ماں۔۔ ماں کے ممتا بھرے سینے سے۔

ناجی نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ دونوں کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

کوئی حقیقتِ حال سے آشنا نہیں تھا۔ صاعقہ کے آپا سے یوں لپٹنے نے ذہن اور الجھنوں میں ڈال دیئے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے انداز نے سب کو متاثر کیا تھا۔

کافی دیر کے بعد جب حواس درست ہوئے اور فضا کچھ کچھ سینے کو سازگار ہوئی تو حسن بانو کے استفسار پر صاعقہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

ہر ذہن جیسے مفلوج ہو کر رہ گیا۔

ہر آنکھ ناجی پر لگی تھی۔ آڑے ترچھے زاویوں سے اسے پرکھا جا رہا تھا۔ یادوں کی راکھ کرید کر کوئی چنگاری نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن ہر کوشش کے باوجود آپا کو ناجی تسلیم کرنے کا خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا۔

آپا پر کئی سوالات کیے گئے۔

اس نے جواب دیے۔ اس نے گھناؤنے مظالم کی داستان دہرائی۔ اس نے طاہر کے ساتھ اس محل سرا میں قدم رکھنے کے بعد کے کئی واقعے بیان کیے۔ سر ندامت سے جھک جھک گئے۔ آپا خود بھی خجل سی نظر آ رہی تھی۔ نیک خصلت آپا کو کسی کو نادم کرنا مقصود نہیں تھا۔ لیکن اپنا وجود تسلیم کروانے کے لیے یہ ضروری بھی تو تھا۔

اب اسے ناجی تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ سب حیرت زدہ سے اسے تکے جا رہے تھے۔

جب ذہنی سکتہ دور ہوا تو ناجی پر پھر سوالات کی بوچھاڑ تھی۔ "تم روپوش کہاں ہوئی تھیں۔ تمہاری شکل و صورت پہ کیا بیتی۔۔ تم نے اپنے آپ کو ظاہر کیوں نہیں کیا"؟

ناجی پلنگ پر بیٹھے بیٹھے مسکرائی۔ پھر اس کی مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

مختصر الفاظ میں اس نے سب سوالوں کا جواب دیا۔ بہت کچھ کہنے کے بعد وہ بولی "زندگی سے اتنی دل برداشتہ ہو گئی تھی کہ مرجانے کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔ میاں مجھے باہر لے جانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن فوزیہ نے اس رات دھمکی دی کہ اگر میں نے میاں کو لے کر یہاں سے جانے کی کوشش کی تو مجھے میاں نہیں ان کی لاش ملے گی۔۔"

"کم عمری اور ناتجربہ کاری تھی۔ جینے سے پہلے ہی بیزار تھی۔ اس تنبیہہ نے رہا سہا سکون بھی لوٹ لیا۔ اسی رات میں نے زندگی کا جوا اتار پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ میاں کو سوتے چھوڑ کر میں کمرے سے نکلی۔۔ اور محل کے پچھواڑے اسی پتھر سے دریا میں کود گئی جہاں اکثر بیٹھ کر اپنے حالات پر آنسو بہایا کرتی تھی۔۔"

سنسنی خیز واقعات سن کر سب کے سانس اوپر کے اوپر رہ گئے تھے۔

"لیکن موت نہ آئی۔ لہریں مجھے بہا کر دور لے گئیں۔ جب ہوش آیا تو میں اک دیہاتی مکان میں تھی۔"

وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر بڑے درد ناک انداز میں اپنی پوری داستان سنا ڈالی۔ اس دیہاتی مکان میں اس پر کیا بیتی۔۔ اور کس طرح اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے

اس نے تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگالی۔

ناجی روتے ہوئے اپنے مصائب کی داستان سنا رہی تھی۔ سب دم بخود تھے۔

"دو سال میں ہسپتال میں اپنے زخموں کی چارہ جوئی کے لیے رہی۔ موت نے ہر بار مجھ سے آنکھیں چرائیں۔ ہسپتال میں ڈاکٹر جنید کے مشفقانہ رویے سے میری ٹوٹی ہوئی ہمت بندھی اور میں نے زندگی سے مصالحت کر لی۔ میرا حلیہ سرتاپا بدل چکا تھا۔ بڑی مدت تک اس تبدیلی سے میں خوف زدہ رہی۔ اپنی صورت دیکھ کر گھن آتی تھی لیکن صورت کی یہی تبدیلی میرے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔۔۔ ڈاکٹر جنید کے ہاں میں بچے کی آپا کی حیثیت سے ملازم ہو گئی۔ اور جب وہ تبدیل ہو کر اس شہر میں آئے تو میں بھی یہاں آ گئی۔۔ اپنی مامتا کی تڑپ جو میں نے یہاں آ کر محسوس کی بیان نہیں کر سکتی۔ شاید اس تڑپ ہی نے مجھے میری بچی سے ملا دیا۔۔ صاعقہ کی آیا بن کر مجھے اپنے سارے دکھ بھول گئے۔" وہ چند لمحے پھر رکی۔ آنچل سے آنسو پونچھے اور پھر بولی "یہاں کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔۔ اور نہ ہی اس خوف سے میں نے کسی کو اپنے متعلق بتایا۔۔ کہ کہیں ناجی سے دشمنی عود نہ کر آئے اور میں اس سعادت سے محروم ہو جاؤں جو اپنی بچی کو اپنے ہاتھوں پالنے سے میرے نصیبوں میں آئی تھی۔ میاں کی موت کا اندوہناک صدمہ جھیل کر بھی میں مطمئن تھی۔ یہاں میاں نہیں تھے لیکن ان کی یادیں ہر چیز سے وابستہ تھیں۔ ان کی یادگار۔۔ سب بڑی یادگار صاعقہ میرے پاس ضرور تھی۔ اب زندگی تلخ نہیں تھی لیکن ناگوار ضرور تھی۔"

آپا کی آواز رندھ گئی۔ آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ صاعقہ اس کے بازو میں منہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

ہر آنکھ پرنم تھی۔ ناجی کے لیے عقیدت ہر دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت ہنکر کو سب احترام سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر سوگوار سی خاموشی رہی۔ پھر ریحان آگے بڑھے۔ ان کے جذبات میں شدید ہلچل تھی۔ آپا کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے اپنا سر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

"آپ کتنی عظیم ہیں۔۔" وہ گلوگیر آواز میں بولے "کتنے دکھ جھیلے آپ نے۔"

ناجی نے صاعقہ کی پشت سے اپنا بازو کھینچا۔ دونوں ہاتھوں سے ریحان کا چہرہ تھام کر جھکی اور ان کی فراخ پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیتے ہوئے بولی "میرے بچے۔۔ بچے

ان دکھوں کا اس لمحے ذرہ بھر احساس نہیں ۔ آج میں کتنی خوش ہوں ، کوئی نہیں جان سکتا ۔"

ناجی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے ۔

"تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں ، بچی" حسن بانو ناجی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں ۔ ناجی احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی ۔

اور حسن بانو نے اپنی وضع داری کے شکار کو سینے سے یوں لگا لیا جیسے یہی اُن کا سرمایۂ حیات ہو ۔ ان کی آنکھیں بھی پُرنم تھیں ۔

ناجی کی عظمت کے سامنے سب سرنگوں تھے ۔

اس رات کوئی نہ سو سکا ۔ صبح خوشیوں اور مسرتوں کی پیغامبر تھی ۔

فوزیہ کا دماغی انتشار ختم ہو چکا تھا ۔ سعدیہ نے اسے ناجی کی داستانِ الم کہہ سنائی ۔ سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا ۔

وہ حسن بانو کی نشست گاہ میں آئی جہاں ناجی حسن بانو کے پاس بیٹھی تھی ۔ صاعقہ و ریحان اس کے دائیں اور حسن آرا و انجم بائیں طرف بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ۔

وہ سیدھی ناجی کی طرف گئی ۔ اس کے قدموں پر جھک گئی ۔ آنسوؤں میں رندھی آواز سے اپنے بہیمانہ رویے کی معافی چاہنے لگی ۔

ناجی نے پاؤں کھینچ کر فوزیہ کو اٹھایا اور گلے سے لگا لیا ۔ دونوں رو رہی تھیں ۔ ایک اپنے جُرموں کی سیاہی دھونے کے لیے اور دوسری ان جُرموں کی بخشش کے لیے ۔

عفو و تقصیر کا یہ مظاہرہ اتنا جاں گداز تھا کہ کوئی آنکھ نم ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔



مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ لاہور ۔ باہتمام عبدالسلام پرنٹر اور پبلشر